اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۴ء

اُردو ادب میں عالمی معیار کا تحقیقی و تخلیقی مجلّہ

سہ ماہی

الاقربا

اسلام آباد
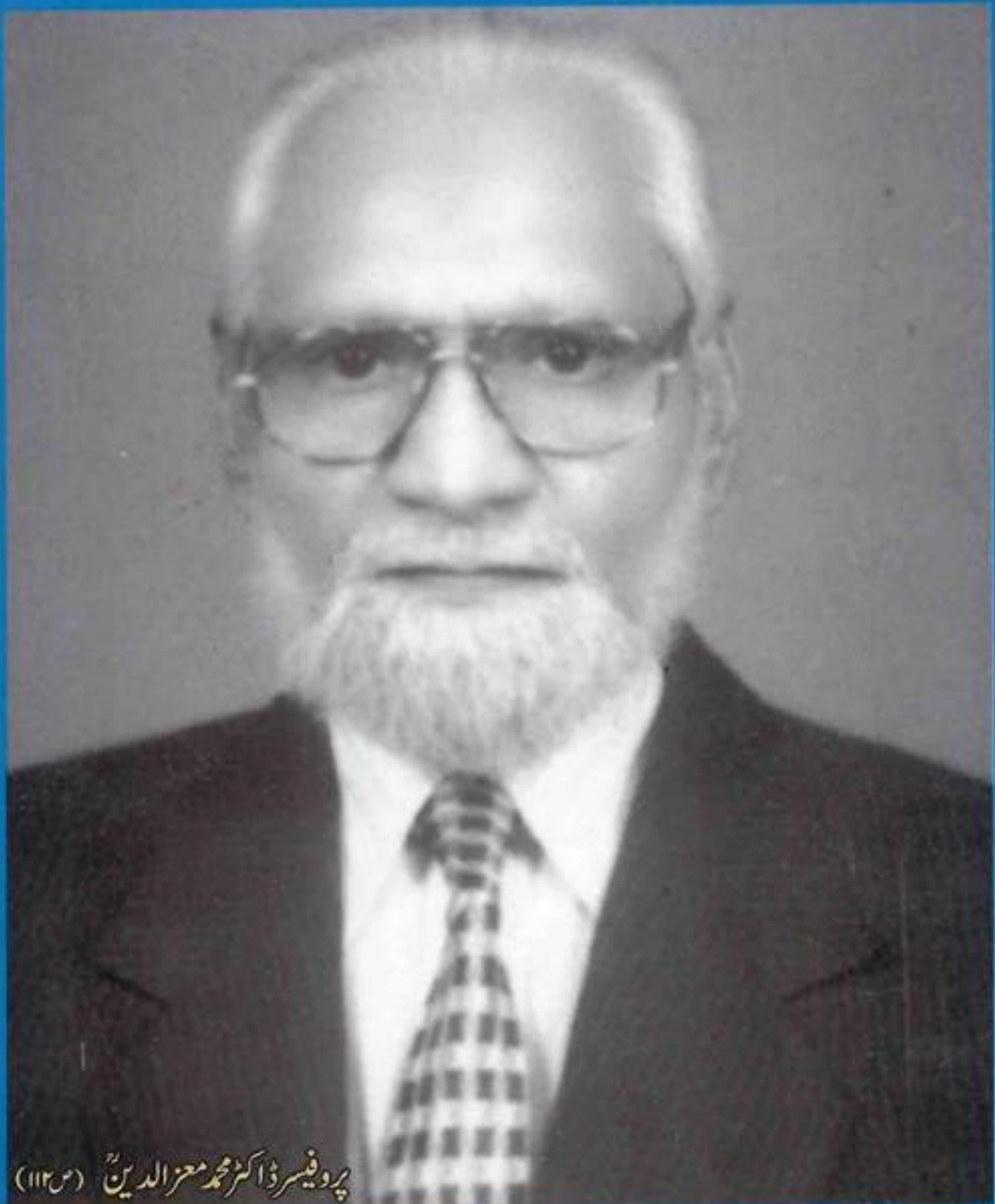
پروفیسر ڈاکٹر محمد معزالدینؒ (ص ۱۱۲)

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

سہ ماہی **الاقرباء** اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۱۷ شمارہ نمبر ۴ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۴ء

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

مکان نمبر ۴۶۴، سٹریٹ نمبر ۵۸، آئی ۸/۳، اسلام آباد (پاکستان)

Ph.051-4442686 Fax 051-2221670

website E-mail

www.alaqreba.com alaqreba@hotmail.com

بیرونِ ملک مشیرانِ اعلیٰ

بیرسٹر سلیم قریشی

2-A Barclay Chamber, Barclay Road, Leytonstone
London, E-11. 3 DG(U.K.)
Phone (0208)5582289, Fax (0208)5583849
Email: Barqureshi@ hotmail.co.uk

محمد اویس جعفری

3202, 140th street, SE
Mill Creek WA 98012- 4677(USA)
Phone: (001) 425-385-8666
E-mail: Jafreyomi@gmail.com

زرِ تعاون

فی شمارہ	۲۵۰ روپے
سالانہ (مع محصول ڈاک)	۱۰۰۰ روپے
بیرونِ ملک فی شمارہ (مع محصول ڈاک)	۱۰ / ڈالر ۷/ پاؤنڈ
بیرونِ ملک سالانہ (مع محصول ڈاک)	۴۰ /ڈالر ۳۰/ پاؤنڈ

کوائف نامہ

شمارہ	اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۴ء
کمپوزنگ	محمد انور چوہدری
طابع	ضیاء پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر	سیّد ناصر الدین

مندرجات

مضامین ومقالات

اقبالیات

تاریخ

پروفیسر ڈاکٹر محمد معزالدین (مرحوم)

یادِ رفتگاں

انشائیہ۔ افسانہ۔ کہانی

متفرقات

سیاست گزیدہ ادب وثقافت

سال رواں ۲۰۱۴ء کو اگر پاکستان میں ادب وثقافت کا بین الاقوامی سال قرار دیا جائے تو ایسا کچھ غلط بھی نہ ہوگا کیونکہ اس عمل کا آغاز پاکستان کے قلب میں واقع بہاولپور شہر سے ہوا جس کا ماضی اردو زبان وادب کی پذیرائی اور سرپرستی کے حوالہ سے ہماری ملکی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔اس کے بعد یہ شرف کراچی کو حاصل ہوا جو بہ اعتبار آبادی ملک کا سب سے بڑا شہر ہے اور بوجوہ عالمگیر شہرت کا حامل بھی۔البتہ تہذیب وثقافت اور علم وادب سے تسلسل کے ساتھ عمیق تعلق کے سبب لاہور کو ایک ممتاز ومنفرد مقام حاصل ہے۔رہا اسلام آباد کا سوال تو اُس کا یہ اعزاز ہی کیا کم ہے کہ وہ مملکت پاکستان کا صدر مقام ہے۔ان شہروں میں یکے بعد دیگرے تہذیب وثقافت کے موضوع پر بین الاقوامی اردو کانفرنسوں کا انعقاد ایک اہم اور توطلب واقعہ ہے جن میں لاہور اور کراچی کی کانفرنسوں کو مکمل سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔

لاہور میں 'الحمرا' آرٹس کونسل کے زیر اہتمام جو وزیر اعلیٰ پنجاب اور وزیر اعظم پاکستان کی تصاویر سے آراستہ تھا چوتھی بین الاقوامی ادبی وثقافتی کانفرنس اگرچہ کراچی کے بعد منعقد ہوئی لیکن اُسے اختصاص واولیت اس لیے حاصل تھی کہ اس کا افتتاح جناب وزیر اعظم پاکستان نے پہلے سیشن کی بہ نفسِ نفیس صدارت فرما کر کیا۔آپ کی صدارتی تقریر کا تمام تر محور ومرکز سیاسی بالخصوص ہندوستان اور 'امن کی آشا' تھا آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہم انڈیا سے بہتر تعلقات چاہتے ہیں بلکہ ویزا کی پابندیاں بھی ختم کردینا چاہتے ہیں۔سیاسی گفتگو کے بے محل تسلسل کو دیکھتے ہوئے جب میزبان صدر آرٹس کونسل نے کانفرنس کے موضوع کی جانب توجہ دلائی تو جناب وزیر اعظم نے ارشاد فرمایا کہ ''میں سمجھتا ہوں کہ سیاست بھی تو ادب وثقافت ہی ہے۔'' انھوں نے مزید صدر آرٹس کونسل کے ساتھ تحسین باہمی کے اظہار کے طور پر ''شیلڈز'' کا تبادلہ فرمایا نیز شعراء اور ادیبوں کے

لیے ایک ''ماڈرن کلب'' کی تعمیر پر اخراجات کی مد میں دو کروڑ روپیہ کے عطیہ کا اعلان کیا دوسرے دن کے سیشن کے لیے پروگرام میں نام شامل نہ ہونے کے باوجود صدارت کا اعزاز وفاقی وزیر اطلاعات کے حصہ میں آیا جن کا فرمانا تھا کہ وہ کبھی شاعروں کے قریب نہیں رہے اس لیے آج وزیر ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ صدر الحمرا آرٹس کونسل لاہور اس سے قبل کراچی آرٹس کونسل کی ساتویں بین الاقوامی اردو کانفرنس میں فرما چکے تھے کہ میں نقاد نہیں ہوں بلکہ ایک شریف آدمی ہوں ہر چند کہ اُن کی شرافت پر کانفرنس میں کسی مرحلہ پر بھی کوئی نکتۂ اعتراض نہیں اُٹھایا گیا تھا۔ تاہم عام تاثر یہی تھا کہ وہ ''شریف برادری'' سے اپنے تعلق کو مزید مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک اور معنی خیز واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ آخری دن کے اجلاس کی صدارت چیئرمین پاکستان کرکٹ بورڈ نے فرمائی جنھیں پنجاب کا نگران وزیر اعلیٰ رہنے کا بھی اعزاز حاصل تھا چنانچہ اکثر ناظرین وسامعین کے ذہن میں ماضی کی وہ یادیں تازہ ہونا شروع ہو گئیں جب افتخار واعزاز کے مجلسی مناصب سیاست دانوں کے لیے نہیں بلکہ حکومتی اعلیٰ عہدہ داروں کے لیے مختص ہو کر رہ گئے تھے اور مشاعروں تک کی صدارتیں کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں جس کا ایک یادگار واقعہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مشاعروں میں ایک شاعر اپنی غزل پڑھ کر فارغ ہوئے جس کے ردیف وقوافی تھے کہ ''نظاروں سے کھیلتا ہوں۔ بہاروں سے کھیلتا ہوں'' وغیرہ۔ تو صدرِ مشاعرہ نے تالیاں بجا کر اور یہ کہہ کر داد دی کہ ''ویل پلیڈ''

اک خفیف سے فرق کے ساتھ کراچی آرٹس کونسل کی ''بین الاقوامی اردو کانفرنس'' کا حال بھی ثقہ وغیر ثقہ جملہ بازیوں اور غیر سنجیدہ رویوں کے سبب لاہور جیسا ہی رہا۔ افتتاحی سیشن جناب مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ''شامِ شعرِ یاراں'' کی تقریب تعارف پر مشتمل تھا جس پر پہلا فقرہ یہ چُست کیا گیا کہ ''ہم عہد یوسفی میں اور یوسفی صاحب مسلم لیگ ن کے عہد میں رہ رہے ہیں'' مزید کہ اُن ممتاز شخصیات میں سے جنھوں نے اس سیشن میں تقاریر فرمائیں کسی ایک نے بھی کتاب کے موضوع پر گفتگو نہیں کی۔ احمد ندیم قاسمی مرحوم کے حوالے سے جن صاحب نے تقریر فرمائی وہ

غالباً یہ بھول گئے کہ اُن کے علاوہ بھی ایک قاسمی صاحب تھے چنانچہ انھوں نے اپنی گفتگو کو زیادہ تر اپنی حیات وصفات ہی پر مرتکز رکھا۔ باقی مقررین کی خطابت سے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ اُنھیں اردو سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کانفرنس میں ممتاز شخصیات اور معروف اہل قلم اور اہل دانش شریک تھے اور گفتگو کے دوران اردو کے لسانی سیاق وسباق اور قومی بین الاقوامی حیثیت پر مقررین نے اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر پیش کیے جن میں ایک مکتب فکر یہ بھی سامنے آیا جس کے تحت اردو کو پہنچنے والے نقصان کا ذمہ دار تحریک پاکستان کے رہنماؤں کو ٹھہرایا گیا۔ کراچی کو دمشق سے تشبیہ دی گئی اور اردو کو کالا باغ ڈیم سے اور کہا گیا کہ نہ اس ملک میں کالا باغ ڈیم بنے گا اور نہ اردو سرکاری زبان ہوگی۔ ایک صاحب کا ارشاد تھا کہ جب مولوی عبدالحق مرحوم پاکستان تشریف لے آئے تو ہندوستان والے پریشان تھے کہ ان کی اردو کا کیا بنے گا تو کہا گیا کہ فکر کی کوئی بات نہیں اردو کے لئے لتا منگیشکر موجود ہے یہی نہیں بلکہ اردو کو ''خاندانی منصوبہ بندی'' کے تناظر میں بھی زیر بحث لایا گیا اور ایک فاضل مندوب نے فرمایا کہ جب تک ہر گھر میں پانچ پانچ بچے پیدا ہوتے رہیں گے اردو زبان اور دین اسلام کو کوئی خطرہ نہیں۔ بلکہ ایک صاحب نے تو بلوچستان کی ایک شخصیت کا واقعہ سناڈالا جنھوں نے مبینہ طور پر عمر بھر اردو نہ بولنے کی قسم کھائی تھی فرمایا ''اکبر بگٹی جن دنوں اردو سے ناراض تھے اُنھیں مشاعرے میں آنے کی دعوت دی گئی مشاعرہ میں آئے تو رات گئے تک شعر سنتے رہے۔ جاتے ہوئے کہا کہ اس طرح کا مشاعرہ آپ کوئٹہ میں بھی کریں'' ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ''میں اردو سے نالاں نہیں ہوں بلکہ میں نے کہا تھا کہ جب تک ضیاء الحق موجود ہیں اردو نہیں بولونگا'' کانفرنس میں ایک اور نقطۂ نظر بھی سامنے آیا اور وہ یہ کہ ''اردو کے سب سے زیادہ خطا کار اُس کے اپنے لوگ ہیں ان لوگوں نے اردو کو قومی زبان تو قرار دے دیا مگر بعد میں اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا'' بہر حال ''اردو کے اپنے لوگ'' سے مراد کیا ہے۔ یہ بات صیغۂ راز میں رکھی گئی حالانکہ اردو کو قومی اور سرکاری زبان قرار دینے کا فیصلہ بانی پاکستان، حضرت قائدِ اعظمؒ بابائے قوم نے فرمایا تھا اور بعد میں بننے والے دساتیر بشمول ۱۹۷۳ء کے دستور میں اردو کو بجا طور پر یہی

حیثیت دی گئی کہ صرف اردو ہی تمام جنوبی ایشیا میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔اور اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسکو کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کی کم وبیش ڈیرہ ارب آبادی اس عالمگیر زبان سے صرف مانوس ہی نہیں بلکہ یہ عامتہ الناس کے لیے ایک اہم ترین ذریعۂ ابلاغ واظہار بھی ہے۔اردو کو تمام خطۂ ارضی پر یہ حیثیت اس کے باوجود حاصل ہے کہ اسے ازرہِ تعصب عالمگیریت کے انگریزی بردار لسانی عفریت کے بھینٹ چڑھا دینے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے حالانکہ اردو کے بر بنائے حیثیت وانصاف اقوام متحدہ کی سرکاری زبانوں میں شمولیت کے استحقاق سے انکار ہرگز ممکن نہیں۔سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ سالِ رواں میں منعقد کی جانیوالی ہر کانفرنس کو ''بین الاقوامی'' ہونے کا شرف حاصل تھا لیکن اس جانب کسی بھی دانشور یا اہلِ قلم کی توجہ نہیں گئی۔اسے بے خبری سے تعبیر کیا جائے یا بے حسی سے!

اس میں شک نہیں کہ سرکاری سرپرستی سے محروم بہاولپور کی سہ روزہ کانفرنس حقیقی معنی میں ''بین الاقوامی'' تھی کہ اس میں دس ممالک سے پچاس مندوبین نے شرکت کی اور مقامی یونیورسٹی 'جامعہ اسلامیہ' کے رئیس الجامعہ۔اساتذہ وطلباء اور ایک میزبان این۔جی۔او نے کانفرنس کو مؤثر وبامقصد بنانے کے لیے بھرپور کردار ادا کیا۔اسلام آباد کا اجتماع بھی تھا تو 'بین الاقوامی' ہی لیکن زیادہ تر مقامی وملکی مندوبین کی گرفت میں رہا تاہم ان تمام کانفرنسوں میں اردو زبان وادب کے فروغ وارتقاء کے لیے کوئی مثبت ومبسوط لائحہ عمل مرتب نہ کیا جاسکا اور نہ تا حال مطبوعہ شکل میں ایسی رپورٹس منظر عام پر آسکی ہیں جو اہلِ وطن کو ان بلند آہنگ کانفرسوں کے بارے میں میزبانوں کی پیشہ ورانہ مہارت کار کے علاوہ بھی موضوعی مقصدیت کا ثبوت فراہم کرسکتیں۔

'اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'

کلام اقبال

خودی کا سرِ نہاں لآ اِلٰہَ اِلاّ اللہ	خودی ہے تیغ، فساں لآ اِلٰـہَ اِلاّ الـلّٰـہ
یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے	صنم کدہ ہے جہاں' لآ اِلٰـہَ اِلاّ الـلّٰـہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند	بتانِ وہم وگماں ! لآ اِلٰـہَ اِلاّ الـلّٰـہ
یہ نغمہ فصلِ گُل ولالہ کا نہیں پابند	بہار ہو کہ خزاں ' لآ اِلٰـہَ اِلاّ الـلّٰـہ
اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں	مجھے ہے حکمِ اذاں' لآ اِلٰـہَ اِلاّ الـلّٰـہ

شرمناک ذہنی افلاس اور قومی بے حمیتی
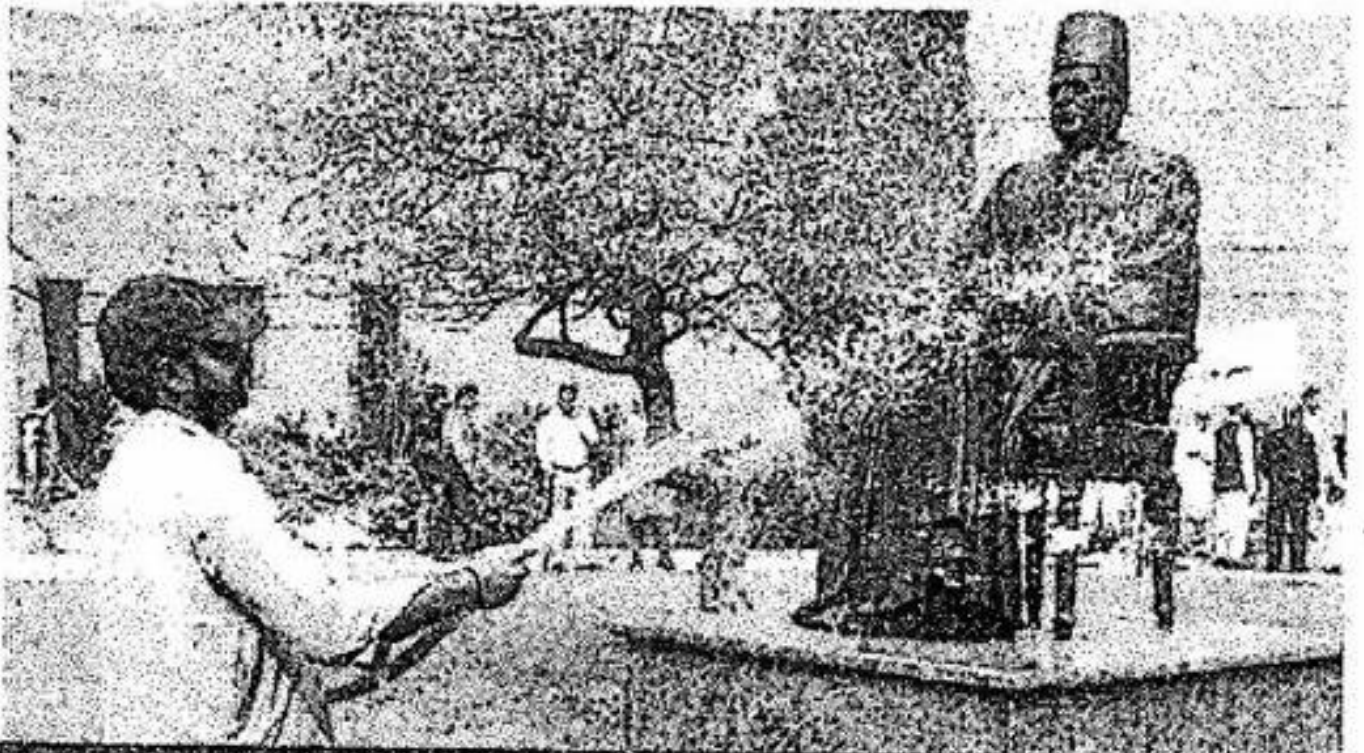
ہم نے تری وفاؤں کا خوب تجھے صلہ دیا دل سے ترا ہر ایک نقش محو کیا، مٹا دیا

وہ کہ جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے وہ حادثہ حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبالؒ کے خیالوں کی جنتِ ارضی پاکستان میں پیش آجائے گا اور وہ بھی اس طرح کہ شاید اُن ہی کے فکر وفن کے نام نہاد علمبرداروں کے ہاتھوں مفکرِ اسلام کی ملحدانہ تجسیم کاری پر ان کی روح تڑپ رہی ہو۔

اُنھوں نے تو اپنے کردار کا جو رُخ قوم کو امانتہً سونپا تھا وہ یہ تھا کہ:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے　　　صنم کدہ ہے جہاں لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہ

مگر لگتا یوں ہے کہ یہ قوم اپنے محسنوں کو فراموش کر بیٹھی ہے اور بت شکنی کی بجائے ارادت و عقیدت کے اظہار کے لیے بت گری کی روش اختیار کر چکی ہے۔ اپنے تصور سے ماورا علامہؒ کے بُت (نعوذ باللہ) کی اوپر دی گئی تصویر (نقل کفر، کفر نباشد) جب ہم نے پاکستان کے ایک مقتدر انگریزی روزنامہ 'ڈان' کی اشاعت مورخہ ۱۸ نومبر ۲۰۱۴ء کی اشاعت میں دیکھی تو ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اخبار نے اچھا کیا کہ یہ تصویر شائع کر دی جب کہ یہ توفیق آج تک کسی دوسرے روزنامہ کو نہ ہوئی کہ الحمرا آرٹ کونسل کے کارپردازوں کے اِس شرمناک ذہنی افلاس اور قومی و دینی بے حمیتی کا پردہ چاک کرتا۔ یہ مذموم و مجرمانہ فعل آئین پاکستان میں اسلام سے متعلق متعدد دفعات کی مجرمانہ خلاف ورزی اور آرٹیکل ۶ کے تحت سنگین ترین سزا کا متقاضی ہے۔ ہم بہ صمیمِ قلب اور نہایت عجز و انکسار لیکن انتہائی دکھ اور دلسوزی کے ساتھ حکومت وقت سے ملتمس ہیں کہ مفکر پاکستان اور شارحِ اسلام حضرت علامہ اقبالؒ کی شان میں یہ ارذل ترین گستاخی کرنے والوں اور آئین پاکستان کی بے حرمتی کرنیوالوں کے خلاف طور فوری پر مقدمات درج کرا کر اُنھیں کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے اور فی الفور ایک ہی ضربت غزنوی سے اس بُت کو پارہ پارہ کر دیا جائے نیز ہم نہایت ادب و احترام سے جناب چیف جسٹس آف پاکستان سے استدعا کرتے ہیں کہ بلا تاخیر از خود نوٹس لے کر اِس برملا کفر کا مملکتِ اسلامیہ پاکستان سے خاتمہ فرما کر سعادتِ دارین حاصل فرمائیں کہ مصور پاکستان کا بت ارض وطن پر مزید دیکھنے کی تاب اسلامیانِ پاکستان میں ہرگز نہیں۔

*****

سیّد انتخاب علی کمال

عُقدۂ تاریخ گوئی

اس میں قطعی دو رائے نہیں کہ فن تاریخ گوئی ایک مشکل ترین فن ہے۔ اور یہ فن ادب کا مہتم بالشان تاریخی ورثہ ہے۔ اور اس کی دقتوں کی وجہ سے بہت کم حضرات اس طرف توجہ فرماتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح اس فن پر کُتب نگاری بھی کوئی آسان کام نہیں یہی وجہ ہے فنِ تاریخ گوئی پر نگارشِ کُتب کا کام بھی خال خال ہی نظر آتا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ ان کی فہرست سازی، کتابیات سازی نیز جائزہ نویسی اور اشاریہ نویسی بھی کوئی آسان کام نہیں۔ جب کہ عام ادبی کُتب پر تو بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے مطبوعات کی کتابیات پر بعنوان ''قاموس الکتب'' ایک کام کا آغاز بھی کیا۔ جس کی تین جلدیں ہی شائع ہوسکیں حالانکہ بابائے اُردو کے پاس ایک ادارہ بھی تھا۔ کام کرنے والا عملہ بھی تھا۔ ایک انجمن تھی۔ مگر پھر بھی کام ادھورا ہی رہ گیا۔ فنِ تاریخ گوئی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس کے علاوہ نیشنل میوزیم۔ کراچی کے فارسی مخطوطات کی فہرست ''نسخہ ہائے خطی فارسی موزۂ ملّی پاکستان۔ کراچی'' کے عنوان سے ۱۹۸۳عیسوی میں مرکز تحقیقات فارسی اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ پھر معروف مخطوط شناس جناب احمد منزوی صاحب (ایران) نے مخطوطات کی فہرست سازی کا کام شروع کیا۔ جو چودہ (۱۴) جلدوں میں ''فہرستِ مشترک نُسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان'' شائع ہوئی اس کے علاوہ مرحوم رفیق احمد نقش کی صاحبزادی عزیزہ خوشبو صاحبہ ماشاء اللہ اچھا ادبی ذوق رکھتی ہیں جس کا ثبوت ماہ ستمبر ۲۰۱۴ عیسوی میں حضرت شاہ مقصود صادق عنقا کی کتاب ''حیات کے مخفی زاویئے'' پر خوبصورت تبصرہ آرٹس کونسل کراچی میں پیش کیا۔ ہائے کاش! وہ اپنے مرحوم والد گرامی کے نامکمل کام کو آگے بڑھائیں۔ مندرجہ بالا جائزوں میں سے کوئی سا بھی جائزہ خالصتاً فنِ تاریخ گوئی کی کتابوں سے متعلق نہیں ہے۔ اس سے یہ غلط تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شاید فن تاریخ گوئی سے متعلق کتابیں ہیں ہی نہیں۔ اسی تاثر کی نفی کی غرض سے راقم الحروف نے

''فنِ تاریخ پر ایک صد (۱۰۰) مطبوعات و مخطوطات کا جائزہ'' سپردِ قلم کیا تھا۔ جس کو ''الاقرباء فاونڈیشن'' اسلام آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے ادبی جریدے ''سہ ماہی الاقرباء'' اسلام آباد کے صدر نشیں اور مجلسِ مشاورت کی ادب دوستی اور فنِ تاریخ گوئی سے گہری دلچسپی کی بناء پر مذکورہ جریدے میں جگہ ملی۔ قارئین یہ جائزہ اکتوبر/ دسمبر ۲۰۰۶ عیسوی کے شمارہ میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ''الاقرباء'' کی حوصلہ افزائی کی بناء پر تازہ ترین مطالعے کی روشنی میں تازہ جائزہ ''عُقدۂ تاریخ گوئی'' ۱۴۳۶ ہجری پیش ہے جو نئے بازیافت شدہ نقوش سے مرتب کیا گیا ہے:

(الف) ''مجموعہ ہائے قطعاتِ تاریخ، قواعد اور مساوی الاعداد پر کُتب''

۱۔ **مراۃ الخیال** (اوّل) = سالِ تکمیل ۱۱۰۲ ہجری/ ۱۶۹۰ عیسوی، مولف: شیر خان۔ شیر خاں نے اپنی کتاب کی تاریخِ اتمام خود لکھی ہے:

این چمن زارے کہ مراۃ الخیالش خواندہ اند ۔۔۔ دارو از حسنِ معانی یک جہاں حُسنِ کمال

صورتِ تاریخ انجامش تواں ''بے ''پردہ'' دید ۔۔۔ گر تامّل پردہ بردارد ز ''مراۃ الخیال''

۲۱۱ ۔۔۔ ۱۳۱۳

''پردہ'' کا تخرجہ ۔۔۔ = ۲۱۱

۱۱۰۲ ہجری

وضاحت: ''مراۃ الخیال'' کے اعداد ۱۳۱۳ میں سے ''پردہ'' کے اعداد ۲۱۱ کو نفی کرنے سے ۱۱۰۲ حاصل ہوتے ہیں یہی ''مراۃ الخیال'' کے اختتام کی تاریخ ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تفصیلات دستیاب نہیں۔ بے (تذکرۂ دُرفشاں) ''مراۃ الخیال'' (دوم) نام کی ایک کتاب شعری امرتسری کی بھی ہے۔ دیکھیئے سلسلہ نمبر ۱۱ اس کے علاوہ 'مراۃ الخیال نام کی ایک تیسری کتاب بھی تحریر کی گئی ہے۔ یہ 'مراۃ الخیال' (سوم) حکیم میر نادر علی موسوی رعد کی ہے۔ دیکھیئے سلسلہ نمبر ۱۶، یہ اصل میں ''گنجینۂ تواریخ'' کا تاریخی نام ہے جسے راقم الحروف نے ''مراۃ الخیال' سوم قرار دیا ہے۔ (کمال)

۲۔ **گزیدۂ معشوق** = از صوفی سیّد محمد زاہد { صوفی زاہد کو کسی قدر میر عبدالجلیل بلگرامی (صاحبِ گلزارِ فتح شاہ ہند) پر تقدّم حاصل ہے } سید محمد زاہد نے شیخ عبدالقادر جیلانی کی تاریخِ

وفات پر ایک فارسی رسالہ ''گزیدۂ معشوق'' لکھا اور ابوالفیاض ناصر الدین محمد عیسیٰ قادر کو تحفتہً دیا۔ ابوالفیاض نے ۱۱۱۵ھج مطابق ۱۷۰۳عیسوی میں اپنی کتاب ''فیضِ قادریہ'' میں نقل کر دیا۔ اس کتاب (فیض قادریہ) کا ایک خطی نسخہ قومی عجائب گھر پاکستان کراچی میں ہے (شمارہ نسخہ ۱۵۹۔۱۹۶۶ء)۔ ''گزیدۂ معشوق'' میں چونتیس (۳۴) تاریخی جملوں پر مشتمل منشور (نثر) مقدمہ اور گیارہ تاریخی اشعار کا منظوم قطعہ ہے۔ مقدمے کے ہر جُملے سے شیخ جیلانی کا سال وفات برآمد ہوتا ہے۔ ۸ اور قطعۂ تاریخ ''صنعتِ کامل'' نمبر ۹ میں ہے۔ اور بقول ناقل اس سے مختلف طریقوں سے ایک ہزار، ایک سو، اکسٹھ (۱۱۶۱) تاریخیں نکالی جاسکتی ہے۔ صنعتِ کامل میں بہت کم تاریخ گو شعراء نے تاریخیں کہی ہیں۔ ولا حیدر آبادی، جویا مراد آبادی اور معجز بنگلوری نے صنعتِ کامل میں تاریخیں کہی ہیں۔ مگر ناچیز اس صنعت کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہے۔ (کمال)

۳۔ منتخب اعداد = ۱۱۷۲ ہجری/۱۷۵۸عیسوی میں لکھی میر نوازش علی خاں، شیدا حیدر آبادی۔ مادہ ہائے تاریخ پر مشتمل کتاب ہے۔ کتاب کا ایک نسخہ قومی عجائب گھر کراچی میں موجود ہے۔ ۱۰ آصف جاہ نے عاشور خانہ شاہی حیدر آباد دکن کی تعمیر ہوئی تو شیدا نے تاریخ کہی:

گفت ہاتف سالِ تاریخش چنیں ''کرد آصف جاہِ ما تعمیرِ اُو'' ۱۱
۱۱۷۹ ہجری

۴۔ مخزن الاعراس یا اعراس نامہ = مرتبہ محمد مجیب ناگوری۔ ۱۱۵۵ہجری/۱۷۴۲عیسوی میں مرتب کیا گیا۔ اس مجموعے کی ایک نقل جو ۱۳۷۲ ہجری مطابق ۱۹۵۳عیسوی میں لکھی گئی جو مولانا آزاد لائبریری۔ علی گڑھ۔ بھارت میں ہے اور اس کا دوسرا نسخہ ایشاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ کلکتہ۔ بھارت میں محفوظ ہے۔ ۱۲

۵۔ مفتاح التواریخ = ۱۲۶۴ ہجری/۱۸۴۷عیسوی میں لکھی گئی۔ مرتبہ ولیم بیل۔ مطبوعہ نول کشور لکھنو ۱۲۸۴ ہجری میں طبع کی گئی۔ اس کتاب کے ۴۱۸ صفحات ہیں ۱۳

۶۔ گنج تواریخ = ڈپٹی عبدالغفور نساخ کے قطعاتِ تاریخ کا ضخیم مجموعہ ہے۔ نام تاریخی ہے ۱۲۹۰ھجہ نکلتا ہے۔ یہ اکتوبر ۱۸۷۴ء میں چھپی۔ ۱۴
۱۲۹۱ھجہ

۷۔ کنزِ تواریخ اول = ۱۲۹۴ہجری/ ۱۸۷۷عیسوی میں لکھی گئی۔ مرتبہ مولوی شاہ سید محمد یحییٰ ابوالعلائی عظیم آبادی۔ اس کتاب کا نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۹۴ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا تاریخی نام ''مجلّد تواریخ'' ہے اس سے بھی ۱۲۹۴ ہجری ہی نکلتا ہے۔ یہ محمد یحییٰ عظیم آبادی کے کہے ہوئے قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ ہے۔ اوّلین قطعۂ تاریخ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخِ پیدائش پر کہا گیا ہے۔ سرکارِ دو عالمؐ کی ولادت پر صاحب ''مخبر الواصلین'' مظہر اکبر آبادی اور صاحب ''خزینۃ الاصفیا'' غلام سرور لاہوری نے بھی قطعاتِ تاریخ کہے ہیں۔ ابوالعلائی عظیم آبادی نے سرکارِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر بھی اور پھر تاریخ وار پہلی، دوسری اور تیسری صدی کی تاریخیں پھر گیارہویں اور بارہویں صدی کی تاریخیں ہیں۔ تیرھویں صدی ۱۲۰۳ ہجری سے شروع ہو کر ۱۲۹۹ ہجری پر ختم ہوتی ہے۔ یہ کتاب مکمل طور پر شائع نہیں ہوئی البتہ ۱۲۰۳ ہجری سے ۱۲۹۹ ہجری تک (چھیانوے برسوں) کی تاریخیں ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ نمبر ۲۰ میں چھاپ دی ہیں۔ ۱۵؎ ڈپٹی عبدالغفور خاں نساخ نے ۱۲۹۴ ہجری ہی میں ''کنزِ تواریخ'' کے نام سے اپنے قطعاتِ تاریخ کے مجموعے ''گنجِ تواریخ'' ۱۲۹۰ھ کا ضمیمہ بھی اسی نام سے لکھا ہے

۔ ۱۵؎ دیکھئے ذیلی سطور سلسلہ نمبر ۸ پر۔

۸۔ کنزِ تواریخ (دوم) = ڈپٹی عبدالغفور نساخ۔ تاریخی نام ہے۔ یہ ''گنج تواریخ'' کا ضمیمہ ہے۔ ''کنزِ تواریخ'' سے ۱۲۹۴ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ اس کی اشاعت کی تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔ ۱۶؎

۹۔ اورنگِ حضوری = ۱۳۰۱ ہجری/ ۱۸۸۳ یا ۱۸۸۴ عیسوی۔ از خواجہ عزیز الدین، عزیز لکھنوی (ابن خواجہ امیر الدین۔ نواب میر محبوب علی خاں (والی حیدر آباد دکن) کی مسند نشینی ۱۳۰۱ ہجری / ۱۸۸۳ یا ۱۸۸۴ عیسوی کے موقع پر حسب فرمائش مولوی محمد عبدالعلی، آسی مدراسی، عزیز لکھنوی نے ایک سو چھپن (۱۵۶) اشعار کا قصیدہ لکھا۔ اس قصیدے کو ایک دوسرے قصیدے کے ساتھ آپ کے صاحبزادے خواجہ محمد خلیل الدین نے کتابی شکل میں طبع کروایا ہے۔ ''اورنگِ حضوری'' تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۰۱ ہجری نکلتا ہے۔ اورنگ حضوری کے چار تاریخی نام اور بھی ہیں

(۱)"تاریخ عجیبہ" (۱۳۰۱ہجری)۔(۲) "خلافتِ آصف جاہی" (۱۳۰۱ہجری)۔۳۔ "گفتارِ شگرف" (۱۳۰۱ہجری) (۴) "ارتنگِ خدیوی" (۱۳۰۱ھ) یہ کتاب مطبع مصطفائی میں طبع ہوئی۔ نمبر۷(ت۔د۔ف)

۱۰۔موجد التواریخ = ۱۳۰۲ہجری/۱۸۸۵عیسوی۔از محمد حسین علی فرحت، مطبوعہ شگوفہ پریس میرٹھ۔یہ کتاب تاریخی ناموں پر مشتمل ہے۔۱۸ حسین علی فرحت دہلوی نے "اُمّ التواریخ" کے نام سے ایک کتاب ۱۲۸۹ہجری میں بھی ترتیب دی ۱۹۔جس کا ذکر راقم الحروف کے سابقہ جائزے میں ہے۔۲۰

۱۱۔مراۃُ الخیال (دوم)۔۱۳۰۴ہجری/۱۸۸۶عیسوی۔از مولوی محمد حسن شعری امرتسری۔اس کتاب کی بابت دیگر تفصیلات دستیاب نہیں مراۃ الخیال کے مولف شعری امرتسری اپنے وقت کے اور اپنے مقام کے امام المورخین مانے جاتے تھے۔موصوف کا ۸رجب المرجب ۱۲۹۸ہجری عُقدۂ تاریخ گوئی۔۱۸۸۱عیسوی کو انتقال ہوا مرنے سے ایک دن قبل اپنی تاریخ وفات خود کہی:

جُست تاریخ فوت خود شعری: شد ندا "رحمت خدا آمد" ۲۱ "مراۃ الخیال (دوم) نام کی ایک کتاب شیر خاں کی بھی ہے
۱۲۹۸ ہجری

جو ۱۱۰۲ہجری میں مکمل ہوئی تھی۔جائزہ ہذا کا سلسلہ نمبر ا دیکھئے۔(کمال)۔"مراۃُ الخیال" (سوم) حکیم میر نادر علی موسوی رعد نے بھی لکھی ہے۔دراصل یہ "مراۃُ الخیال" (سوم) حکیم میر نادر علی موسوی رعد کی کتاب "گنجینۂ تواریخ" کا تاریخی نام ہے۔کوئی علاحدہ کتاب نہیں ہے۔(کمال)

۱۲۔تاریخ محمود = ۱۳۰۹ہجری/۱۸۹۱عیسوی۔از شاہ کریم اللہ، عاشق حیدرآبادی۔موصوف عاشق حیدرآبادی حضرت شیخ محمود میاں چشتی نظامی احمد آبادی گجراتی سے بیعت تھے۔محمود میاں کی وفات ۱۳۰۹ہجری میں ہوئی۔تو عاشق نے ان کی وفات پر ایک سو بیاسی (۱۸۲) تاریخی قطعات کہے۔جن کو "تاریخ محمود" کے تاریخی نام سے بھی طبع کیا گیا جو حضرت مسکین شاہ نقشبندی کی وفات پر مرتب کیا گیا ہے۔دیکھئے سلسلہ نمبر ۱۶۔(کمال)

۱۳۔ نجمِ ماہ پیکر = از نواب زادہ خواجہ محمد افضل جہانگیر نگری، سنہ طباعت ۱۳۱۰ ہجری/۱۸۹۲عیسوی مطبوعہ یوسفی پریس ڈھاکہ یہ تاریخی مراثی اور تاریخی قطعات کا مجموعہ ہے۔ ۲۳

۱۴۔ بیان التواریخ = ۱۳۱۱ ہجری/۱۸۹۳عیسوی۔ از محمد عزیز اللہ المعروف منشی ولایت علی خاں متخلص بہ عزیز صفی پوری ۲۴ زیر نظر کتاب ''بیان التواریخ'' کا ذکر ہمارے سابقہ جائزے مطبوعہ الاقرباء ۲۰۰۶ء میں بھی تھا۔ مگر اس جائزے میں اس کتاب کے مُصنّف کا نام ''مجہول'' لکھا تھا۔ الحمدللہ! موجودہ تحقیق مزید میں مُصنّف کا نام بھی معلوم ہوگیا۔ اس لئے تحقیق بلکہ تعلیق کو شامل مقالہ ہذا کیا جارہا ہے۔ اس کتاب میں بہت سے تاریخی قطعات ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ آپ کی تاریخوں کا ایک دوسرا مجموعہ ''اعجاز التواریخ'' بھی طبع شدہ ہے ''اعجاز التواریخ'' (۱۳۳۰ ہجری) ۱۳۳۰ ہجری
اوّل نام کی ایک کتاب شرافت نوشاہی کی بھی ہے۔ شرافت نوشاہی کی اس کتاب کا ذکر سابقہ جائزے مطبوعہ الاقرباء ۲۰۰۶ء میں آچکا ہے۔ (کمال)

۱۵۔ اعداد التاریخ = ۱۳۱۲ ہجری/۱۸۹۴عیسوی۔ از شرافت نوشاہی۔ اس کتاب کا نامکمل مسودہ کتاب خانہ نوشاہیہ ساہن پال میں موجود ہے۔ یہ مادّہ ہائے تاریخ کا مجموعہ ہے۔ ۲۵ ''اعداد التاریخ'' سے ۱۳۲۲ ہجری برآمد ہوتا ہے۔

۱۶۔ گنجینۂ تواریخ = ۱۳۱۳ ہجری/۱۸۹۵عیسوی۔ از حکیم میر نادر علی موسوی رعد۔ اس کا تاریخی نام مقرر کیا ''مراۃ الخیال'' (۱۳۱۳ ہجری)۔ اس کتاب میں ایک (۱) سے انیس سو (۱۹۰۰) تک کے مادّہ ہائے تاریخ جمع کیے۔ نیز ''تکملہ'' میں نظائر اقسام تاریخ۔ اِمثلۂ تواریخ معنوی اور اِمثلۂ تواریخ صُوری و معنوی بھی شامل ہیں ۲۶

۱۷۔ چراغ بزم مجددی = ۱۳۱۴ ہجری/۱۸۹۶عیسوی۔ از شاہ کریم اللہ، عاشق حیدرآبادی۔ اس میں حضرت مسکین شاہ نقشبندی کی وفات پر عاشق حیدرآبادی کے کہے ہوئے قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ ہے اور طبع شدہ ہے۔ جو چالیس قطعاتِ تاریخ پر مشتمل ہے ۲۷ عاشق حیدرآبادی کے قطعاتِ تاریخ کا ایک دوسرا مجموعہ ''تاریخ محمود'' بھی ہے۔ جس کا ذکر سطور بالا میں سلسلہ نمبر ۱۲ پر گزرا ہے۔

۱۸۔ **میزان تاریخ** = ۱۳۱۹ ہجری/۱۹۰۰ عیسوی از موہن لال جالیسی کالیستھ۔ اس کا نام تاریخی ہے۔ جس سے ۱۳۱۹ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ اس میں عدد ایک (۱) سے ایک ہزار (۱۰۰۰) تک مساوی الاعداد مادۂ تاریخ یا الفاظ ہیں ۲۸

۱۹۔ **نشید کاظم** = ۱۳۲۵ ہجری/۱۹۰۷ عیسوی۔ از شیخ کاظم حسین، کاظم پھپھوندوی۔ یہ کتاب کاظم کے تاریخی کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کا دوسرا تاریخی نام "یادگارِ کاظم حسین" (۱۳۲۵ ہجری) ہے۔ جس سے ۱۳۲۵ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ اس میں صفحہ نمبر ا سے صفحہ ۲۸ تک سلام ہائے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پھر مناقب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اور صفحہ ۲۹ سے "دیوان التاریخ" (۱۳۱۹ ہجری) شروع ہوتا ہے۔ "دیوان التاریخ" (۱۳۱۹ ہجری) میں فن تاریخ گوئی کی کئی مروّجہ صنعتوں میں تاریخیں کہی گئی ہیں۔ اس کے بعد "مناظر الاسماء" کا نیا باب ہے۔ جس میں اسمائے حسنیٰ کا بیان ہے۔ "مناظر الاسماء" سے ۱۳۲۵ ہجری حاصل ہوتا ہے۔ آخری باب "مُعمّیاتِ کاظم" فنِ مُعمہ سے متعلق ہے۔ ۲۹ یہ کتاب اپنی نوع کی منفرد کتاب ہے۔ (کمال)

اشاریہ: [دیوانِ تواریخ" نام کی کتاب سید آلِ محمد مارہروی کی کتاب ہے۔ اور نام "دیوان تواریخ" ہے۔ جو ۱۲۸۸ ہجری میں لکھی گئی ہے۔ اور "دیوان التواریخ" ۱۳۱۹ ہجری میں لکھی گئی ہے۔ دونوں کتب کے ناموں میں "الف اور لام" کا فرق ہے۔ اور اعداد میں ۳۱ عدد کا۔ (کمال)

۲۰۔ **کنوز التواریخ** = سالِ اشاعت نامعلوم۔ از راجا گردھاری پرشاد۔ "کنوز التواریخ" کے اعداد ۱۳۳۱ ہوتے ہیں۔ اس لیے قیاس کیا جاسکتا ہے۔ کہ شاید یہی اس کا سال ہو۔ ۳۰

۲۱۔ **گنجینۂ تاریخ** = ۱۳۴۹ ہجری/۱۹۳۰ عیسوی از علامہ شفق رضوی حماد پوری۔ مطبوعہ آزاد پریس۔ ڈالی گنج۔ لکھنؤ۔ ہندوستان سے ۱۳۴۹ ہجری میں طبع ہوئی ۳۱ گنجینۂ تواریخ نام کی کتاب حکیم نادر علی موسوی رعد کی ہے۔ دیکھیے سلسلہ نمبر ۱۶

۲۲۔ **مخزن التواریخ** = ۱۳۵۹ ہجری/۱۹۳۹ عیسوی۔ مُصنّف مجہول۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔ حیدرآباد۔ دکن بھارت ۳۲

۲۳۔ آثار التواریخ = ۱۳۷۰ ہجری/۱۹۵۰ عیسوی۔ پروفیسر حامد حسن قادری۔ بکس انٹرنیشنل برطانیہ سے ۱۹۹۹ء میں طبع ہوئی قادری صاحب ۱۳۰۴ ہجری/۱۸۸۷ عیسوی میں بچھرایوں (ضلع مراد آباد) میں پیدا ہوئے۔ آپ کی قابل فخر یادگار "داستانِ تاریخ اردو" (۱۹۳۸ء) ہے۔ آپ کی وفات ۲۴ محترم ۱۳۸۴ ہجری/ ۶ جون ۱۹۶۴ء کو کراچی میں ہوئی۔ مہر تقوی جے پوری نے تاریخ وفات کہی:

"قادری حامد حسن کی عارفانہ موت ہے"

۱۳ ہجری ۸۴

حامد حسن قادری کہنہ مشق تاریخ گوشاعر تھے۔ قرآنی آیات سے تاریخ حاصل کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ (کمال)

۲۴۔ Literary History of Parsia = ڈاکٹر براؤن نے نُورالدین جامی دمشتی کی تاریخِ وفات کتاب ہذا میں لکھی ہے۔ جو کسی نامعلوم شخص نے کہی ہے۔ "دُود" از "خُراساں" برآمد ۳۳ (خُراساں کے (۹۱۲) عدد میں "دود" کے (۱۴) خارج کر کے (۸۹۸) عدد حاصل ہوتے ہیں۔ ہر چند کو زیرِ نظر کتاب فنِ تاریخ گوئی سے متعلق نہیں مگر محققین کے لئے جامی کی تاریخ وفات اہمیت کی حامل ہے۔ (کمال)

۲۵۔ مجموعۂ تواریخ = مرتبہ سیّد خورشید علی، مہر تقوی جے پوری (صاحب تذکرۂ دُر فشاں اور مترجم ترجمانِ بیخودی اردو ترجمہ رموزِ بیخودی۔ اقبال) یہ قلمی نسخہ ۱۳۸۱ ہجری/۱۹۶۱ عیسوی میں مرتّب کیا گیا ہے۔ اس میں مشہور و مشاق تاریخ گوشاعر سید انور علی شاد جے پوری (مؤلف "شاہدِ غم" ۱۳۵۰ ہجری) کی کہی ہوئی تاریخوں پر مشتمل ہے یہ فی الحال قلمی نسخہ ہے جسے ان کے صاحبزادے مہر تقوی جے پوری نے ترتیب دیا ہے۔ مجموعہ کا نام تاریخی ہے۔ (کمال)

۲۶۔ اصطلاح التاریخ = ۱۳۸۱ ہجری/۱۹۶۱ عیسوی۔ از کیپٹن منظور حسن (مولف کتاب "فنِ تاریخ گوئی") مطبوعہ نورالتعلیم گکھر۔ پنجاب۔ ماہ جنوری ۱۹۶۲ء (فی الحال اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے۔ یہ معلومات ابھی نامکمل ہیں) البتہ اصطلاح التاریخی سے سنہ حاصل ہوتا ہے۔

۲۷۔ مفہوم تاریخ = ۱۳۸۲ ہجری/۱۹۶۲ عیسوی۔ از خیال جمالی۔ منشور تاریخی خطوط، تاریخی سہرے اور رخصتیوں کا مجموعہ ہے۔ ادارۂ فکر نو کورنگی سے چھپا نام تاریخی ہے (کمال)

۲۸۔ عیون التواریخ = ۱۳۸۴ ہجری/۱۹۶۴ عیسوی۔ از سید غلام مصطفےٰ نوشاہی۔ اس کتاب کا نامکمل حوالہ راقم الحروف کے سابقہ جائزے میں بھی تھا صنادیدِ تاریخ گوئی سے کسی قدر مزید معلومات ہو سکیں ہیں جو نذر قارئین ہیں۔ صنادید میں عارف نوشاہی کے حوالے سے لکھا ہے:

''سلسلہ نوشاہیہ کے شعراء کی روایت یہ رہی ہے کہ اُنھوں نے اپنے سے پہلے اور معاصر رجالِ دین وادب کی وفات پر قطعاتِ تاریخ لکھے ہیں۔'' (از صفحہ نمبر ۲۷۰)

پس یہ وَاضح ہوا کہ ''عیوان التواریخ'' قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ ہے۔ ''عیون التواریخ'' سے ۱۳۸۴ برآمد ہوتا ہے (کمال)

۲۹۔ منتخب اعجاز التواریخ = از شرافت نوشاہی۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے یہ ''اعجاز التواریخ'' کا انتخاب ہے۔ جو بکوشش عارف نوشاہی مکتبہ نوشاہیہ ساہن پال گجرات سے ۱۳۹۶ھ میں شائع کیا
۱۹۷۶ء

گیا ۶ سے ''اعجاز التواریخ'' کا ذکر سابقہ جائزے۔ مطبوعہ الاقرباء ۲۰۰۶ء میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اور
۱۳۳۰ ہجری

''منتخب اعجاز التواریخ'' کا ذکر سابقہ جائزے میں نہیں منتخب اعجاز التواریخ'' تاریخی نام نہیں ہے۔

۳۰۔ صحیفۂ تاریخ = ۱۳۹۴ ہجری/۱۹۷۴ عیسوی از نازش امروہوی۔ مطبُوعہ ہے مگر ناشر کا نام کہیں نہیں لکھا۔ قطعات تاریخ کا مجموعہ ہے۔ نام مجموعہ ہٰذا تاریخی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی اشاعت ۱۳۹۴ ہجری میں ہوئی ہے۔

۳۱۔ فن تاریخ گوئی (سوم) = مؤلف غلام حسین کسرئ منہاس ابن عبدالعلی المعروف ''میاں ''نقوش پبلیشرز لاہور نے کتاب کو شائع کیا۔ اس کتاب کا ذکر پہلی بار راقم الحروف نے خواجہ منظر حسن منظر کے دیباچہ ''رشید تاریخ'' میں پڑھا تھا لیکن سنہ اشاعت اور ناشر کا نام ندارد تھا۔ دوسری بار کتاب ہٰذا کا ذکر ڈاکٹر طاہرہ الماس صاحبہ کے مقالے بعنوان ''کسری منہاس ایک ہمہ جہت

شاعر'' مطبوعہ پیغام آشناس میں پڑھا۔ افسوس! دونوں فاضلین نے کتاب کی اشاعت کا سنہ نہیں لکھا۔ البتہ ڈاکٹر طاہرہ الماس صاحبہ (شعبۂ اردو، کالج برائے خواتین یونیورسٹی۔ لاہور نے کسریٰ کی ولادت ۱۹۰۹ء عیسوی اور ولدیت بھی لکھی ہے۔ وفاتِ کسریٰ ۲۹ نومبر ۱۹۹۵ء لکھی ہے۔ اس سے اندازۂ اشاعت لگایا جاسکتا ہے۔ محترمہ ڈاکٹر صاحبہ نے ڈاکٹر علی احمد جلیلی کا قطعۂ تاریخِ وفاتِ کسریٰ بھی لکھا ہے۔ دو اشعار دیکھیے::

فنِ تاریخ پر کتاب اُن کی   ہے گراں قدر ایک تحفا بھی
اُٹھ گئے وہ علی تو سال ملا   دے گئے دل کو داغ کسریٰ بھی
۱۲   ہجری   ۱۴

اشاریہ: جمہوری اُصول اعداد شماری کے تحت اس تاریخ سے ۱۴۲۶ ہجری حاصل ہوتے ہیں۔ خود کسریٰ منہاس کے اصول کے مطابق (مطبوعہ ''تذکرۂ درفشاں'') ''گئے'' کے اعداد (۴۰) شمار کیے جاتے ہیں۔ اُصولِ جمہور بھی یہی ہے۔ وفاتِ کسریٰ ڈاکٹر طاہرہ کے مطابق ۱۹۹۵ء ہے۔ جس کے مطابق ہجری سال ۱۴۱۶ھ ہے۔ گویا ڈاکٹر علی احمد جلیل کی تاریخ میں دس (۱۰) عدد کی کمی ہے۔ تاریخِ ہذا میں لفظ ''گئے'' کے اعداد (۴۰) کے بجائے (۳۰) شمار کیے گئے ہیں۔ (مقالہ نگار)

۳۲۔ فنِ تاریخ گوئی (چہارم):= مرتبہ رتن پنڈوری، رلارام۔ ہمارے ماٰخذ مہر زماں، بہر زباں کے مؤلف نور احمد میرٹھی نے دیگر تفصیلات نہیں لکھی ہیں۔ البتہ ولادتِ صاحبِ فنِ تاریخ گوئی ۷ جولائی ۱۹۰۷ء پنڈوری۔ (انڈیا) اور وفات ۴ نومبر ۱۹۹۰ء عیسوی پٹھان کوٹ (انڈیا) لکھا ہے۔ اس سے سنہِ تالیف کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

اشاریہ: [فنِ تاریخ گوئی (اوّل) وِردؔ کاکوردی کی کتاب ہے اور فنِ تاریخ گوئی (دوم) کیپٹن منظور حسن کی کتاب کا نام ہے۔ جس کی تفصیلات کے لیے الاقرباء اسلام آباد سال ۲۰۰۶ء دیکھیے۔

۳۳۔ نقیب التواریخ = ۱۴۰۰ ہجری مطابق ۱۹۷۹ عیسوی۔ از عرفان رسام معان صہبائی مطبوعہ الفرید پبلی کیشن ڈھاکہ۔ بنگلہ دیش یہ موصوف معان صہبائی کے قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ ہے آخر میں چند صفحات میں فنِ تاریخ گوئی کے اُصول اور قواعد پر روشنی ڈالی ہے۔ (کمال)

۳۴۔ صنادید تاریخ گوئی = ۱۴۰۶ ہجری مطابق ۱۹۸۵ء عیسوی از ڈاکٹر محمد انصار اللہ۔ (استاد شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ بھارت)۔ اس کتاب کو مجلہ سہ ماہی ''دانش'' اسلام آباد۔ ایرانی فرہنگ سفارتی جمہوری اسلامی اسلام آباد نے اپنے شمارہ نمبر ۵/ ۷ مجریہ ۱۹۸۷ عیسوی/ ۱۴۰۷ ہجری میں شائع کیا ہے۔ جو صفحہ نمبر ۲۱۰ سے ۲۹۰ پر محیط ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے تاریخ گوئی رقم کی ہے۔ آغاز ''تاریخ الامم والملوک'' سے کیا ہے۔ پھر تاریخ گوئی کا ذکر ہے۔ صوری تاریخ اور معنوی تاریخ کا بیان ہے۔ مختلف کتابوں اور مختلف تاریخوں کا ذکر قصہ کی طرح بیان کیا ہے اسی لیے کتاب کی ابتدائی سطور میں ''قِصّہ تاریخ'' (۱۴۰۶ ہجری) سے تاریخ نکالی ہے۔ چند قطعات تاریخ بھی لکھے ہیں۔ آخر میں کتابیات میں ۵۳ کتابوں کے حوالے حواشی ہیں ۹۷ کتب اور منابع میں ۲۲ منابعات دیئے ہیں۔ راقم الحروف کے ''عقدۂ تاریخ گوئی'' کی تیاری میں صنادید تاریخ گوئی سے بھی کافی مدد لی گئی ہے۔ کتاب کا نام تاریخی ہے۔ کتاب کے کل صفحات ۸۰ ہیں۔

۳۵۔ دُرجِ تاریخ = ۱۴۱۸ ہجری/ ۱۹۹۷ عیسوی۔ از سید علی عباد متخلص بہ نیساں اکبر آبادی۔ یہ نیساں اکبر آبادی کے تاریخی قطعات پر مشتمل ہے۔ اس میں موصوف نے ۱۶۷ قطعات تاریخ شامل کئے ہیں۔ نیز اس میں موصوف کے ۵۲ تاریخی خطوط شامل ہیں۔ اور درج تاریخ مطبع ٹی ایس پرنٹر۔ گوالمنڈی راولپنڈی سے ۱۹۹۷ عیسوی میں طبع ہوئی ہے۔ ''دُرجِ تاریخ'' سے ۱۴۱۸ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ جو غالباً آغازِ تالیف کا سن ہوگا۔ (راقم)

۳۶۔ ذُوالقدر القرآن = از راقم الحروف (سید انتخاب علی کمال) زیرِ ترتیب ہے۔ ''ذُوالقدر القرآن'' سے ۱۴۲۳ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ جو آغازِ ترتیب و تالیف کا سال ہے زیرِ ترتیب کتاب میں مساوی الاعداد قرآنی الفاظ و آیاتِ قرآنی مرتب کی جارہی ہیں۔ مثلاً ''الحمد'' کے عدد ۸۳ ہیں لہٰذا اس کو ۸۳ کے خانے میں لکھا ہے۔ ''اَللّٰہ'' کے عدد ۶۶ ہیں لہٰذا اللہ ۶۶ کے مقام پر لکھا ہے۔ اسی طرح سورۂ وَالضُّحیٰ کی آیت نمبر ۱۱ ''وَاَمَّا بِنِعْمَتِہِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ'' کے اعداد ۱۴۲۴ ہیں لہٰذا یہ آیت (۱۴۲۴) کے مقام پر ملے گی۔ بعینہٖ سُورۂ التین کی آیت نمبر ۴ ''لَقَدْ خَلَقْنَا الاِ

نُسَانَ فِی اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ" کے اعداد (۱۸۷۳) ہیں۔ پس یہ آیت اپنے مقام پر دیکھی جائے گی۔ کتاب کا آغاز ۱۴۲۳ہجری میں کیا گیا ہے۔ ہنوز کتاب مکمل نہیں قرآنِ حکیم کے تیس پاروں کا کام کافی ضخیم ہے۔ جس کے لیے ابھی کافی وقت درکار ہوگا۔ دعا فرمایئے اللہ اس کی تکمیل فرمائے۔ (راقم)

اس کے ساتھ ہی چھتیس (۳۶) مجموعہ قطعاتِ تاریخ، کتب ہائے اُصول وقواعد اور کُتب ہائے مساوی الاعداد مادّے ہائے تاریخ کی نئی دریافت اختتام پذیر ہوئی۔ اگلے صفحات میں بعنوان "تذکرات" ایسی کتب نذرِ قارئین کریں گے جن میں مؤلفین نے قطعات تاریخ کے ساتھ شعراء حضرات کے حالاتِ زندگی قلم بند کیے ہیں۔ سابقہ جائزے میں راقم الحروف نے صرف "تذکرۂ درفشاں" کا ذکر شاملِ جائزہ کیا۔ اب چند نئی دریافت پیش ہیں:

تذکرات

۳۷۔ مقالات الشُّعراء = ۱۱۷۴ہجری مطابق ۱۷۶۰عیسوی۔ مرتبہ میر غلام علی شیر قانع تتوی۔ ولادت قانع تتوی ۱۱۳۹ہجری اور وفات ۱۲۰۳ہجری ہے۔ ہر چند "مقالات شعراء" (۱۱۷۴ہجری) کو محض تاریخ گو شعراء کا تذکرہ تو نہیں کہا جاسکتا۔ یہ دراصل ٹھٹھ (ٹھٹہ) اور سندھ کے شعراء کا ایک جامع و مبسوط تذکرہ ہے اس کا نام تاریخی ہے۔ جس سے ۱۱۷۴ہجری حاصل ہوتا ہے جس میں بہت بڑی تعداد انتہائی ماہر و مشاق تاریخ گو شعراء کی بھی ہے مثلاً "مقالات الشُّعراء" (۱۱۷۴ہجری) کے صفحہ ۵۳/۵۴/۵۶ پر اور پھر صفحہ ۴۱۲/۴۱۳/۴۱۴ پر آزاد بلگرامی کی معرکہ آرا تاریخیں ہیں۔ نیز صفحہ ۴۶۵ پر سندھ کے نامور تاریخ گو شاعر احمد آخوند ہالائی اور اعظم شاہ پوری صفحہ ۴۱۳ پر صنعتِ دائرہ میں تاریخیں ہیں جنھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ خود قانع تتوی کی تاریخیں فنّی لحاظ سے فنِ تاریخ گوئی میں بہت اہم تاریخیں ہیں بلکہ اہم تاریخی سرمایہ کہیئے۔ اس طرح متعدد ایسے تاریخ گو شعراء کا ذکر، ان کی تاریخیں مع کوائف ملتی ہیں۔ جن کے بغیر تاریخ فن تاریخ گوئی مکمل نہیں ہو سکتی۔ بہ ایں وجہ "مقالات الشعراء" کو بھی تاریخ گو شعراء کے تذکرات میں شامل کرنا لازمی ہے۔ تذکرۂ ہذا کو پاکستان بننے کے بعد ۱۹۵۸ءعیسوی مطابق ۱۳۷۸ہجری میں سندھی ادبی بورڈ کراچی

نے طبع کروایا۔ جسے سندھ ادبی بورڈ کا عظیم کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ ۳۷؎ (دیکھئے تذکرہ درفشاں۔ص ۱۳۹۷)

۳۸۔تکملۂ مقالات الشعراء = ۱۳۰۷/ ۱۳۰۸ ہجری مطابق ۱۸۸۹ عیسوی۔ مرتبہ محمد ابراہیم خلیل تتوی۔ یہ تذکرہ ۱۳۰۷ ہجری یا ۱۳۰۸ ہجری میں مکمل ہوا۔ نیز تذکرۂ ہذا میں تقریباً ان تمام شعراء کا تذکرہ ہے جو قانع تتوی سے رہ گئے تھے۔ اس میں تاریخ گو شعراء کا تذکرہ بھی ہے۔ (خاصی تعداد میں)۔ اس کو بھی پیر حسام الدین راشدی نے سندھی ادبی بورڈ۔ کراچی کے تعاون سے شائع کیا۔ ''تکملۂ مقالات الشعراء'' ۹۱۲ صفحات پر محیط ہے۔ اس کا نام ''تاریخی'' نہیں ہے۔ (دیکھئے ت۔د۔ص ۱۴۰۰)

۳۹۔گلبنِ تاریخ = ۱۳۱۳ ہجری مطابق ۱۸۹۵ء عیسوی۔ از منشی محمد ارتضٰے علی، شرر کاکوروی (تلمیذ نواب داغ دہلوی) مطبوعہ محمڈن پریس۔ علی گڑھ۔ تذکرہ ہذا کے کل صفحات ۴۳ ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ چند تاریخ گو شعراء کا منظوم تذکرہ ہے۔ اس تذکرے میں شرر کاکوروی نے ہم عصر چند تاریخ گو شعراء کے حالاتِ زندگی نظم میں لکھے ہیں۔ اور اُن ہی شعراء کی تاریخ گوئی کے نمونے کے طور پر ایک ایک دو دو قطعاتِ تاریخ بھی دیے ہیں۔ یہ مختصر مگر منظوم تذکرہ نواب مزمل اللہ خان (رئیس بھیکم پور۔ علی گڑھ انڈیا) کی فرمائش پر لکھا ہے ۳۹؎ (گلبنِ تاریخ سے ۱۳۱۳ ہجری برآمد ہوتا ہے)۔ نیز ''گلبنِ تاریخ'' نام کی ایک کتاب جو تاریخ گوئی کے اصولوں اور قواعد پر مبنی ہے۔ میر مہدی حسن رضوی، الم حیدر آبادی نے بھی تحریر کی ہے۔ الم رضوی حیدر آبادی بھی داغ دہلوی ہی کے شاگرد تھے۔ الم کی ''گلبنِ تاریخ'' کا ذکر راقم الحروف اپنے مقالے ''فن تاریخ گوئی پر یک صد مطبوعات و مخطوطات پر جائزہ'' مطبوعہ سہ ماہی الاقرباء۔ اکتوبر/ دسمبر ۲۰۰۶ء میں کر چکا ہے۔ الم کی گلبن تاریخ کا سالِ طباعت ۱۳۱۳ ہجری ہی ہے۔ (کمال)

۴۰۔قطعاتِ تاریخ = بروفاتِ اہلِ قلم و متعلقین اہلِ قلم = از شان الحق حقی۔ مشمولہ سہ ماہی ''اردو'' کراچی۔ سالِ اشاعت ۱۹۸۵ عیسوی مطابق ۱۳۷۸ ہجری۔ بظاہر یہ قطعاتِ تاریخ کا

مجموعہ معلوم ہوتی ہے مگر اس کتاب میں جن حضرات کی تاریخ ہائے وفات ہیں اُن کے مختصر حالاتِ زندگی بھی ہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف اسے ''تذکرات'' میں شامل کر رہا ہے۔(کمال)

''الاقرباء'' اسلام آباد کے انہی صفحات پر ۲۰۰۶ء/ مطابق ۱۴۲۷ ہجری میں آج سے آٹھ سال قبل ''فنِ تاریخ گوئی پر مطبوعات و مخطوطات کا جائزہ پیش کیا تھا۔ اِن بیتے آٹھ سالوں میں میری تلاش و جُستجو بھی جاری رہی۔ اسی تلاش و جستجو کا حاصل ''مُعتقدۂ تاریخ گوئی'' کی شکل میں نذرِ قارئین ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں فن تاریخ گوئی سے متعلق مرتب کی گئی ہوں گی۔ اس نوعیت کی کتابوں کی جامع فہرست کی تیاری بقول مدیر سہ ماہی ''دانش'' بجائے خود ایک تحقیقی مقالہ ہے۔''

درحقیقت یہ کام ایک ''ٹیم ورک'' ہے۔ مگر۔۔۔؟ ٹیم۔۔۔ اور۔۔۔ وہ بھی فن تاریخ گوئی جیسے خشک اور نامقبول موضوع پر کہاں سے لاؤں؟ ایک خاص مشن کے تحت فنِ تاریخ گوئی کا چراغ روشن رکھنے کے لیے راقم الحروف مجبوراً تنہا ہی یہ کام انجام دے رہا ہے۔ صلہ و ستائش سے بے نیاز صرف اور صرف بزرگوں کے فن کو زندہ رکھنے کے لیئے۔۔ تنہا کام کرنے کے سبب اس میں کچھ ٹیکنیکل خامیاں اور کوتاہیاں بھی ہوں گی جو ماہرین کو نظر آئیں گی۔ مجھے احساس ہے کہ بعض اندراجات ادھورے رہ گئے ہیں۔ جانتا ہوں اگر مزید تلاش کی جائے تو ابھی متعدد کتب مختلف شہروں میں پاکستان کے اندر بھی اور ایران، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے کتب خانوں میں بھی موجود ہیں۔ جن کا اندراج راقم الحروف نہیں کر سکا۔ ادھورے اور نامکمل اندراجات محض اس لیے شامل ''مُعتقدۂ تاریخ گوئی'' کر لئے کہ آج نہیں تو کل کوئی نہ کوئی سر پھرا اس کام کو شروع کرے تو اُسے مقالۂ ہٰذا سے کسی قدر مدد مل تو ضرور جائے گی۔

آخر میں ایک بار پھر محترم اور مخلص انسان جناب میاں سعید الرحمٰن کے پُر خلوص تعاون کا شکر گزار ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر ابرار عبدالسلام صاحب کا بھی ممنوں کہ انھوں نے ''نیساں اکبر آبادی کی تاریخ گوئی پر'' مقالہ تحریر فرما کر تاریخ گوئی کا چراغ روشن کیا۔ امید ہے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب فنِ تاریخ گوئی سے متعلق مزید مقالات تحریر فرمائیں گے۔ یہاں مقالۂ ہٰذا ختم ہوتا ہے۔

ماخذات ومنابع

۱۔ سہ ماہی ''پیغامِ آشنا''۔ اسلام آباد۔ مقالہ ''برصغیر کی فارسی مطبوعات کی تاریخ'' از ڈاکٹر عطا خورشید۔(مدیر شعبۂ قلمی نسخہ، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی۔علی گڑھ۔بھارت) مجریہ اپریل ۲۰۱۳ عیسوی تا ستمبر ۲۰۱۳۔شمارہ نمبر ۵۴/۵۔صفحہ ۱۰۷

۲/۳۔ سہ ماہی ''پیغامِ آشنا''۔ اسلام آباد۔ ثقافتی قونصیلٹ۔سفارت اسلامی جمہوریہ ایران۔ مقالہ محولہ بالا صفحہ نمبر ۱۰۱

۴۔ ماہ نامہ ''قومی زبان'' کراچی۔ انجمنِ ترقی اردو پاکستان۔ مجریہ اکتوبر ۲۰۱۴ عیسوی۔صفحہ نمبر ۹۱

۵۔ ''صنادید تاریخ گوئی''۔مرتبہ ڈاکٹر محمد انصار اللہ۔(استاد شعبۂ اردو۔مسلم یونیورسٹی۔ ۱۴۰۶ ہجری

علی گڑھ۔ بھارت۔مطبوعہ سہ ماہی ''دانش'' اسلام آباد۔شمارہ نمبر ۵/۷۔ ۱۹۸۷ عیسوی/ ۱۴۰۷ ہجری) ایرانی فرہنگ سفارتی اسلامی جمہوریہ ایران۔اسلام آباد صفحہ ۲۶۴۔حاشیۂ ہذا از مدیر دانش۔۔۔''یہاں یہ امر بھی قارئین کرام کے علم میں لانا میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ ''صنادیدِ تاریخ گوئی'' (۱۴۰۶ھ) راقم الحروف کو میرے محترم اور بزرگ دوست و کرم فرما جناب میاں سعید الرحمٰن صاحب نے نہایت نفاست و خوبصورتی سے دو طرفہ فوٹو اسٹیٹ پلاسٹک کور کے ساتھ مجلد کروا کے، بھاری ڈاک خرچ اپنی جیبِ خاص سے بذریعہ ڈاک پشاور سے ارسال فرمائی۔ میں موصوف کی خدمت میں انتہائی خلوص کے ساتھ محبت کے گجرے نچھاور کرتا ہوں اور قارئین کرام سے عرض کرتا ہے کہ موصوف کے لیے دُعا خیر فرمائیں۔(انتخاب علی کمال)

۶۔ ''صنادید تاریخ گوئی''۔(مرتبہ ڈاکٹر محمد انصار اللہ) کے آغاز میں فاضل مرتب نے یہ ۱۴۰۶ ہجری

۷۔ از تذکرۂ درفشاں۔مرتبہ مہر تقوی۔جے پوری۔صفحہ نمبر ۱۶۱۱۔مطبوعہ جنوری تا دسمبر ۲۰۱۱ سہ ماہی اردو۔کراچی۔

۸۔ حاشیہ۔ از سہ ماہی دانش (مدیر) صنادیدِ تاریخ گوئی۔ صفحہ نمبر ۲۶۴

۹۔ صنعتِ کامل = ایک مادّہ تاریخ سے بہت سی تاریخ نکالنا۔ اور چند مادّہ ہائے سے بے شمار تاریخیں حاصل کرنا۔ جویا مرادآبادی نے دس اشعار سے بارہ ہزار تاریخیں نکالی ہیں۔ اور عبدالحفیظ معجز بنگلوری نے چھ اشعار سے دس ہزار تاریخیں حاصل کی ہیں (کمال)

۱۰۔ شیدا حیدرآبادی آصف جاہ دوم کے عہد میں "میر سامان" کے عہدے پر فائز تھا۔ صنادید تاریخ گوئی صفحہ ۲۶۸

۱۱۔ تذکرۂ درفشاں۔ مرتبہ مہر تقوی جے پوری۔ صفحہ نمبر ۱۶۰۶ مطبوعہ جنوری تا دسمبر ۲۰۱۱ء سہ ماہی اردو۔ کراچی۔

۱۲۔ صنادیدِ تاریخ گوئی۔ صفحہ ۲۶۷

۱۳۔ صنادیدِ تاریخ گوئی۔ صفحہ نمبر ۲۸۲

۱۴۔ صنادیدِ تاریخ گوئی ص ۲۷۶

۱۵۔ ایضاً ص ۲۷۲

۱۶۔ ایضاً ص ۲۷۲

۱۷۔ تذکرۂ دُرفشاں

۱۸۔ صنادیدِ تاریخ گوئی۔ صفحہ ۲۸۴۔ صنادیدِ تاریخ گوئی میں شائع شدہ فہرست کتابیات کے بارے میں اس صفحے کے حاشیہ میں لکھا ہے۔ کہ یہ فہرست پروفیسر کلیم سہسرامی صدر شعبہ السنہ راجشاھی یونیورسٹی (بنگلہ دیش) اور مدیر دانش کے تعاون سے تیار کی گئی ہے۔

۱۹۔ تذکرۂ دُرفشاں مرتبہ مہر تقوی جے پوری صفحہ ۱۲۷۶

۲۰۔ سہ ماہی 'الاقرباء' اکتوبر/ دسمبر ۲۰۰۶ء صفحہ نمبر ۵۹

۲۱۔ "تذکرۂ دُرفشاں"۔ صفحہ ۱۶۴۳

۲۲۔ تذکرۂ درفشاں۔ صفحہ نمبر ۱۱۲۲۷

۲۳۔ ''صنادیدِ تاریخ گوئی'(۱۹۶۰ء)۔ صفحہ نمبر ۲۸۲

۲۴۔ ایضاً صفحہ نمبر ۱۱۶۲

۲۵۔ ایضاً ۔ صفحہ ۲۸۱

۲۶۔ صنادیدِ تاریخ گوئی۔ صفحہ نمبر ۲۷۸

۲۷۔ ایضاً صفحہ نمبر ۲۷۹

۲۸ ایضاً صفحہ نمبر ۲۷۷

۲۹۔ ایضاً صفحہ نمبر ۲۷۶

۳۰۔ ''بہرزماں بہرزباں''۔ مرتبہ نور احمد میرٹھی۔ ناشر ادارۂ فکر نو۔ کورنگی کراچی

۳۱۔ مضمون بعنوان ''قطعاتِ تاریخِ وفاتِ شعراء'' از ڈاکٹر عبدالروف خاں۔ مطبوعہ رسالہ دوماہی ''برہان'' دہلی مجریہ جنوری/فروری ۱۹۹۹عیسوی۔

۳۲۔ صنادیدِ تاریخ گوئی۔ صفحہ نمبر ۲۸۳

۳۳۔ ماہ نامہ ''قومی زبان'' مجریہ ماہ اگست ۲۰۱۴عیسوی/سہ ماہی الاقرباء جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۴ء مقالہ ڈاکٹر ابرار عبدالسلام ''نیساں اکبرآبادی کی تاریخ گوئی: تجزیاتی مطالعہ''۔

۳۴۔ عارف توشاہی کے بارے میں ڈاکٹر عطا خورشید (علی گڑھ) کے اپنے مقالے ''برصغیر کی فارسی مطبوعات کی تاریخ'' (کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ)

۳۵۔ صنادیدِ تاریخ گوئی۔ صفحہ نمبر ۲۷۹

۳۶۔ ''نیساں اکبرآبادی کی تاریخ گوئی از ڈاکٹر عبدالسلام، سہ ماہی الاقرباء ۲۰۱۴ء

۳۷۔ تذکرۂ درفشاں۔ ۱۳۹۷

۳۸۔ تذکرۂ درفشاں۔ نمبر ۱۴۰۰

۳۹۔ صنادیدِ تاریخ گوئی نمبر ۲۸۲/۲۸۳

ڈاکٹر مظہر حامد

عہد حاضر میں مسدس حالی کی اہمیت

الطاف حسین حالی نے غزل کہی اور خوب کہی، ''دیوانِ حالی'' میں جو غزلیں ہیں وہ بھرپور تغزل سے لبریز ہیں۔ جب نظمیہ شاعری کی طرف اپنی فکر کو مرکوز کر دیا تو انہیں یہ کہنا پڑا

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی — بزم شعراء میں شعر خوانی چھوڑی

جب سے دلِ زندہ تُو نے ہم کو چھوڑا — ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

وقت اور حالات کے پیش نظر ایک ایسا نوحہ نظم کی صورت میں مرقوم کیا جسے مسدس حالی کہا جاتا ہے۔ حالی کو مسدس لکھنے کی کیوں ضرورت پیش آئی اس کا جواب انہوں نے اپنے دیباچے میں تحریر کر دیا ہے۔

''قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں، علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دُہائی ہے، اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک پاؤں میں پڑی ہے، جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔''

اس پیراگراف کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں کہ حالی نے برصغیر کے مسلمانوں کو قبل از اسلام اور بعد از اسلام کے حالات و واقعات سے باخبر رکھتے ہوئے دینی اور اخلاقی جذبے کو ابھارتے ہوئے اس طرف توجہ مبذول کرائی۔ قبل از اسلام انسانوں کی حالت اسقدر بدتر ہو گئی تھی۔ ایک خدا کو چھوڑ کر گمرہی کی دلدل میں پھنستے چلے گئے۔ کہیں آتش پرستی تو کہیں بت پرستی اور کہیں چاند سورج اور کواکب پرستی ہو رہی تھی، جزیرہ عرب کی اس قوم کا نقشہ حالی نے کچھ اس طرح

کھینچا ہے

پر اس قومِ غافل کی غفلت وہی ہے تنزل پہ اپنے قناعت وہی ہے
ملے خاک میں پر رعونت وہی ہے ہوئی صبح اور خواب راحت وہی ہے
نہ افسوس انہیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ

مسلمانوں کا عروج وزوال اور مدّ وجزر کسی سے پوشیدہ نہیں، مولانا حالی نے عصری تقاضوں کے پیش نظر مسدس حالی میں ان تمام کیفیات کو شدت جذبات اور اپنی ذاتی حسیت جس میں کرب ہی کرب ہے بیان کیا ہے، عرب کی جس جہالت اور تفاخر کا ذکر انہوں نے کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی اور اخلاقی قدریں بالکل ختم ہو چکی تھیں، لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے تھے۔ جہالت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس تناظر میں اگر ہم عہد موجود کا جائزہ لیں یا تقابلی راستہ اختیار کریں تو جہالت کا رحجان آج کے دور میں بڑھتا ہوا نظر آئے گا۔ عرب کی اجہل قوم کو تو احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اخلاق وکردار کی روشنی میں قبیلوں کی شکل میں آپس میں شیر وشکر کر دیا تھا۔ تمام تفرقے ختم کرا دیے تھے انسان انسانیت سے ناواقف تھے۔ ہر وقت مرنے، مارنے اور جہالت پر کمر بستہ رہتے تھے۔ جیسا کہ حالی نے اس بند میں تصویر کھینچی ہے۔

چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ ہر اک لُوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ

وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

مسدس حالی میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی کامیابی اور عروج کو ایک عزم استقلال کے ساتھ پیش کیا ہے، عہد حاضر کی پستی اور زوال کو کاہلی اور سستی سے تعبیر کیا ہے۔ رام بابو سکسینہ کا کہنا ہے کہ:

"یہ ایک الہامی کتاب ہے اور اس کو تاریخِ ارتقائے ادب اردو میں ایک سنگ نشاں سمجھنا چاہیئے۔"

مسدس حالی کا ہر لفظ تاثیر اور اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ محاکات اور واقعات کو سادگی اور صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ "جہالت" کو واضح کرتے ہوئے تاریخی حوالے غور طلب ہیں مثلاً یہ بند دیکھیئے

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی　　صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی

قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی　　تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی

نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ

کرشمہ اک اُن کی جہالت کا تھا وہ

حالی نے سب سے اہم اور بڑا کام یہ کیا کہ شاعری کے اسلوب اور رنگ و آہنگ کو یکسر بدل ڈالا۔ ایک نئی فکر اور جدید اصولوں سے روشناس کرایا۔ مسدسِ حالی میں جو جذبات اور کیفیات منظوم ہوئی ہیں اُن میں زمانہ حال کے مسلمانوں کو ماضی کے مسلمانوں سے باخبر کرنا مقصود تھا۔ معاشرتی اور قومی اصلاح کو پیش نظر رکھا۔

اندھیرا تواریخ پر چھا رہا تھا　　ستارا روایت کا گہنا رہا تھا

درایت کے سورج پہ ابر آ رہا تھا　　شہادت کا میدان دھندلا رہا تھا

سرِ رہ چراغ اک عرب نے جلایا

ہر اک قافلہ کا نشاں جس سے پایا

غرض یہ کہ مسدس میں عرب کے حالات، بود و باش، طرز معاشرت اور جہالت میں ڈوبے ہوئے انسانوں کی حالت زار کو اُجاگر کیا ہے۔ حالی نے اُس قوم کا نقشہ اس بند میں پیش کیا ہے:

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے　　بھنور میں جہاز آ کے جس کا گھرا ہے

کنارہ ہے دُور اور طوفاں بپا ہے　　گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے

نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی

موجودہ دور میں مسلمانوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں پر جو افتاد پڑی، وہ دو اطراف سے۔۔۔ ایک انگریز حکمرانوں کی وجہ سے دوسرے ہندوؤں کے منافقانہ طرزِ عمل سے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔ مسلمانوں کی تنزلی کے اسباب، غفلت، کاہلی، بے عملی اور اخلاقی پستی ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر مسلمان اپنا وقار، دبدبہ اور شان و شکوہ سب کھو بیٹھے۔ اور اب یہ حال ہے کہ مسلمان گروہ بندی میں تقسیم ہو گئے یہ بات بھی سچ ہے کہ حالی مسلمان قوم سے مایوس نہیں بند ملاحظہ کیجئے!

تنزل پہ وہ ہاتھ ملنے لگے ہیں ۔۔۔ کچھ اس سوز سے جی پگھلنے لگے ہیں
دھوئیں کچھ دلوں سے نکلنے لگے ہیں ۔۔۔ کچھ آرے سے سینوں پہ چلنے لگے ہیں

وہ غفلت کی راتیں گزرنے کو ہیں اب
نشے جو چڑھے تھے اُترنے کو ہیں اب

انور سدید ''مسدس حالی'' کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''چنانچہ سرسید نے بہتے پانی کی طرح نرم اور رواں حالی کو اپنی زوال آمادہ قوم کا نوحہ لکھنے کی ترغیب دی اور فطری شاعری کا رُخ قومی شاعری کی طرف موڑ دیا۔ حالی کا مسدس اردو کی مقصدی شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طویل نظم میں حالی نے قوم کی دُکھتی ہوئی رگ کو ایک ماہر نباض کی طرح پکڑا ہے اور اسے موثر انداز میں شعر و ادب کا روپ دے دیا ہے۔''

عہد حاضر میں مسدس کی اہمیت اس لیے بھی ضروری ہو گئی کہ آج کا معاشرہ جس بے راہ روی کا شکار ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کا جو تشخص تھا پرخچے اُڑ کر رہ گئے ہیں۔ تہذیب، اخلاق، شرافت،

انسانیت نام کو نہیں۔ مسلمان فرقوں میں تقسیم در تقسیم ہو گئے قرآن، سنت، احکام الٰہی اور تعلیمات نبویؐ سے کوسوں دور ہی نہیں بلکہ پس پشت ڈال دیا ہے۔ ایک راگ ہے جو جمہوریت کا الاپا جاتا ہے۔ جو سراسر جھوٹ، فریب اور دھوکا ہے۔ شاید افلاطون نے صحیح کہا تھا:

''جب پوری مملکت مریض ہو تو کیا ایسے طبیب کی خدمات نہیں حاصل کرنی چاہیں جو سب سے اچھا اور دانا ہو۔ تو معلوم ہوا کہ سیاسی فلسفے کو جو مشکل درپیش ہے وہ یہ ہے کہ کوئی ایسا طریقہ دریافت کیا جائے کہ نااہل و بدمعاش لوگ سرکاری عہدے حاصل نہ کر سکیں۔ اور جو لوگ واقعی فرماں روائی کے اہل ہیں انھی کا انتخاب کیا جائے۔''

حضرت علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی جب یہ حالت دیکھی کہ مسلمان اب وہ مسلمان نہ رہے۔ تو انہوں نے پہلے بارگاہِ ربّ العزت میں ''شکوہ'' پیش کیا۔ اور پھر ''جواب شکوہ'' میں مسلمانوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ ملاحظہ کیجیے۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں — کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

سب سے پہلے ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ ایک فکر اور ایک مرکز پر جمع ہو جائیں کیونکہ ہماری نجات اور فلاح صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے احکام اور شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر چلنے میں ہے۔ ہماری کامیابی کامرانی اور سُرخروئی کا راز حج کا وہ خطبہ ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ آج ہم ان تعلیمات سے منحرف ہو گئے ہیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ کل مسلمان کیا تھے اور آج مسلمان کس قعرِ مذلت میں پڑے ہیں رحمٰن کیانی نے اپنے ایک شعر میں کیا پتے کی بات کہی ہے

یکجا نہ ہو سکے جو محمدؐ کے نام پر — لعنت خدا کی ایسے خواص و عوام پر

لاالہ الااللہ محمد الرسول اللہ وہ کلمہ ہے جو تفریق مٹاتا ہے۔ آپس میں بھائی چارے اور اخوت کا درس دیتا ہے۔ اسلام حلقہ بندی اور گروہ بندی کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے ہمیں چاہیئے کہ ہم ایک دوسرے کا احترام کریں۔ انسانیت اپنائیں اور خوشگوار ماحول اور معاشرت کی تشکیل کریں، قرآن مجید میں غور وفکر اور حضورؐ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں۔ انشاء اللہ مسلمان پھر سے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ الطاف حسین حالی نے مسدس میں وہ تمام باتیں اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں بیان کر دی ہیں جو انہوں نے مسلمانوں کی حالت برصغیر میں دیکھی کہ کس کس طرح مسلمانوں پر مصیبت اور آفات کے پہاڑ ٹوٹے آخر یہ نوبت یہاں تک کیسے پہنچی؟ حالی کی مسدس کا خلاصہ بس یہی ہے۔

ہماری تہذیب اور تاریخ اس بات کی شاہد بھی ہے اور آئینہ دار بھی کہ اوائل کی پانچ صدیاں مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ مسلمان علوم وفنون، تاریخ وفلسفہ منطق، علم الکلام، علم سائنس طب وجراحت غرض ہر شعبہ زندگی میں مسلمان اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ چکے تھے۔ ہمیں ایک نظر اُن مسلمانوں پر ڈالنا چاہیے کہ وہ کیوں ہر شعبہ میں کامیاب تھے ہمیں اس سوال کا بہ آسانی جواب مل جائے گا۔ اُن کے پاس عمل تھا۔ انسانیت تھی۔ اسلام کے اصولوں پر چلتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور پیروی میں اپنے شب و روز گزارتے تھے۔ خلفاء راشدین کا دور ہمارے حکمرانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ جہاں عدل وانصاف کا بول بالا رہا ہے، شریعت نے جو آئین دیا اس کے سب پابند تھے۔ اسی لیے امن اور اخوت کی فضا قائم رہی۔ نوشیرواں عادل نے ایک جگہ کیا خوب بات کہی:

"قانون میں اگر رعایت شامل ہو جائے تو ریاست باقی نہیں رہتی۔"

چنانچہ سب سے پہلے ہمیں اپنے دین اسلام پر واپس آنا ہوگا۔ نفرتیں بھلا کر محبتیں تقسیم کرنا ہونگی۔ ضبط وتحمل سے کام لینا ہوگا۔ برداشت کا مادّہ پیدا کرنا ہوگا۔ حالی نے اپنے بند میں اسلام کی سربلندی کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی ہے۔

رہے جب تک ارکانِ اسلام برپا　　　　چلن اہل دیں کا رہا سیدھا سادا
رہا میل سے شہد صافی مُصفّا　　　　رہی کھوٹ سے سیم خالص مُبرّا

نہ تھا کوئی اسلام کا مرد میداں
علم ایک تھا شش جہت میں دُرافشاں

مسدس حالی کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو اس میں سماجی، تہذیبی، معاشرتی کمزوریوں کا پتہ چلے گا۔ ساتھ ہی ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جو اخلاقی اور سماجی اصلاح و تعمیر کا ذریعہ بھی ہے۔ جگہ جگہ بلیغ اشارات، درد کی کسک، جذبے کا خلوص اور شدت احساس واقعیت اور اصلیت کو اُجاگر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ عصر حاضر کے تقاضے اور غم دوراں کی الجھنوں کو نہایت فراست سے ہمکنار کیا ہے۔ زبان نہایت صاف اور شُستہ ہے۔ تشبیہات متحرک اور کیف آور ہیں زور بیان میں کہیں تکان اور چُستی میں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔ مسدس حالی میں الفاظ کی نشست، محل استعمال، مضمون سے ان کی مناسبت حسن مذاق اور شاعرانہ صلاحیت کو دیکھا جاسکتا ہے۔ الہامی اور عارفانہ رنگ ہے ایمانی جذبہ محبت نے دلوں میں گرمی پیدا کر دی ہے۔ مسدس پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ تسنیم و کوثر سے دُھلی ہوئی زبان اور تاثیر میں ڈوبا ہوا بیان ہے جو تخیل کی پاکیزگی کا اظہار ہے، ارسطو کا کہنا ہے:

''شاعری تاریخ سے زیادہ فلسفیانہ ہوتی ہے اس لیے کہ مؤرخ خود کو امر واقع کا اسیر بنا لیتا ہے جب کہ شاعر خصوصی واقعات کو عمومی اور آفاقی بنا دیتا ہے اور مخصوص اور منفرد مقامات کے ذریعہ آفاقی و کائناتی حقیقت کو پیش کرتا ہے۔ اس طرح شاعر بھی فلسفی کی طرح صداقتوں کو تلاش کرتا ہے۔''

ممتاز مستشرق رینالڈ نکلسن خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

''تاریخ کی مکمل چھان بین کے بعد میں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ دنیا میں شاید ہی کوئی شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ایسا آیا ہو جس نے کمال خوبصورتی سے لوگوں کی تقدیر سنوار دی۔''

مشہور زمانہ فلسفی وادیب ٹالسٹائی ہدیہ تحسین پیش کرتا ہے:

''بے شک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان عظیم مصلحین میں سے ہیں جنھوں نے عالم انسانیت کے لیے بہت بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔''

نامور جرمن ادیب اور دانشور گوئٹے مالا اپنی ایک کتاب میں حضور اکرمؐ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ رات عقیدت واحترام کے ساتھ مناؤں جس رات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہونے کی تکمیل ہوئی۔''

ان غیر مسلموں کی آراء سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ تمام انسانوں سے افضل واعلا ہے۔ کیونکہ آپ ہی اللہ کے محبوب ہیں۔ حُب رسولؐ ہی اساس ایمان ہے۔

فرزانہ احمد نے ''حُب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اساس ایمان ہے'' کے موضوع پر ایک بسیط مضمون تحریر کیا ہے اُن کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی چار بنیادیں ہیں:
۱۔ایمان ۲۔اطاعت ۳۔اتباع ۴۔محبت۔فرزانہ احمد کا سوال کہ کیوں دعویٰ حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باوجود ہم تاریک راہوں میں بھٹک رہے ہیں اور ہمارا ایمان کمزور ہورہا ہے

''غور کریں ہمیں دعویٰ حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ہے مگر کیا ہمارا رنگ بھی وہی ہے جو ہمارے حبیب کا تھا۔ وہ سراپا قرآن تھے اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور اس کے دین کو عملاً نافذ کرنے والے اور ہم دعویٰ محبت کرنے والے جھوٹے ہیں۔ بے ایمان ہیں رشوت وسود لیتے اور دیتے ہیں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اپنی اپنی خواہش نفس کو پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں کون سی برائی ہے جو ہم میں نہیں، کون سا جُرم ہے جو ہم نے نہیں کیا ہمارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ تو وہ نہیں جو ہم نے اختیار کیا ہوا ہے۔ صحابہ کرامؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں آپ کی سُنت پر عمل کرتے

تھے اس لیے ان کا دور بہترین اور ہم آپ کی سُنت سے روگردانی کرتے ہیں اس لیے ہمارا دور اس کے برعکس ہے۔''

اگر ہم تاریخی اعتبار سے اس بات کا جائزہ لیں کہ مسلمان قوم انتشار کا شکار کیسے ہوئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ عالمگیر کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی، عالمگیر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اقتدار کے حصول میں قتل وغارت اور خونریزی کا بازار گرم رہا۔ جہاندار شاہ نامی شخص کے بارے میں تاریخ نے بھی آنسو بہائے ہیں اس کے دل ودماغ پر ایک غلیظ اور گھٹیا درجے کی عورت سوار ہوگئی تھی۔ جہاندار شاہ ایک اوباش اور عیش ونشاط کا رسیا تھا اس کی شراب نوشی اور ہوس پرستی کی بنیاد پر زوال آمادہ حکومت مزید تنزلی کا شکار ہوگئی۔ اس عورت کا نام لال کنور تھا، جہاندار کو گرفتار کر کے اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کی حالت زار تباہ ہوتی چلی گئی یکے بعد دیگرے حملہ آور آتے قتل وغارت کا بازار گرم رکھتے اب وہ نادر شاہ درّانی ہو یا پھر احمد شاہ ابدالی۔ شیر شاہ سوری یا ظہیر الدین بابر، مغلیہ سلطنت کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے ہمایوں اور اکبر کا طرز حکومت ہمارے سامنے ہے۔ جلال الدین اکبر نے تو رہی سہی کسر پوری کر دی وہ تو مجدّد الف ثانیؒ نے بروقت اس کے ہر حکم کو رد کیا اور قرآن وسنت کے تحت فیصلے اور فتوے دیئے۔ خلیج بنگال کے رستے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے پیر جمانا شروع کیے اور بالآخر ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی عمل میں آئی۔ میر جعفر جیسے غدار وطن نے انگیریزوں سے وفاداری نبھائی اور قدم جمانے میں پوری مدد کی۔ اس طرز عمل سے حکومت روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ انگریزوں نے اپنا تسلط قائم کیا بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون میں قید کر دیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور بغاوت کی پاداش میں صعوبتیں، ٹھوکریں اور دردر کی کاسہ گدائی مقدر ٹھہری ان تمام باتوں کو دُہرانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہم مسلمانوں کی اپنی غلطیاں تھیں، ہم نے دین، مذہب اور اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھلا کر عیش وطرب کی محفلیں آباد کیں۔ اور عیش پرستی میں ایسے پڑے کہ اپنا سب کچھ جس میں

شان و شوکت، جلال و ہیبت اور اخلاقی قدریں تھیں سب کچھ گنوا بیٹھے۔ تاریخی حالات و واقعات کے تناظر میں حالی نے صحیح وقت پر مسدس لکھ کر مسلمانوں پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ یقیناً اس نظم کی بدولت مسلمانوں کو روشنی کی کرن نظر آئی۔ خواب غفلت سے جاگے اور اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کے لیے کمر بستہ ہوگئے۔ حالی نے کیا خوب بند کہا ہے

اسی طرح یاں اہل ہمت ہیں جتنے ‏ ‏ ‏ ‏ کمر بستہ ہیں کام پر اپنے اپنے
جہاں کی ہے سب دھوم دھام ان کے دم سے ‏ ‏ ‏ ‏ فقیر اور غنی سب طفیلی ہیں ان کے

بغیر ان کے بے ساز و ساماں تھی مجلس
نہ ہوتے اگر یہ تو ویراں تھی مجلس

لیکن حالی جب دین کی بات کرتے ہیں تو برملا یہ کہتے ہیں کہ دین سے کنارہ کش ہو کر ہم نے خود اپنے اوپر ظلم کیا خاص کر مسلمان قوم اپنے دین سے ہٹ چکی ہے اسی لیے آج ہم پستی اور تنزلی کا شکار ہیں۔ بند ملاحظہ کیجئے

وہ دیں جس سے توحید پھیلی جہاں میں ‏ ‏ ‏ ‏ ہوا جلوہ گر حق زمین و زماں میں
رہا شرک باقی نہ وہم و گماں میں ‏ ‏ ‏ ‏ وہ بدلا گیا آ کے ہندوستاں میں

ہمیشہ سے اسلام تھا جس پہ نازاں
وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں

مسدس حالی کی مقبولیت میں آج بھی جس قدر اضافہ ہوا ہے اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ہر دور میں اس سے رہنمائی لی جا سکتی ہے۔ اس کا ہر بند پُر اثر اور پُر درد ہے۔ مسدس پڑھتے وقت ایک جوش، ولولہ، دین سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ سر سید احمد خاں نے مسدس حالی پر جو رائے دی ملاحظہ کیجئے:

''یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنف نظم میں ایک نیا دور پیدا کر دیا اس کی عبارت کی خوبی اور صفائی اور ان کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔''

محمد فیصل مقبول عجز

کلامِ داغ میں حمد و نعت و منقبت

داغ اپنی شوخیِ ادا اور سلاست و روانی میں اپنے دور کے ہر شاعر سے سبقت لے گئے۔ کلامِ داغ میں اُن کا مخصوص رنگِ سخن نظر آتا ہے جس میں اُن کی شخصیت اور شاعری یک جان ہو کر ایسا تاثر پیدا کرتی ہیں کہ ان کے مخالفین بھی اُن کی طرزِ ادا اور حسنِ بیان پر ایمان لے آتے ہیں۔ مولانا حالی کا کلامِ داغ کو غیر اخلاقی یا حسرت موہانی کا فاسقانہ کہنا ذاتی رائے اور مخصوص طرزِ فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ کلامِ داغ میں حمد و نعتِ رسولِ مقبولؐ اور منقبت بھی موجود ہیں۔ کسی بھی دور کا شاعر اپنی تہذیبی و معاشرتی اقدار کا عکاس ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنے معاشرے کی چند نمایاں اقدار کا نمائندہ بن کر ادب کی خدمت کرتا ہے۔ داغ نے بھی اپنے مخصوص رنگِ سخن سے اُردو زبان میں سلاست اور روانی پیدا کرنے کی سعی کی۔ داغ صحیح العقیدہ سنی مسلمان تھے اور دلّی کی معاشرت میں بزرگانِ دین اور اسلاف سے اظہارِ عقیدت اشعار کی صورت میں بھی ملتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس روایت کو برقرار رکھا۔ ان کے بے شمار اشعار ضرب المثل بن کر آج بھی عام لوگوں کی زبانوں پر ہیں:

کسی کا مجھ کو نہ محتاج رکھ زمانے میں
کمی ہے کون سی یا رب ترے خزانے میں

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے پروانہ یا اِدھر آتا ہے

مجرمِ عشق کو کیا حکم ہے اے داورِ حشر
داغ جنت میں رہے یا وہ جہنم میں رہے

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

کیا کیا فریب دل کو دیے اضطراب میں
اُن کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

اُس دور کے ہر بڑے شاعر نے اپنے کلام میں حمد و نعت کا اہتمام رکھا۔ دیوانِ غالب میں بھی کئی بے مثال حمدیہ اشعار موجود ہیں۔ غالب نے اپنے گناہوں کو یاد کرتے ہوئے پروردگار سے یہ التجا کی تھی:

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

داغ اعترافِ گناہ کرتے ہوئے خُدا کی رحمت سے ناامید نہیں:

نہ پوچھ مجھ سے مرے جرم داورِ محشر مرے گناہوں کا دُنیا میں بھی حساب نہ تھا

ابرِ رحمت ہے اُدھر، دیدۂ پُرنم ہے اِدھر مشکل اس نامۂ اعمال کا دھونا کیا ہے

شاعر اپنے خدا کی رحمت سے پرامید ہے کہ اگر دُنیا میں گناہوں نے اُسے گھیر لیا ہے تو کیا ہوا کہ پروردگار اس کے حال سے ہر لحہ باخبر ہے اور جانتا ہے کہ اس کا نفس اور دنیاوی خواہشات اسے صراطِ مستقیم سے گم راہ کر دیں گی۔ خُدا کے حضور نجات کی التجا کرتے رہنے سے جو قلبی سکون میسر آتا ہے شاعر کے ان اشعار میں اس کا برملا اظہار ملتا ہے:

مجھ گنہ گار کو جو بخش دیا تو جہنم کو کیا دیا تو نے

وہ کریم کیا نہیں ہے وہ رحیم کیا نہیں ہے کبھی داغ بھول کر بھی نہ غمِ نجات کرتا

جوشِ رحمت کے واسطے زاہد ہے ذرا سی گناہ گاری شرط

بخش دے پرسشِ اعمال سے پہلے یارب پوچھ کر کوئی اگر دے تو سخاوت کیسی

رحمت کے کارخانے ہیں واعظ کچھ اور ہی بخشش اُسی کی ہوگی کہ جس سے خطا ہوئی

ان اشعار میں مذہبی عقیدت کے ساتھ خدا کی وحدانیت کا اقرار ہے۔ داغ کے دیوان

"گلزارِداغ" کا آغاز اس حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔

عدوئے سامری فن دیکھ، اعجاز رقم میرا ۔۔۔ عصائے موسوی ہے خلق خالق میں قلم میرا

حمد میں خدا کی عظمت و کبریائی کا اعتراف شاعر کا مقصود ہے زندگی کے ہر لمحہ میں جو مشکلات و مصائب شاعر کو پیش آتے ہیں اُن کے حل کے لیے وہ اپنی کوششوں کے علاوہ خُدا کے حضور سجدہ ریز بھی ہوتا ہے تاکہ اس پر رحمتِ خداوندی ہو اور مشکلات کو قابو پانے کا ہمت و حوصلہ مل سکے۔

سلامت منزلِ مقصود تک اللہ پہنچا دے ۔۔۔ مجھے آنکھیں دکھاتا ہے ہر اک نقشِ قدم میرا

اسی حمد یہ غزل کا یہ شعر ان کے شاگرد اقبال کی یاد دلاتا ہے جس میں وہ بندہ نوازی کا دم بھرتے ہیں۔ داغ کا شعر تھا

تری بندہ نوازی ہفت کشور بخش دیتی ہے ۔۔۔ جو تو میرا' جہاں میرا' عرب میرا' عجم میرا

خدا کی وحدانیت کا تصور ہر مذہب میں کسی نہ کسی روپ میں ضرور ملتا ہے۔ خدا کی وحدانیت اور اس کے ہر جگہ موجود ہونے کا اعتراف جزو ایمان ہے۔ اس حقیقت کو شاعر کچھ اس انداز سے بیان کرتا ہے۔

یہاں بھی تُو' وہاں بھی تو' زمیں تیری فلک تیرا ۔۔۔ کہیں ہم نے پتا پایا نہ ہرگز آج تک تیرا

سورۃ اخلاص میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعتراف بڑے خوب صورت انداز میں کیا گیا ہے اس حقیقت کو ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز میں باندھا ہے۔ داغ یوں کہتے ہیں:

صفات و ذات میں یکتا ہے تو اے واحد مطلق ۔۔۔ نہ کوئی تیرا ثانی ہے نہ کوئی مشترک تیرا

بے چون و بے چگوں ہے بے شبہ ذات تیری ۔۔۔ واحد، احد، صمد ہے اللہ نام تیرا

وقتِ نزع کلمۂ طیبہ کا زبان پر جاری ہونا بخشش کا اشارہ ہے اور سعادت مندی کی علامت بھی۔ داغ بھی اپنے پروردگار سے دُعا گو ہیں کہ

دُعا یہ ہے کہ وقتِ مرگ اس کی مشکل آساں ہو زبان پر داغ کے نام آئے یارب یک بیک تیرا

نواب حیدرآباد نے ۱۸۷۲ء میں حج کا ارادہ کیا تو داغ ان کے ہمراہ تھے۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد واپسی پر داغ نے اپنی بے مثال حمدیہ غزل لکھی۔ داغ کی جذباتی کیفیت اور مذہبی عقیدت کا اظہار ان اشعار سے ہوتا ہے۔

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے
بے طلب جو ملا ملا مجھ کو بے غرض جو دیا دیا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا جو دیا اے خُدا دیا تو نے

دیوان ' آفتاب داغ ' میں پہلی غزل حمدیہ کہی جس میں اپنے عجز و نیاز کا اعتراف کرتے ہوئے خُدا کی کبریائی کا بار بار اعتراف کیا ہے۔

اللہ رے مرتبہ مرے عجز و نیاز کا گویا جواب ہے یہ ترے کبرو ناز کا
یوسف کو چاہ میں تو مسیحا کو چرخ پر عالم دکھا دیا ہے ہے نشیب و فراز کا

'مہتاب داغ' کے اشعار داغ کی مذہبی عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ قیامِ حیدرآباد میں داغ کو جو پذیرائی حاصل ہوئی شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہو لیکن داغ عیش و عشرت میں بھی خدا کی بندگی سے غافل نہیں۔

میں کلمہ گو ہوں خاص خدا و رسولؐ کا آتا ہے بامِ عرش سے مژدہ قبول کا

یا رب ہے بخش دینا بندے کو کام تیرا محروم رہ نہ جائے کل یہ غلام تیرا

پروردگار سے محبت ہی رضائے الٰہی کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔ خدا کی وحدانیت، کبریائی، اور بندے کی عاجزی وانکسار، عجز و نیاز کا اظہار یہ تمام باتیں داغ نے اپنے کلام میں بڑے خوب صورت انداز میں بیان کی ہیں۔ مذہبی عقیدت کا اظہار مسلمان کے لیے باعث فخر ہے لہٰذا شاعر بھی اپنی مذہبی عقیدت اور خدا کی بندگی کو لازم قرار دیتا ہے اور محبوب خدا سرکار دو عالمؐ کے حضور عقیدت کے پھول نچھاور کرتا ہے۔ اقرارِ توحید کے ساتھ عشق نبیؐ میں بھی ایمان کی سلامتی ہے۔ اگر یہ نہیں تو محبت کے سارے دعوے اور تقاضے ادھورے ہیں۔ محبوبؐ کبریا کی غلامی میں ہی دونوں جہانوں کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ داغ بھی عشق نبیؐ سے سرشار ہو کر قلبی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔

الٰہی نقش ہو کلمہ رسولؐ اللہ کا دل پر　　چلے کونین میں نامِ محمدؐ سے درم میرا

اللہ شوق دے مجھے نعتِ شریف کا　　شہرہ ہو خوب میرے کلام لطیف کا

جس دل میں عشق مصطفیٰؐ سما جائے اس میں کسی بات کا خوف نہیں رہتا۔ وہ ہر حال میں یادِ خدا اور نعت مصطفیٰؐ میں محو رہتا ہے۔

سرسبز کشتِ دل ہے محمدؐ کے عشق میں　　کیا اس زمیں میں کام ربیع و خریف کا
شیطان بھاگتا ہے محمدؐ کے نام سے　　کیا خوف اس پلید و خبیث و کثیف کا

معراجِ مصطفیٰؐ وہ عظیم معجزہ ہے جو آپؐ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوا۔ خدا کے حضور سرکارِ دو عالم کی حاضری اور جلوۂ نورِ خدا سے سرفرازی آپ کی عظمت کا اظہار ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نے ہم کلامی کا شرف بخشا لیکن جب آپ نے تجلیِ خدا کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو پروردگار نے فرمایا کہ آپ اس کی تاب نہ لا سکیں گے اور آپ کوہِ طور پر تجلّی نور کے ظہور سے بے ہوش ہو گئے۔ یہ شان ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی کہ پروردگار نے نہ صرف آپ کو عرش پر بلایا بلکہ اپنے دیدار کی نعمت سے سرفراز کیا اور امت محمدیہؐ کے لیے بہت سے انعامات بھی عطا ہوئے

پڑے ہوئے تھے ہزار پردے کلیم دیکھو تو جب بھی غش تھے
ہم اس کی آنکھوں کے صدقے جس نے وہ جلوہ یوں بے حجاب دیکھا

مزا کچھ تو نے اے موسیٰ نہ پایا وہ پایا اس طرح گویا نہ پایا

کہیں مشتاق سے حجاب ہوا کہیں پردہ اُٹھا دیا تو نے

شب معراج یہ کہتے تھے فرشتے باہم سخن طالب و مطلوب، ہوا ، خوب ہوا

حضورؐ اپنی عطا سے خدا کے اذن سے جسے چاہے جنت کی نعمت عطا کر دیں کہ جنت کے تمام خزانوں کی کنجیاں آپ کے عشق میں پنہاں ہیں۔

داغِ عاصی کو ملے نعمتِ فردوس و نعیم یا نبیؐ دولتِ اسلام کے دینے والے

''گلزار داغ'' کی دوسری نعت جس کا مطلع ہے

نہ ہو کیوں کر افضل ہمارا محمدؐ کہ ہے اپنے پیارے کا پیارا محمدؐ

روزِ محشر جب کوئی نبی امت کا پرسانِ حال نہیں ہوگا اس موقع پر صرف حضرت محمدؐ ساری امت کو بخشوائیں گے یعنی حضورؐ کی شفاعت پر کامل یقین رکھنا جز وایمان ہے۔ داغ کو اگرچہ گناہوں کا اعتراف ہے لیکن روزِ محشر شفاعت پر ایمان بھی ہے۔

الٰہی یہ محشر میں ہم کہتے جائیں کہاں ہے کہاں ہے ہمارا محمدؐ

اے داغ بخشوائیں گے امت کے وہ گناہ ہے آسرا جناب رسالت مآبؐ کا

حشر میں امت عاصی کا ٹھکانا ہی نہ تھا بخشوانا تجھے مرغوب ہوا خوب ہوا

داغ ہے روز قیامت مری شرم اس کے ساتھ میں گناہوں میں جو محجوب ہوا خوب ہوا

یہ ہے داغ کی عرض یا مصطفیٰؐ نہ محروم ہوں میں شفاعت کے دن

حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے اظہار عقیدت اور مدینہ منورہ حاضری کی خواہش داغ کے دل میں ہر لمحہ موجود ہے اور اس کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

بلا لو مدینے میں پھر داغ کو تم نہیں ہند میں اب گزارا محمدؐ

محبتِ اہل بیت کا اظہار ہر مسلمان کا جزو ایمان ہے کیوں کہ اہل بیت اور صحابۂ کرام نے اپنی تمام تر زندگی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں بسر کی:

طاعت خدا کی اور اطاعت رسولؐ کی یہ ہے طریق دولتِ دیں کے حصول کا

یہ داغ ہے صحابۂ عظام کا مطیع یہ داغ جاں نثار ہے آلِ رسولؐ کا

'مہتاب داغ' کی نعت کا مطلع شاعر کے دل کی آرزو کا برملا اظہار ہے۔ ہر مسلمان کی خواہش ہے کہ اسے عشق نبیؐ عطا ہو کہ یہی دین و دنیا میں کامیابی کی ضمانت ہے لہٰذا شاعر بھی اسی کا آرزومند ہے۔

خدا دے تو دے آرزوئے محمدؐ کریں چشم و دل جستجوئے محمدؐ

کہوں کیوں نہ ہر بار صلی علی میں تصور میں پھرتا ہے روئے محمدؐ

بنیں دستِ مژگاں مرے پاؤں یا رب کروں طے ان آنکھوں سے کوئے محمدؐ

داغ کو قیامِ حیدرآباد میں جو عزت اور شہرت نصیب ہوئی کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی لیکن کبھی داغ میں غرور و تکبر پیدا نہیں ہوا لہٰذا وہ ہمیشہ عجز و انکسار کا مظہر بنے رہے۔ تحمل مزاجی اور نیازمندی ان کی طبیعت میں بھری ہوئی تھی جس کا اظہار ضمیمۂ یادگار داغ کے نعتیہ اشعار میں جا بجا ملتا ہے۔

آپؐ کی شان ہے کیا شان رسول عربیؐ   آپؐ پر جان ہے قربان رسول عربیؐ
ہے قیامت میں اسے کون بچانے والا   تم ہو امت کے نگہبان رسولِ عربیؐ
اپنی امت کے نگہبان ہیں کونین میں آپؐ   آپؐ کا حق ہے نگہبان رسولِ عربیؐ
میں گرفتارِ غم و رنج رہوں گا کب تک   میری مشکل کرو آسان رسول عربیؐ

ایک دوسری نعت رسول مقبولؐ کے اشعار کچھ یوں ہیں:

کرو غم سے آزاد یا مصطفیؐ   تمہی سے ہے فریاد یا مصطفیؐ
عطا مجھ کو اللہ ہمت کرے   بجا لاؤں ارشاد یا مصطفیؐ
رہوں حشر میں آپ کی ذات سے   طلب گارِ امداد یا مصطفیؐ
عنایت کی ہو جائے اس پر نظر   رہے داغ دل شاد یا مصطفیؐ

کلام داغ میں بہت سی نعتیں اور نعتیہ اشعار جا بجا موجود ہیں ان سے داغ کی مذہبی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ عشقِ مصطفیؐ کی آرزو بھی دل میں رکھتے ہیں، روزِ محشر اُن کی شفاعت پر کامل یقین رکھتے ہیں اور اہل بیت اور صحابہ کرام سے بھی دلی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ داغ اپنے اشعار میں جہاں عشق مجازی کا اظہار کرتے ہیں اسی طرح عشقِ حقیقی کے تقاضوں کو بھی نبھاتے ہیں۔ داغ اولیائے کرام اور بزرگان دین کا دل و جان سے احترام کرتے تھے۔ اپنے ایک خط میں وہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ مجھے زندگی میں پانچ عشق ہوئے۔ دو آج بھی باقی ہیں ایک منّی بائی حجاب اور دوسرا خواجہ اجمیر الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کا۔ داغ کو خواجہ اجمیر سے دلی عقیدت تھی۔ آپ نے اس محبت کا اظہار اپنے اشعار میں کیا۔ خواجہ صاحب کو ''ہندالولی'' اور'' خواجہ غریب نواز'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ منقبت میں داغ آپ کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں:

یا خواجہ معین الدین چشتی، سلطان الہند غریب نواز   یا واقفِ رازِ خفی و جلی، سلطان الہند غریب نواز

داغ جب بھی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو خواجہ صاحب کے طفیل دُعا کی قبولیت طلب کرتے ہیں۔ اولیائے کرام اور بزرگان دین سے عقیدت کا اظہار دلی کے لوگوں میں ملتا ہے۔ لکھنؤ میں اثنا عشریہ اور شیعہ عقائد کے فروغ سے وہاں کے لوگوں کے عقائد میں تبدیلی واقع ہوئی تھی لیکن دلی میں اب بھی بہت سے لوگ اولیائے کرام سے عقیدت رکھتے ہیں:

منہ عیش و طرب نے پھیر لیا، ان رات کے غم نے گھیر لیا — سب دور ہوں میرے رنجِ دلی سلطان الہند غریب نواز

یہ داغ کہاں تک رنج سہے، تم سے نہ کہے تو کس سے کہے — تم آلِ نبیؐ، اولادِ علیؑ، سلطان الہند غریب نواز

'مہتاب داغ' میں خواجہ غریب نواز کی منقبت میں چند اشعار درج ہیں:

مظہر نورِ دیں معین الدین — آفتابِ زمیں معین الدین

میں ترے آستاں کا خاک نشیں — تو مرا دل نشیں معین الدین

خواجہ جی کے عشق میں داغ پوری طرح گرفتار نظر آتے ہیں۔ اُن سے عقیدت کا اظہار ہر خاص و عام اپنے اپنے انداز میں کرتا ہے۔ داغؔ اپنے اشعار میں اپنی محبت کا اظہار بڑی شدت سے کرتے ہیں

وہ جہاں ہے وہیں ہے دل میرا — میں جہاں ہوں وہیں معین الدین

داغ تیرا ہی دم بھرے جائے — تا دمِ واپسیں معین الدین

پیرانِ پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی ذات پاک سے شاعر کی عقیدت کا اظہار ان اشعار میں موجود ہے۔ غوث اعظم کی منقبت میں داغ نے جس عقیدت کا اظہار کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ رحمتہ اللہ علیہ کو بے شک اولیائے کرام میں خاص مقام و مرتبہ حاصل تھا اور آپ کے وسیلہ سے دُعائیں شرف قبولیت پاتی ہیں۔

یہ دل' محبوب سبحانی کے صدقے — محی الدین جیلانی کے صدقے

تمہاری ذات سے ہے نظم عالم — جہاں بانی کے سلطانی کے صدقے

شیخ صاحب کو عطا کردہ کرامتوں کا تذکرہ اکثر کتب میں درج ہے جس کا اعتراف شاعر کو بھی ہے اور وہ آپ کی ذات پاک سے بے حد متاثر نظر آتا ہے:

یہ زیبا ہے جو ہوں لوح و قلم بھی تمہارے اسم لاثانی کے صدقے
خدائے شمع پروانہ ہو اے داغ ہم اپنے قطب ربانی کے صدقے

کلامِ داغ میں حمدیہ کلام ہو یا نعتیہ کلام، منقبت ہو یا اہل بیت سے محبت کا اظہار، شاعر اپنے اشعار میں اظہار عقیدت کے سچے رنگ بھرتا ہے۔ ان کے عشق میں سچی لگن اور تپش نظر آتی ہے۔ عشق حقیقی کے رموز کو داغ صوفیوں جیسا نہ بھی جانتے ہوں لیکن جس معاشرے میں اُن کی تربیت ہوئی تھی اس کے اثرات اُن کی زندگی میں آخر وقت تک موجود رہے۔ وہ عشق حقیقی کی اصل حقیقت سے آگاہ نظر آتے ہیں گو وہ عملی طور پر اس راہ کے مسافر نہ سہی لیکن آپ کے کلام میں اس عشق کی پاکیزگی اور رفعت صاف جھلکتی ہے۔

خدا کے حضور عجز و نیاز، گناہوں کا اعتراف کرنا، گناہوں پر نادم ہونا، سچے دل سے گناہوں سے توبہ کرنا اور رحمت خداوندی کی امید رکھنا کلامِ داغ کا حصہ ہے۔ اُن کا طرز بیاں اس حوالہ کو اس طرح بیان نہیں کرتا جس طرح ایک پارسا یا صوفی کا ذہن سوچتا ہے لیکن اُن کے کلام میں ان حقائق سے پردہ کشائی ضرور ملتی ہے۔ حضور اکرمؐ سے دلی محبت کا اظہار، آپ کی شفاعت اور آپؐ کے معجزات پر کامل یقین رکھنا ہر مسلمان کا جزو ایمان ہے۔ اسی طرح ختم نبوتؐ پر بھی کامل یقین ہونا چاہیے۔ منقبت میں خواجہ اجمیر شریف اور غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے دلی عقیدت کا اظہار اس بات کا ثبوت ہے کہ داغ کے دل میں بزرگان دین اور اولیائے کرام کی محبت جاہ گزیں تھی۔

کلامِ داغ میں عشق مجازی بالخصوص جس قسم کے عشق کا اظہار ملتا ہے اُس کو سامنے رکھ کر اُن کے سارے کلام پر تبصرہ کرنا آسان بات ہے لیکن اُن کے کلام میں کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کا درس بھی موجود ہے۔ زندگی اور دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ بھی ہے۔ ایسے کلام میں غالبؔ جیسی فراست اور گہرائی و گیرائی نہ سہی لیکن کلام کی تاثیر سے انکار ممکن نہیں۔ ایسے اشعار میں داغ کی زندگی کے

تجربات اور مشاہدات کا گہرا اثر موجود ہے۔ کلام داغ میں ایسے اشعار بھی کثرت سے موجود ہیں جن کو پڑھنے کے بعد ان کے مشاہدہ اور حقائق کائنات کو جاننے کی تڑپ، کا اندازہ ہوتا ہے:

کل تک اُس کی تلاش تھی لیکن　　آج ہے اپنی جستجو مجھ کو

قمر کو جامۂ شب تو بصر کو پردۂ چشم　　کئی لباس ترے نور نے سیاہ ملے

آدمی کو ہے یہی گوشۂ راحت کافی　　گھر کرے دل میں جو انساں تو جنت کیا ہے

منزل عیش نہیں ہے یہ سرائے فانی　　رات کی رات ٹھہر جائیں ٹھہرنے والے

اہلِ جنت کو بھی آیا اس پہ رشک　　جس کسی نے دل میں گھر پیدا کیا

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے　　جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں تو ظاہر نہ کریں　　لوگ کرتے ہیں بُری بات کا چرچا کیسا

بخشا گیا جو داغ سیہ کار دیکھنا　　جنت کہے گی آگ لگا دی جلا دیا

فرشتے بھی دیکھیں تو کھل جائیں آنکھیں　　بشر کو وہ جلوے دکھائے گئے ہیں

جو ہو آغاز میں بہتر وہ خوشی ہے بدتر　　جس کا انجام ہو اچھا وہ مصیبت اچھی

بندے سے ہے کیوں پرسشِ اعمالِ الٰہی　　انسان کو رہتی ہے کہاں اپنی خطا یاد

منحصر قدر ہے رحمت کی گنہ گاروں پر　　مال کا مول ہے موقوف خریداروں پر

پروفیسر محمد زاہد۔ علی گڑھ (انڈیا)

بدایوں کا منفرد شاعر۔۔۔شاد شیخوپوری

بدایوں شمالی ہند کا ایک تاریخی شہر ہے۔ یہ شہر قدیم زمانہ سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ جناب میر محفوظ علی، سلطان حیدر جوش، نظامی بدایونی، آل احمد سرور، مولوی ضیا احمد، ڈاکٹر ابولیث صدیقی، مبشر علی صدیقی، وحید احمد مسعود، ظہیر احمد صدیقی، دیریندر پرشاد سکسینہ جیسے ادباء کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ بدایوں میں اردو شاعری کے افق پر جو شعرا نمودار ہوئے ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس فہرست میں مولوی معین الدین معین، ظہور اللہ، ضابط، نفیس، اسیر، سحر، محو، عالی، زلالی، فقیر قادری، نازش، راغب، فانی، تولا، قمر، جامی، لطف، سبطین، جام نوائی، آفتاب احمد جوھر، ابر، فوق، انجم فوقی، عروج، اوج، دلاور فگار، رونق بدایونی، عرفان صدیقی اور ڈاکٹر اسعد بدایونی جیسے شعرا کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں بدایوں کی ادبی فضا میں جن شعرا نے اہم کردار ادا کیا ان میں ایک قابلِ ذکر نام شاد جیلانی شاد شیخوپوری کا ہے۔ شاد صاحب ۲۵ جنوری ۱۹۳۸عیسوی کو شیخوپور ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے اور ۱۵سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ اس طرح آپ تقریباً ۶۰ سال سے لیلائے سخن کی زلفیں سنوارنے میں مصروف ہیں۔ شاد صاحب حضرت رونق علی خاں رونق بدایونی کے ارشد تلامذہ میں شامل ہیں اسی لیئے آپ کے کلام میں وہ تمام خصوصایت موجود ہیں جو داغ اسکول کا طرۂ امتیاز ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ شاعری کر لینے سے کوئی شاعر نہیں ہو جاتا بلکہ شاعر وہ ہوتا ہے جسے شاعری خود انتخاب کرے۔ شاد شیخوپوری بھی رشید صاحب کی اس بات سے پوری طرح متفق نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں

شاعری بھی خدا کی نعمت ہے ــــــ یہ بھی سب کو عطا نہیں ہوتی

دورِ حاضر میں اردو شاعری میں تین طرح کے شعرائے کرام ہیں۔ پہلے گروپ میں وہ شعرا شامل ہیں جو روایت پرست ہیں اور شعر میکانکی انداز میں کہتے ہیں۔ان کی شاعری میں اسلوب اور خیال کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ان شاعروں کا کام صرف اپنے انداز میں شاعری کرنا ہوتا ہے۔ انھیں کچھ نیا کرنے کی فکر نہیں ہوتی۔ایک بات جو ماضی کے ہزاروں شاعروں۔نے اپنے اپنے انداز میں کہی ہے اسی کو بس 'اپنے' انداز سے کہہ دینے کے عادی ہیں۔بدقسمتی سے ایسے ہی شعرا کی تعداد بھی زیادہ ہے۔دوسرا گروپ نام نہاد جدت پرست شاعروں کا ہے۔یہ وہ حضرات ہیں جن کے یہاں جدت کے شوق میں غزل کا قالب ہی بدل گیا ہے۔ان کے یہاں غزل کی ہیئت تو برقرار ہے مگر روح سے خالی ہے۔تیسرا گروپ ان قابلِ قدر شعراء کا ہے جنہوں نے روایت کی پاسداری کو فرض قرار دیتے ہوئے اپنی تخلیقی کاوشیں پیش کی ہیں اور ان میں نیرنگ مضامین نئے اظہار کو پیش کیا ہے۔ان شعراء کے یہاں غزلوں میں روایت اور جدت ایک دوسرے سے گلے ملتے نظر آتے ہیں۔شاد شیخوپوری کا تعلق اسی گروپ کے شعراء سے ہے۔ان کی شاعری میں نئی اور پرانی حقیقتیں مل کر ایک نئی معنویت پیدا کرتی ہیں۔روایت کے دائرے میں رہتے ہوئے خوب صورت اشعار نکالنا مشکل کام ہے۔شاد شیخوپوری چونکہ داغ اسکول کے نمائندہ شاعر ہیں اس لیے ان کے یہاں روایت کی پابندی بڑی سختی سے کی گئی ہے۔شاد شیخوپوری نے روایتوں کے ساتھ ساتھ غزل کے عصری تقاضوں کو بھی پورا کیا ہے۔شاد شیخوپوری کی شاعری میں قدیم اور جدید حقیقتوں کے نگینے جابجا نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے الفاظ، تراکیب استعارہ یا تشبیہ سب ایک دوسرے سے مانوس ہیں۔ان کی شاعری کا رنگ گہرا اور قدیم و جدید حقیقتوں سے مل کر نئی معنویت پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔چند اشعار پیش ہیں:

لباسِ برف میں ملبوس کل جو گھر اُترا   پرندہ وہ بھی جنوبی نہ تھا شمالی تھا

خود کی آواز گشت کرتی ہے   گنبدوں میں صدا نہیں ہوتی

ہر سمت نہیں وقت کے سورج کی تمازت　　　اک میری طرف دھوپ کی یلغار بہت ہے

بے رحم موسموں نے جسے کر دیا اجاڑ　　　اس پیڑ پر جو رہتی تھی چڑیا اداس ہے

رمیدہ وقت کے منظر بدلتے رہتے ہیں　　　ہوا کا قہر بھی سوکھے شجر سے کتنی دیر

غرور اس کا غم و الم کی گرفت میں تھا　　　جب اس پہ قہر و عذاب اترا تو میں نے دیکھا

اردو کے کلاسیکل شعرا نے ہر مصیبت و پریشانی، فتنہ وفساد اور شر کے لیے ''پیرِ فلک'' کو ذمہ دار بتایا ہے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دنیا کے بیشتر مسائل کے لیے انسان خود ذمہ دار ہے۔ مثلاً گلوبل وارمنگ، فضائی آلودگی، فرقہ وارانہ فسادت، ایٹمی ہتھیاروں سے عالمی امن و امان کو لاحق خطرات وغیرہ۔ جدید شعرا نے اسی تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شاد شیخوپوری کے یہ اشعار دیکھیے۔

ہم زمیں والے ہی شر انگیز ہیں　　　آسماں سے کوئی شر اترا نہیں

سیرت پڑھو تو واقعی شر کا کتابچہ　　　تصویر اس کی دیکھو تو انسان سا لگے

وہ جسے نام فرشتے کا دیا تھا میں نے　　　اب اس انسان میں اغلاط کا لشکر دیکھوں

رگوں میں زہر دماغوں میں شور و شر ہے یہاں　　　کہ بدمزاج جو دیکھو تو ہر بشر ہے یہاں

خموشی سے ہم تو گزر جائیں لیکن　　　یہ شہر شرارت کے شیطان چہرے

شاد شیخوپوری کی شاعری کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کچھ کلیدی استعارے

ہیں۔ان کے یہاں ہوا، سورج، چراغ، دریا، پرندہ، خوشبو، کربلا جیسے الفاظ کا بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ان تمام شعری پیکروں کا اظہار شاعر کے متنوع جذبات کا پتہ دیتا ہے۔

شاد شیخوپوری کی شاعری میں "ہوا" کے استعارے کا جابجا استعمال ملتا ہے۔ہوا انسان کی زندگی کے لیے ضروری ہے مگر شاعر نے اسے اس لیے استعمال نہیں کیا ہے سہوا کا کام تخریب کاری بھی ہے۔چراغ زندگی کو بجھانا اس کی فطرت ہے اور چراغ سے اس کی دشمنی ازل سے ہے۔چند اشعار دیکھیے:

چراغ زیست بھی کہتا ہے عنقریب سحر ہوا کے رخ سے بچاؤ ہوا لگے ہے مجھے

ابھی تو جلنے بھی پائے نہ تھے سنبھل کے چراغ ہوا نے کردیے خاموش رخ بدل کے چراغ

زمین پکار رہی ہے اے برگِ خشک تجھے ہوا کے رقص میں تُو ہے مگر ہے کتنی دیر

کچھ ہواؤں کے جھونکے سفر میں رہے کچھ چراغوں سے تکرار کرنے لگے

پوچھا جو میں نے برگ وثمر شاد کیا ہوئے رو کر ہر اک شجر نے کہا لے گئی ہوا

کیسی پرواز کہ پرواز سے پہلے اے دوست بال و پر کاٹ دیے دست ہوا نے میرے

چراغ محبت بجھائے ہیں اکثر مگر حوصلے بھی دیے ہیں ہوا نے

دل سے نکال دیجیے میرے وجود کو آئی گئی ہوا ہوں مجھے بھول جایئے

فصیل جسم سے ٹکرا کے خود بکھر جانا شعارِ موجِ ہوا کتنا احمقانا ہے

اور ہوا کے استعارے کے یہ روپ بھی دیکھئے

تحریر اس نے خود تو نہ بھیجی مجھے مگر　　جھونکا ہوا کا پرزۂ قرطاس دے گیا

سب پر حکم ہواؤں کا　　صحرا، بستی، پربت، جو

شجر کے خشک پتے بج رہے ہیں　　ہوا کے پاؤں میں گھنگرو نہیں ہے

سورج نہ صرف انسانوں کو بلکہ دنیا کے تمام حیوانات اور نباتات کو بھی توانائی بخشتا ہے۔ شاد شیخوپوری کی شاعری میں سورج کا استعمال نہ صرف زندگی کی علامت کے طور پر ہے بلکہ کہیں تمہید انقلاب ہے، کہیں ستاروں سے عداوت ہے، کہیں برف کی فنائے زندگی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔

ہر ایک صبح نئی روشنی ہے سورج میں　　ہر ایک صبح کو تمہید انقلاب کہو

چڑھتے سورج کا زمانہ ہے ابھی سونے دو　　شام آئے گی تو جاگیں گے ستارے میرے

بستیاں ساحلوں کی سلامت رہیں　　برف دریا پہ سورج اترنے لگے

شب سے پوچھو نئے سورج کی ابھرتی کرنو!　　شب نے دیکھے ہیں ضیاء بار زمانے کیسے

ڈوبتے سورج کا استعمال بھی ملاحظہ ہو:

میری ضو پر نہ اعتماد کرو　　ڈھلتا سورج ہوں ڈھل رہا ہوں میں

کہہ رہی ہے تکان سورج کی　　شاد اب شام ہونے والی ہے

سورج تو جا کے آخری منزل میں سو گیا　　ظلمت کا زہر شام کی وادی میں بو گیا

سحر کی گود میں اُبھرا تھا جو نیا سورج　　کنارِ شام وہی ڈوبتا لگے ہے مجھے

سورج کے استعارے کا یہ استعمال بھی داد طلب ہے:

ڈھل گیا ہمسائے کا سورج اگر　　میرے گھر کا بھی اجالا جائیگا

روشن رخ جب بام پہ آئے　　چاند گہے سورج شرمائے

شاد شیخوپوری نے اپنی شاعری میں "چراغ" کے تصور کو کئی جامہ پہنائے ہیں:

چراغِ زیست سر رہگزر ہے کتنی دیر　　یہ روشنی بھی شریکِ سفر ہے کتنی دیر

لڑتے رہے ہیں ہجر کی رُت سے تمام عمر　　جلتے رہے چراغِ محبت سحر گئے

مرے احساس پر لب ظلمتِ شب کی حکمت ہے　　چراغوں کی ضیائے بیش وکم سے کچھ نہیں ہوگا

اس عمارت کے طاقچوں میں شاد　　جل رہے ہیں چراغ یاس ابھی

میرے گھر کا چراغ صدیوں سے　　تیرگی کا شکار تھا نہ رہا

بادِ نفرت کے مقابل ہے محبت کا چراغ　　دونوں میں اب جس کو رکھے گا خدا رہ جائیگا

حال کے شوخ چراغوں کی ہدایت کے لیے　　اک دیا عہدِ گزشتہ کا بھی دالان میں رکھ

چراغ کے استعارے کا ہوا کے تلازمے کے ساتھ استعمال دیکھیے:

سورج غروب ہوتے ہی روشن کئے چراغ　　لیکن وہی کہ ان کی ضیاء لے گئی ہوا

چراغوں کی جسارت کوئی دیکھے　　ہواؤں کے رخوں پر جل رہے ہیں

شاد شیخوپوری کی شاعری میں دریا کا استعارہ بھی خوب استعمال ہوا ہے۔ دنیا کی تمام قدیمی تہذیبیں دریاؤں کے کنارے ہی آباد ہوئی ہیں۔ دریا سے نہ صرف انسان کی پیاس بجھتی ہے بلکہ دریا زندگی کی نشو ونما کی علامت ہے۔ جہاں دریا کی تخریب کاری سے انسان کے مال و متاع کا زیاں ہوتا ہے وہیں دریا کی موجوں سے انسان کی زندگی میں ایک ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ شاد شیخوپوری کے مندرجہ ذیل اشعار سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

جب تلک رُت رہی صداقت کی ہم نے دریاؤں پر حکومت کی

دریا کے مہتاب عجب ہیں پتھر زیر آب عجب ہیں

پھر بنایا مکاں لب دریا ہم نے اک بار پھر حماقت کی

میری ہر بات کا ٹھہراؤ ہے پتھر جیسا ان کی ہر بات ہے دریا کے حبابوں جیسی

گھٹ گیا سب زورِ سیلابِ جنوں کرب کا دریا مگر اُترا نہیں

مشکل ہے سلگتے ہوئے صحرا کا سفر دوست دریا ہو تو موجوں کے سہارے چلے جاؤ

پرندہ بھی شاد شیخوپوری کا ایک مخصوص استعارہ ہے۔ پرندوں کی پرواز سے خیالات کو بلندی حاصل ہوتی ہے۔ وہیں پرندوں کی پرواز غرور کا استعاہ بھی ہے۔ پرندہ بے وفائی کا استعارہ بھی ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

جن کے بازو تھے بیجان شکرِ خدا وہ پرندے بھی پرواز کرنے لگے

غرور لایا بلندی سے اس کو پستی میں یہی پرندہ فلک پر کبھی اڑان میں تھا

کر کے متروک خلاؤں کا سفر لوٹ آئے جن پرندوں کے تھے ٹوٹے ہوئے پر لوٹ آئے

ذکر تھا بے وفا پرندوں کا — آپ کے کیوں بدل گئے تیور

خوشبو کے استعارے کو بھی شاد شیخوپوری نے بڑی خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ خوشبو سے نہ صرف ذہن کو سکون حاصل ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی انسان اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے۔ پیش ہیں چند اشعار:

دوسروں کو بھی ہدایت دے تغافل سے بچیں — شہرِ خوشبو ہے یہاں خود کو بھی اوسان میں رکھ

جب پڑھوں تیرا قصیدہ تو مہک جائے ضمیر — لفظ تعریف کی خوشبو میں معطر دیکھوں

ادائے دلکشی تو ہے یقیناً — مگر اس پھول میں خوشبو نہیں ہے

کیسے باہوں میں آئے — جسم ترا بکھری خوشبو

''کربلا'' کا استعارہ بھی جدید شعراء کے یہاں استعمال ہوا ہے۔ واقعۂ کربلا چشم کو نم کر دینے والا واقعہ ہے جس سے ہر فرد کا ایمانی رشتہ بھی ہے۔ شاد صاحب نے بھی دورِ حاضر کی الم ناک صورتِ حال کو ظاہر کرنے کے لیے کربلا کا استعارہ اور اس سے وابستہ تمام رموز و علائم کو بڑی خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہوجائیگی:

آنکھ میچوں تو کھلے نیزہ و خنجر دیکھوں — یہ عجب خواب ہیں یہ خواب میں اکثر دیکھوں

اے خدا تو مجھے وہ آنکھ عطا کر جس سے — چودہ سو سال کا میں سابقہ منظر دیکھوں

بہت نزدیک ہے خیمہ سے اب تو لشکرِ اعدا — زبانِ تیغ چشمِ تیر آخر کیوں نہیں کھلتی

جانے کب ٹوٹ پڑے خیمۂ بستی پہ غنیم — ہوش و ادراک کا لشکر ابھی میدان میں رکھ

مذکورہ بالا اشعار کی روشنی میں ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ شاد شیخوپوری نے اپنی منفرد شناخت قائم کرنے کے لیے سخت جگر کاوی کی ہے اور وہ اپنی شاعری کے جمال سے ہمیشہ دل چھوتے رہینگے۔

پروفیسر سیّدہ نغمہ زیدی

اقبال کا نظریۂ قومیت و ملّت

مغربی مفکرین کے نزدیک Nation اور Nationalism کا مادّہ ایک ہی لفظ "Natus" ہے۔ جس کے معنی پیدا شدہ کے ہیں۔ چنانچہ قوم کے لفظ کے مفہوم اور اس کے معنوی حدود متعین کرنے کے لیے انھوں نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔

لارڈ برائس (Lord Bryce) نے قوم کی تعریف یوں کی ہے۔ ''قوم افراد کا ایک ایسا گروہ ہے جس میں جذبۂ قومیت پایا جائے جس کی اپنی سیاسی تنظیم ہو اور جو یا تو آزاد ہو یا آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد میں مصروف ہو۔''

ہمز کے مطابق قوم کا لفظ لاطینی زبان Natia سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی پیدائش اور نسل کے ہیں۔ یعنی قوم وہی لوگ کہلانے کے مستحق ہیں۔ جو ایک ہی مورث اعلیٰ رکھتے ہوں اور ایک ہی نسل کے باشندے ہوں اور ان کی زبان بھی ایک ہی ہو۔''

(Emest Renan) رینان کے خیال میں مشترکہ زبان اور نسل قوم بننے کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ ضروری یہ ہے کہ ان میں مشترکہ تاریخی ورثہ ہو خواہ فتح مندی اور شان و شوکت کا، خواہ تکلیفوں اور قربانیوں کا لیکن ضروری ہے کہ ان میں آپس میں مل جل کر مشترکہ زندگی گزارنے کا جذبہ موجود ہو۔''

ایم ہاسر (M.Hausser) کہتا ہے۔ ایک قوم تہذیبی اعتبار سے ہم آہنگ معاشرتی گروہ ہے۔ جو بیک وقت اپنی وحدت اور مشترکہ زندگی کا شعور رکھتا ہے۔ یہ ایک ہی علاقے کے ایسے باشندوں کا اتحاد ہے جن کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ایک حکومت کی رعایا ہوں لیکن ان میں مشترکہ مفاد کا جذبہ اتنا قدیم ہونا چاہیے کہ یقین ہو جائے کہ وہ ایک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔''

موجودہ دور میں قوم کا لفظ ایک ایسی آبادی کے لیے استعمال ہوتا ہے جو آزادانہ طور پر منظم ہو۔ جو اپنی خوشی سے ایک سیاسی دستور قبول کرے اس میں یگانگت اور وحدت پائی جاتی ہو اور مشترک زندگی، مشترک رسم ورواج کے عناصر پائے جاتے ہوں۔ قوم کے لیے یک جہتی ضروری ہے۔ جماعت گروہ مل کر ایک قوم بنتے ہیں۔ قوم میں خونی اتحاد ہو یا نہ ہو لیکن اس میں روحانی اور اخلاقی اتحاد ہونا لازمی ہے اور ضروری ہے کہ اس آبادی میں بعض اخلاقی، ثقافتی اور مذہبی قدریں موجود ہوں۔ مختصر یہ کہ قومیت کا جدید تصور انیسویں صدی میں ایک زبردست انقلابی طاقت کے طور پر رُونما ہوا اور مختلف اقوام نے اپنی انفرادیت اور آزادی کی بحالی اور خوشحالی کی جدوجہد میں اس انقلابی جذبے سے بڑا کام لیا۔ لیکن موجودہ دور میں ملک ونسب اور رنگ روپ کے امتیازات کی بنا پر قومیت کا جو محدود نظریہ قائم کیا گیا وہ وطنیت کے جغرافیائی تحدید کے مادّی تخیل سے پیدا ہوا ہے۔

اقبال نے اپنے قیام یورپ کے دوران اُن اسباب کا بھی تجزیہ کیا جو اسلامی ممالک کے زوال اور پسماندگی کا باعث بنے۔ ان حربوں میں سب سے زیادہ خطرناک حربہ وطنیت اور قومیت کا نظریہ تھا۔ ان کو احساس ہوا کہ اس تنگ محدود مادی نظریہ سے قومیت کا بحر بیکراں نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کے بجائے بہت سی چھوٹی چھوٹی نہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نتیجتاً فرد و قوم کے اختلاط و امتزاج سے جو اخلاقی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ حاصل نہیں ہوتے بلکہ اخوت، محبت، اور انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ۱۹۱۰ء میں جنگ طرابلس اور جنگ بلقان نے اس بارے میں اقبال کے نظریے کو پختہ کر دیا اور وہ بڑی شدت کے ساتھ وطنیت اور قومیت کے مغربی تصور کی مذمت کرنے لگے کیونکہ مغربی اقوام نے جغرافیائی بنیادوں پر قومیت کے نظریہ کو فروغ دے کر سارے مشرق اور خاص طور پر ملت اسلامیہ کو حصوں بخروں میں تقسیم کر دیا اور وحدت اسلام کو سراسر نقصان پہنچایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یورپ سے واپسی کے بعد علامہ اقبال نے قومیت کی بنیاد روحانیت پر رکھ کر قومیت کے محدود مادی نظریے کے بجائے ملت کا وسیع روحانی نظریہ قائم کیا۔ جس کی تشریح انھوں نے اپنی ایک گفتگو میں اس طرح کی ہے۔ ''میں سماجی اتحاد کے لیے وطن کو ایک بنیاد سمجھتا تھا۔ اس لیے خاک وطن کا ہر ذرّہ مجھے دیوتا دکھائی دیتا تھا۔ اُس وقت میرے خیالات مادیت کی طرف مائل تھے۔ سوائے وطن کے مجھے انسانوں میں اتحاد کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب میں انسانوں کو صرف ازلی اور ابدی روحانی بنیادوں پر متحد کرنا چاہتا ہوں اور جب میں اسلام کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میری مراد اس سے یہی روحانی نظام ہے۔''

ملت کا یہ روحانی نظام مذہب اسلام اور خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ مختلف قومیتوں کو مٹا کر کافر کو آذر اور مسلمان کو ابراہیم کے قریب تر کر دیتا ہے۔ اس لیے وطنیت کے محدود قومی نظریے نے ان ملتوں کو مختلف قوموں میں تقسیم کر کے جو اختلافات پیدا کر دیے ہیں وہ دور ہو جاتے ہیں اور ملکی و نسلی حسد و رقابت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اُن کے نزدیک مذہب و ملت کے روحانی اتحاد سے جو قوم پیدا ہوتی ہے وہ لازوال ہو جاتی ہے اور وہ جس طرح کسی محدود وطن کسی محدود ملک اور کسی محدود مقام کی پابند نہیں ہوتی اسی طرح اس کا زمانہ بھی غیر محدود ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

مسلمانوں کی قوم اسی قسم کی قوم ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ زندہ رہے گی اور اس کے افراد کے فنا ہونے کا اس پر کوئی اثر نہ پڑے گا کیونکہ دونوں کی موت وحیات کے اصول باہم مختلف ہیں مغربی اقوام کو مادیت نے اور اس قوم کو روحانیت نے پیدا کیا ہے۔ مذہب کے عنوان سے ایک قطعے میں علامہ اقبال نے اپنے انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اشعار لاحظہ کیجیے۔

اپنی ملت پہ قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولؐ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار — قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں		اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اقبال نے ملتِ اسلامیہ کے بنیادی عناصر ایسے دو عقائد بتائے ہیں جن کے بارے میں مسلمانوں کے کسی فرقہ یا گروہ کو کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ ان عقائد کو ہم توحید و رسالت (ختم نبوتؐ) کے نام سے جانتے ہیں۔ خالص توحید کا عقیدہ اس وقت صرف مسلمانوں کی متاع ہے کیونکہ دوسرے ادیان والوں نے چشمۂ توحید کو گدلہ کر رکھا ہے۔ مگر اس عقیدے کا لازمہ یہ ہے کہ مسلمان فکر کے ساتھ ساتھ عمل کے اعتبار سے بھی متحد ہوں اور ان کی قومی پالیسیوں میں انتشار اور پراگندی نظر نہ آئے۔

ملت اسلامیہ کا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ عقیدہ توحید کی نشر و شاعت کرتی رہے۔ انھوں نے توحید کی دیگر برکات پر بھی لکھا ہے۔ جیسے موحد غیر اللہ کے آگے سر نہیں جھکاتا وہ غم و حزن سے محفوظ رہتا ہے اور غیر معمولی قوتِ ایمان سے مالا مال ہوتا ہے۔ مثنوی رموزِ بے خودی'' کے آخر میں انھوں نے سورۂ اخلاص کی ایک بصیرت افروز تفسیر لکھی ہے۔ اس تفسیر کا مدعا یہ ہے کہ عقیدہ توحید نے مسلمانوں کو ایک متحد، مستقل اور بے نظیر ملت بنایا ہے پہلی آیت 'قل ہو اللہ احد' کی توضیح میں وہ فرماتے ہیں کہ 'تخلقو بلا اخلاق اللہ' کے مطابق مسلمان اللہ کے اخلاق اور طریقے اپنائیں اور خدائے واحد پر ایمان رکھنے کی مناسبت سے خود متحد اور متفق بنیں۔ دوسری آیت 'اللہ الصمد' کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں استغنا برتیں۔ بحیثیت فرد کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور اقوم کی حیثیت سے بھی دوسروں کے دست نگر نہ بنیں۔ تیسری آیت کریمہ 'لم یلد ولم یولد' مسلمانوں کو محدود وطنیت، ذات، رنگ و نسل، زبان اور اس قبیل کی ان تمام نسبتوں سے آزاد رہنے کا درس دیتی ہے جنھیں غیر مسلم ماہرین سیاسیات قومیت کے اجزا بتاتے ہیں فرماتے ہیں مسلمانوں کی ملت ایک عالمگیر ملت ہے۔ چوتھی آیہ مبارک 'لم یکن لہ کفواً احد' میں مسلمانوں کو ایک بے نظیر اور ممتاز قوم بننے کا اشارہ ملتا ہے کیونکہ توحید خالص کی علم بردار ملت، غیر توحیدی قوموں کی شبیہ نہیں ہوتی۔ خلاصہ یہ کہ مسلمان قوم کو متحد، بے نیاز قیود و حدود سے آزاد اور دوسری اقوام سے ممتاز ہونا چاہیے۔

ہر نبی و رسول نے ایک ملت و قوم کی تشکیل کی ہے۔ مگر آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت و نبوت کی شان ہی جُدا ہے آپ ختم نبوت اور عالمی رسالت کے حامل تھے۔ عقیدہ ختم نبوت کا لازمہ ہے کہ مسلمان متحد رہیں اور اپنے دین کی تجدید پر توجہ دیں یعنی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں زندگی کے نئے مسائل کا حل تلاش کرتے رہیں۔ اقبال نے اپنے سات انگریزی خطبات میں سے ایک خطبہ نظم اسلام کی حرکت پذیری کے لیے مخصوص کیا ہے۔ علامہ نے اس خطبے میں نظام اسلام کو مستحکم کرنے کے لیے قرآن مجید حدیث وسنت رسولؐ، اجماع و قیاس (اجتہاد) کی مدد سے تجدید دین کے اصول بتائے ہیں۔ اور رسالت سعدیہ کی مخصوص صورت (ختم نبوت) کو توحید کے بعد مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا بہت بڑا موجب قرار دیا ہے۔ اقبال عصر حاضر میں عشق رسولؐ کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ انھوں نے نبی اکرمؐ کی ذات سے حقیقی انس و وفا رکھنے کو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی پراگندگی کا مداوا بتایا ہے "جواب شکوہ" میں فرماتے ہیں۔

مثل بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا	رخت بردوش ہوائے چمنستان ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا	نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے	دہر میں اسم محمدؐ سے اُجالا کر دے

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری	میرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تیری
ماسوی اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری	تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تیری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں	یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اقبال کے نظریہ قومیت وملت میں توحید و رسالت کے عقائد کے ساتھ ساتھ کئی دیگر عقائد اور شعائر منسلک ہو کر مسلمانوں کی وحدت عمل کو مکمل بناتے ہیں۔ قرآن مجید اور حدیث مبارکہ میں مسلمانوں کی وحدت ملی کی واضح ہدایات موجود ہیں۔ مسلمان ایک دوسرے کے بھائی بھائی قرار دیے گئے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کو کسی عمارت کی اینٹوں کی شبیہ بتایا ہے۔ کہ ہر اینٹ

دوسری اینٹ کو سہارا دیتی ہے۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ میں ہجرت فرما کر نبی اکرمؐ نے مہاجرین و انصار کے درمیان جو رشتہ مواخات قائم کیا تھا وہ اس اخوت کا عملی نمونہ تھا۔ اسلام سے قبل عربوں کا انتشار ایک معلوم امر تھا۔ وہ کئی قبیلوں میں منقسم تھے مگر اسلامی تعلیمات نے ان میں مساوات اور بھائی چارہ کو فروغ دے کر ایک متحد و مضبوط قوم بنا دیا۔ حقیقی اسلامی معاشرہ وہ ہے جس میں اتحاد و اتفاق ہو۔ ملی یک جہتی ہو اور بقول اقبال اخوت، حریت، محبت اور مساوات ہو۔ اسلام کی رو سے معاشرے کا ہر چھوٹا یا بڑا قانون کے سامنے جواب دہ ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جن کی رو سے معمولی سے معمولی مظلوم کی دادرسی کی گئی اور عالی سے اعلیٰ ظالم کو سزا دی گئی۔ مسلم قومیت میں طبقاتی امتیازات اور فرقہ بندی کی قطعاً گنجائش نہیں۔ معاشرے کی تعمیر و ترقی میں تمام مسالک فکر متحد ہو کر ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں — کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت — وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو — آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد

یورپ جا کر اقبال کو احساس ہوا تھا کہ مغرب کا فلسفہ انسان کو مادیت کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس میں روحانی قدروں کا احساس سرے سے مفقود ہے اسکے مقابلے میں مشرقی فلسفہ اکثر و بیشتر بعض روحانی اقدار کا علم بردار ہے۔ لیکن ان دونوں کے مقابلے میں اسلامی فلسفہ عملی اعتبار سے سب سے زیادہ مکمل ہے۔ یہاں مادیت و روحانیت کا متوازن امتزاج ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس وقت مسلمانوں کی سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ وہ ترکی، عجمی، ایرانی اور افغانی کے سارے امتیازات مٹا کر آپس میں ایک قوم بن جائیں۔ اور تمام امت مسلمہ ایک عالمگیر برادری بن جائے جو اخوت اور محبت کی بے مثال تصویر ہو۔

اپنی نظم شمع و شاعر میں اقبال نے اس عہد کے اہم سیاسی اور معاشی مسائل کی نشان دہی کر کے مسلمان قوم کی فکری رہنمائی کی اور انھیں مستقبل کی طرف سے پُر امید رہنے کی تلقین کی اور ملت کے جسم میں قوتِ مدافعت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی۔ اور مسلمان قوم کے اندر ملی وجود کا شعور بیدار کرنے کی طرف قدم اٹھایا۔ فرماتے ہیں

فرد قائم ربطِ ملت ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا — کاروان کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

وطنیت اور قومیت کے بارے میں اقبال نے اپنا نقطۂ نظر بالکل واضح کر دیا تھا کہ ملت اسلامیہ کی طاقت کسی قوم سے نہیں بلکہ توحید اور وحدت ملت سے ہے۔ اسلامی اتحاد بجائے خود ایک سیاسی وحدت ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

"نئے سکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چھیتڑا ہے۔ قومیت کے اصول حقہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں جن کی پختگی اور پائیداری ایام و اعصاد سے متاثر نہیں ہو سکتی۔"

اسلام اور مسلمان کسی ملک و سرزمین پر انحصار نہیں کر سکتے۔ ملت اسلامیہ اپنے ایمان، عقیدے اور نظام حیات کی وجہ سے زمان و مکاں کی حدود و قیود سے آزاد ہے۔ اسی لیے ملکی حدود کی تبدیلی، سیاسی عروج و زوال اور فتح و شکست سے اس طرح متاثر نہیں ہوتی۔ جس طرح ملک و نسب پر انحصار رکھنے والی قومیں ہوتی ہیں۔ نسل پرستی، وطنیت اور انتشار یہ وہ امراض ہیں جن سے کوئی قوم فلاح نہیں پا سکتی چنانچہ اقبال بار بار تلقین کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان امراض سے محفوظ رہنا چاہیے۔ اگر وہ ان امراض سے محفوظ رہے تو اسی میں ان کی فلاح ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اُن کے خیالات کی واضح ترجمانی کرتے ہیں۔

امت مسلم ز آیات خدا است — اصلش از ہنگامۂ قالو بلیٰ است

درجہاں بانگِ اذاں بود است و ہست — ملت اسلامیاں بود است و ہست

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود　　اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے　　نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے　　کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیازِ عقبیٰ

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

آج یورپ کی جدید قومتیں جو سب کی سب انسانی آزادی وحقوق کی حفاظت کے نام پر گلے پھاڑ پھاڑ کر چیخا کرتی ہیں۔ مگر وہ خود انسانیت کے تمام اصول فراموش کر کے صرف اس لیے شور و غوغا مچاتی رہتی ہیں کہ ان کے گھناؤنے خدوخال دنیا کو نظر نہ آنے پائیں اور وہ طاقت کے محسوس وغیر محسوس مرکزوں کو اپنے قبضہ و اختیار میں قائم رکھ سکیں اور آدمیت کے تمام اصول و حقوق کے حقدار صرف اپنے آپ ہی کو باور کرا سکیں۔ درحقیقت انسانی خون سے ہولی کھیلی جارہی ہے اور دنیا کو تیسری عالمگیر جنگ کی طرف تیزی سے دھکیلا جارہا ہے۔ اقبال کی مشہور پیش گوئی:

"تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی"

کے پورا ہونے کا وقت آرہا ہے۔ قرآن کریم نے قومیت و وطنیت کی مختلف گروہ بندیوں کو تفرقہ اندازی و تفریق انسانیت کہا ہے۔ دراصل اسلام کا عقیدۂ توحید ہی انسانیت کی تشکیل کرتا ہے۔ جس سے اجتماعیت کے تمام تنگ دائرے سمٹ کر ایک بڑے دائرے میں آجاتے ہیں۔ اگر دنیا چاہے تو اس حلقے میں آکر انسانیت کی سرحد میں داخل ہو سکتی ہے اسلام کی حدود میں داخل ہوتے ہی سب انسانوں کا منصب ایک ہو جاتا ہے۔ رنگ و نسل، تمدن و معاشرت اور اختلافِ زبان کی کوئی مغائرت ان سب کے دلوں کو ایک بنانے سے نہیں روک سکتی۔ زمانے کے انقلابات اور حوادث کے زیرِ اثر ملکوں کے جغرافیائی حدود بدلتے رہتے ہیں۔ متمدن سے متمدن ممالک کا شیرازہ وقت کی کروٹوں سے بکھر جاتا ہے۔ اور صدیوں کے بعد صرف ان کے کھنڈر اور آثار ہی باقی

رہ جاتے ہیں اس لیے جس قوم کی بنیاد کسی مخصوص خطۂ زمین میں گڑی ہوئی ہو اس کی قومیت پائیدار نہیں رہ سکتی وہ بہت جلد تغیر وقت کے ساتھ مٹ جانیوالی ہے لیکن یہ خصوصیت صرف ملت اسلامیہ ہی کا حصہ ہے کہ وہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ نہ کوئی انقلاب اسے مٹا سکتا ہے نہ کوئی تباہ کاری اس کی سرحدوں میں داخل ہو سکتی ہے وہ دنیا سے وابستہ نہیں بلکہ دنیا اس سے وابستہ ہے۔ اس کا وطن ہند و روم و شام و یونان نہیں جو فنا ہو سکتے ہیں بلکہ اس کا ملجٰی و ماویٰ اور مسکن وطن اسلام ہے۔ جو ہمیشہ رہے گا۔

اقبال کا اپنے وقت کی موجود مسلمان ریاستوں کے پیش نظر خیال تھا کہ مغربی اقوام کی استعماریت اور جارحیت سے تدارک کی محض ایک صورت ہو سکتی ہے کہ اقوام مشرق کا آپس میں اتحاد ہو اور جس کا مرکز تہران ہو۔

تہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

اقبال کے خیال میں مسلمانوں کے ایک مرکز کا وجود اس لیے ناگزیر ہے کہ اس سے اجتماعی وحدت برقرار رہتی ہے۔ اور تمدن میں یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ مرکز اساسی طور پر مذہبی اور تمدنی ہے۔ سیاسی نہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر گزشتہ زمانے کے مسلمان مدبرین قرآن حکیم پر تدبر کرتے تو اسلامی دنیا میں جمعیت اقوام کے بنے ہوئے آج صدیوں گزر گئی ہوتیں۔ ایک مکتوب میں انھوں نے اسی قسم کی توقعات کا اظہار کیا تھا۔

"مغربی اور وسطی ایشیا کی مسلمان قومیں اگر متحد ہو گئیں تو بچ جائیں گی اور اگر ان کے اختلافات کا تصفیہ نہ ہو سکا تو اللہ حافظ ہے۔ مضامین اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔ میرا مذہبی عقیدہ یہی ہے کہ اتحاد ہو گا اور دنیا پھر ایک دفعہ جلال اسلامی کا نظارہ دیکھے گی۔"

موجودہ زمانہ عالم اسلام کے لیے نہایت ابتلا و انتشار کا حامل ہے کیونکہ ابلیس زادے حرمت کعبہ کو بھی پامال کرنے کی ناپاک سازشیں کر رہے ہیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ مرکز توحید کو بچانے کے لیے مسلمان متحد و متفق ہو کر دشمن سے برسر پیکار ہوں۔ اور قوم کا ایک ایک فرد ہر

قسم کے گروہی، مسلکی، لسانی، علاقائی اور جغرافیائی اختلافات کو بھلا کر تحفظ دین وملت کے لیے سرگرم عمل ہو۔ کیونکہ بقول اقبال

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو ملک وملت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر

کتابیات

۱۔ نظری سیاسیات از شاہ فرید الحق ص۔۱۷۵

۲۔ اقبال از مجنوں گورکھ پوری۔ ص۵۲۔۵۳

۳۔ رسالہ اُردو اقبال نمبر ۱۹۳۹

۴۔ اقبال نامہ ص ۲۰۴۔۱۶۳

۵۔ ترجمہ خطبات ص ۲۴۶

۶۔ اقبال بنام خان محمد نیاز الدین ص ۹

۷۔ بحوالہ ڈاکٹر قاضی عبدالحمید۔ مشمولہ مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۱۹۰

۸۔ ضرب کلیم ص ۷۵۔۷۶

۹۔ افاداتِ اقبال ۔ ڈاکٹر محمد ریاض

۱۰۔ اقبال اور جدید دنیائے اسلام۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل

۱۱۔ تصورات اقبال ۔ از شاغل فخری

۱۲۔ تجدید فکریات اسلام۔ ترجمہ ڈاکٹر وحید عشرت۔ نظر ثانی ڈاکٹر عبدالخالق

۱۳۔ کلیات اقبال

مترجم: محمد طارق علی

ڈاکٹر کوثر طلعت (امریکہ)

ڈاکٹر محمد اقبال۔ عہد آئندہ کا فلسفی

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کو بیسویں صدی کا سب سے مؤثر اور بااثر شاعر اور سکالر سمجھا جاتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی انقلابی شاعری اور سینے میں دہکتی یہ خواہش کہ وہ اپنے عقیدہ و ایقان کی سلامتی کے ساتھ جدید دنیا میں داخل ہوں۔ اس زمانے میں ایسے بہت سے سکالر موجود تھے جو اسلامی تعلیمات کو جوں کا توں اپنی جگہ برقرار رکھنے کو بہتر خیال کرتے تھے۔ لیکن یہ ڈاکٹر اقبال ہی تھے کہ جنھوں نے مسلم قوم کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جدید دنیا کو اپنانے کا راستہ بتایا۔ نتیجتاً اقبال کو کٹر ملاؤں کے غیض کا نشانہ بننا پڑا۔ انھیں ''کافر'' قرار دیا گیا اس بنیاد پر کہ وہ اپنی شاعری اور فلسفے کے ذریعے اسلام کو دنیائے جدید کا حصہ بنانا یا جدت کو اسلام میں داخل کرنا چاہتے تھے۔

اگرچہ اقبال کا تعلق بیسویں صدی کے زمانے سے تھا لیکن درحقیقت وہ اپنے وقت سے بہت آگے تھے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ نہ صرف اُس وقت کے بڑے بڑے فلسفہ دان قوم کے نام علامہ اقبال کے پیغام کو سمجھ نہ سکے بلکہ خود اکثر مسلمان بھی شاعری میں موجود ان کے پیغام کی اصل روح کو پا نہ سکے اس لیے کہ وہ اسے اپنی فہم میں لانے ہی سے قاصر تھے۔ یعنی اقبال کے پیغام کے جو اصل مخاطب تھے، وہی اُس کے پیغام کے معنی و مفہوم تک پہنچنے میں بُری طرح ناکام رہے چنانچہ وہ اقبال کے فلسفے کی روح یعنی عقل و دانش کی مشعل کو فروزاں نہ کر سکے۔

دراصل اسلام اور اقبال ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔ اقبال کا تعلق ایک ''عملی مسلمان'' سے ہے۔ اقبال کو سمجھنے کے لیے پہلے دنیا کی تاریخ کو پڑھنا اور دنیا کو جدید بنانے کے عمل میں اسلام کے کردار کو بہ نظر غور دیکھنا ازبس ضروری ہے۔ برصغیر میں جب اقبال نے شعور کی آنکھ کھولی تو

عین اسی زمانے میں مسلمانوں کی اہم ترین مرکزی سیاسی قوت، سلطنتِ عثمانیہ اپنی ہزار سالہ حکومت سے ہاتھ دھو کر رُو بہ زوال تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ اُس وقت دنیا بھر میں زبوں حال مسلمان بہ حیثیت امۂ انتشار، ذہنی تنزل اور جمود کا شکار تھے۔ بین الاقوامی سیاسی منظر اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا کہ مسلمان دانش وروں کے دماغ چکرا کر رہ گئے تھے۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں مسلمانوں کا حال اور بھی ناگفتہ بہ تھا یہاں وہ قطعاً یکا و تنہا تھے جب کہ مغربی دنیا سائنس اور انجینئرنگ میں کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کر رہی تھی اور البرٹ آئن سٹائن کے دریافت کردہ ''نظریۂ اضافیت'' پر جشن منا رہی تھی۔ دراصل یہی وہ جدیدیت تھی جو اقبال کے پیش کردہ فلسفہ کی روح تھی، وہ یہی بتانا چاہ رہے تھے کہ خدا اپنی تخلیق یعنی بندے سے کیسا تعلق چاہتا ہے۔ وہ اسے کتنا توانا دیکھنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر این میری شمل (۱۹۸۹ء) کا بھی یہی کہنا ہے کہ آئن سٹائن کے پیش کردہ نظریئے سے ''خدا اور کائنات'' کے رشتے کے بارے میں اقبال کے خیالات کی پوری تصدیق ہوتی ہے اقبال کا یہ کہنا تھا کہ یہ کائنات لامحدود بھی ہے اور ناتمام بھی ''کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون'' ڈاکٹر این میری شمل نے اقبال کے خیال کی تائید کرتے ہوئے مزید کہا کہ یوروپین فلسفہ اور علیت کی وضاحت اقبال نے اپنی شاعری میں کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مسلمانوں کے ایمان اور ثقافت کو کوئی خطرہ نہیں بلکہ انھوں نے ہندی مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ علمِ تازہ اور نئے خیالات خود اُن کی اپنی کھوئی ہوئی میراث ہے جو ماضی کے مسلم علما اور سائنس دان چھوڑ گئے تھے۔ اقبال کے خیال کی اگر اسی نہج پر مزید تشریح کی جائے تو یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی کہ یوروپین اور مغربی تہذیب مسلمانوں کے شاندار ماضی کی از سرِ نو تجدید ہے۔ سو یہ مسلمانوں کے لیے خطرہ نہیں بلکہ اس میں ان کے لیے اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ اسلام کو بہتر انداز میں سمجھنے کا ایک خاص تحرّک بھی موجود ہے۔

اقبال نے قدیم ادوار کے دانش وروں مثلاً ارسطو اور دیگر یونانی فلاسفروں اور ان کے فلسفیانہ نظریات پر تنقید کی ہے کیونکہ اقبال کے خیال میں یہ نظریات انسان کی خودی کے لیے زہر کا

حکم رکھتے تھے اور اسلامی افکار کے لیے ضرر رساں بھی۔ اقبال جرمن شاعر دانتے کے بہت مداح تھے۔ امن اور انسانیت نواز محبت کے بارے میں دانتے کے خیالات اقبال کو پسند تھے اس لیے کہ وہ اسلامی فکر سے ملتے جلتے تھے۔ اقبال ایک اور جرمن فلاسفر گوئٹے کے فلسفیانہ نظریات کے قریب تھے۔ اُن کے فکر نے جیسے جیسے ترقی کی وہ گوئٹے کے اور زیادہ قدر دان ہوتے گئے کیوں کہ وہ انسان کی جذباتیت اور اس کی نفسیاتی خواہشات پر کنٹرول رکھنے کے بارے میں اپنے خیالات کی گوئٹے کی سوچ سے بہت مطابقت پاتے تھے۔

اقبال بنیادی طور پر ایک تغیر پسند فلسفی تھے۔ وہ ایک باہمت، راست باز مفکر ہونے کے علاوہ ایک معتبر اور کھلا ذہن رکھتے تھے۔ وہ مغربی مفکروں میں ایک معروف جرمن فلاسفر اور مصنف فریڈرک نطشے سے بھی متاثر ہوئے۔ یہ فلسفی لامذہب ضرور تھا لیکن وہ مابعد جدیدیت کا خالق تھا۔ اقبال نے اپنی کتاب ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں نطشے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ''اُس کا ذہن کافر اور دل مسلمان ہے'' (صفحہ ۸۹، ۱۹۹۶ء) نطشے کا خدا کے وجود سے انکار مسلمہ ہے اور اس کی یہ بات اقبال کے غیر متزلزل ایمان سے متصادم ہے۔ اغلباً نطشے کے خیالات اور نظریات اور ان کی مطابقت اسلامی تعلیمات سے قریب تھی۔ تاہم اقبال پر نطشے کے اثرات محدود تھے وہ بھی بہ طور شاعر محض چند خیالات کی حد تک جیسے نطشے کا ''سپر مین'' لیکن اس کے ملحدانہ خیالات سے اقبال کوسوں دور تھے۔ نطشے کے ''سپر مین'' والے نظریئے کو مابعد جدیدیت کے دور کا آغاز اور ''آدمی'' والے زمانے کا اختتام سمجھا جاتا ہے۔ ایسی ہی بات اقبال کے ہاں ''مرد مومن'' (انسان کامل) والے نظریئے کی ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اقبال نے یہ نظریہ رومیؒ ایسے مسلم مفکر کے' جو اُن کے روحانی مرشد تھے' خیالات سے متاثر ہو کر اختیار کیا ہو۔

ایک اور جرمن فلاسفر برگساں کا پیش کردہ ''تخلیقی ارتقا'' کا نظریہ بھی ہے۔ اس سلسلے میں اُس کا کہنا ہے کہ صرف ادراک یا الہام کے ذریعے ہی ''تخلیقی ارتقا'' کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے لیکن جب ''الہام'' ارتقا کے دورانیے اور حقیقت کو پا لے تو اُسے لکھے یا کہے گئے الفاظ کے ذریعے

دوسروں تک منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ سو برگساں کے اس قول نے کہ صرف ذاتی ادراک ہی حقیقت کو پا سکتا ہے، اقبال کو متاثر کیا۔ گو اقبال کا نظریۂ الہام اپنے معانی کے اعتبار سے برگساں کے نظریہ سے ملتا جلتا ہے۔ تاہم وہ 'الہام' کو عقلیت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اقبال اس کائنات کو 'تخلیق' سمجھتے ہیں جو ارتقائی تبدیلیوں کے ذریعے وجود میں آئی ہے۔ اور یہ 'تبدیلیاں' ہی خالق کی زبردست قوتوں کی عمدہ مثالیں ہیں۔ سو، اب کہنے کی بات یہ ہے کہ اقبال ہر اُس فلسفی کے ہم خیال نظر آتے ہیں جس کے خیالات خود ان کے اپنے یقین اور اعتقاد سے ملتے جلتے ہوں۔

انسانیت کے لیے اقبال کی نصیحت کیا ہے، اس کی تشریح ایران کے ڈاکٹر شریعتی (۱۹۹۱ء) کچھ اس طرح کرتے ہیں "حضرت عیسیٰ کا سا دل رکھو، سقراط کے سے خیالات اور ہاتھ جولیس سیزر کے سے ہوں، لیکن یہ سب خوبیاں ایک ہی انسان میں ہونی چاہئیں یعنی پوری انسانیت کی واحد تخلیق، ایک روح رکھنے والا جو صرف ایک مقصد کو حاصل کرے۔" ایسا شخص خود اقبال ہی ہو سکتا ہے جو اُن تمام بہترین خیالات اور نظریات کو یکجا کر دے جو انسان اپنے تخیل کے ذریعے پیدا کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر شریعتی کہتے ہیں کہ اقبال نے قرآن کے پیغام کو سمجھا پھر انھوں نے گوئٹے اور رومیؒ کے تفکر کے اثرات کے تحت ایک "متحرک اسلام" کی تشریح پیش کی۔ اقبال ہمیشہ اس خیال کے حامی رہے کہ انسان کا فرض ہے کہ وہ خالق کی بنائی ہوئی اس کائنات میں اُسی کی رضا و معاونت کے ساتھ بہتری پیدا کرے، اس لیے کہ ہمہ دم بدلتے ہوئے حالات میں خود کو برقرار رکھنے کے لیے انسان کو قرآن کے بتائے ہوئے تمام لازوال امکانات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اقبال آدمی کی ذاتی سمجھ بوجھ پر زیادہ بھروسے کے قائل نہیں تھے بلکہ مغرب کی جدید ٹیکنالوجی اور اچھے ترقیاتی معیار کا اعتراف کرتے ہوئے یہ چاہتے تھے کہ مسلمان بھی ان کاموں میں بیش از بیش حصہ لیں۔ اپنی شہرہ آفاق نظم "پیام مشرق" میں ان کا پیغام یہ ہے کہ ناقدانہ تجزیے اور عشق کے امتزاج کے ساتھ بہتر اقدار پیدا کی جا سکتی ہیں۔ سو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اقبال ایک ایسے تغیر پسند فلسفی ہیں جو بے عملی سے قطعی دور ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ "عمل اور حرکت" سے کام لیتے ہوئے انسان اُٹھیں اور اس دنیا کو بدل کر رکھ دیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال کو پوری مسلم دنیا میں بیسویں صدی کا ایک بہت مؤثر شاعر اور مفکر سمجھا گیا۔ برصغیر میں اُن کا گہرا اثر تھا۔ ان کے احیاء سے اسلام کے نظریئے کی بدولت نہ صرف ''پاکستان'' کی تخلیق ممکن ہوئی بلکہ آنے والے برسوں میں اُن کی شاعری اور فلسفے نے ''ایرانی انقلاب'' کو بھی تقویت بخشی۔

افکار و خیالات ہی کی بدولت سوویت روس ٹوٹ کر جمہوریت کے زیر اثر آیا خصوصاً وہ علاقے کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اقبال ایک ایسے شاعر اور فلسفی تھے کہ جنھوں نے اپنے لوگوں سے مسلسل مکالمہ رکھا۔ ان کے فلسفے کا ایک بنیادی حصہ یہ تھا کہ ''مسلم خودی'' کو دوبارہ زندہ کر کے مغرب کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کو روکا جائے۔ اس پیغام کو صفحۂ قرطاس پر لانے سے پہلے اقبال نے اسلام کی اصل روح کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یورپ اور مغرب کے بارے میں اقبال کے عمومی خیالات محض ان کے ابطال پر مبنی نہیں تھے۔ اقبال کے نزدیک مسئلہ یہ نہیں تھا کہ مغرب کے مقابلے میں مشرق کو چُن لیا جائے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ ان دونوں کے درمیان رہتے ہوئے ایک ایسا درمیانی مقام تلاش کیا جائے کہ جہاں فرد اپنی اصل شناخت کو تج کر دنیائے جدید کا ہو کر نہ رہ جائے۔ اقبال کے فلسفے کا گہرا تجزیہ یہ بتلاتا ہے کہ وہ دراصل یہ چاہتے تھے کہ مشرق و مغرب کے ملتے جلتے خیالات کو اس طرح باہم مربوط کر کے فروغ دیا جائے کہ پھر دونوں جانب کے نظریات سے ایسی بنیادی اقدار تشکیل پائیں کہ جن کی بدولت ایک بہتر دنیا وجود میں آئے۔ اقبال کے نزدیک فرد کے مستقبل کا انحصار محض مغربی علوم حاصل کرنے میں نہیں بلکہ اس میں ہے کہ وہ اپنے حاصل کردہ علم کو اسلامی ایقان و روایت کے ساتھ متوازن کرے۔

معروف جرمن مستشرق اور سکالر ڈاکٹر این میری شمل (۱۹۸۹ء) نے نطشے کا ''سپر مین'' والا نظریہ اپنانے پر اقبال کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ اس سے اقبال کے فلسفۂ خودی کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ ڈاکٹر اقبال کی اس بات سے بھی متفق ہیں کہ انا یا خودی کو شریعت کی متناسب حدود کے اندر رکھا جائے۔ یہی وہ فرق ہے جو اقبال کے ''مردِ کامل'' کو نطشے کے ''سپر مین'' سے الگ کرتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال پر تنقید کی گئی ہے کہ وہ اپنے افکار کے ذریعے مغرب کے ثقافتی اثرات کو کھل کر رد کرتے ہیں اور یہ بھی کہ جب وہ شعائرِ اسلامی پر صحیح عمل کے لیے اپنی شاعری میں وضاحتیں پیش کرتے ہیں تو بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ یہ سب ناقابل عمل ہے اور یہ بھی کہ وہ خواہ مخواہ دوسرے معاشروں اور ان کے ثقافتی ورثوں کو نشانہ بناتے ہیں لیکن برہمنوں کے بنائے ہوئے ذات پات والے سسٹم کے تحت پسے ہوئے، ستم رسیدہ اور مسلسل امتیازی سلوک کے شکار لوگوں کے لیے انھوں نے کھل کر آواز اٹھائی اور اپنا نظریہ خودی پیش کیا۔ اس سے انھیں نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلم طبقوں میں بھی مقبولیت ملی۔ تاہم معروف مغربی سکالر نیپال اور دیگر ہندی قوم پرستوں نے ڈاکٹر اقبال پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ وہ مسلمانوں اور ہندوستان کی دیگر مذہبی قومیتوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دیتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ ہندوستان کی جو تقسیم ہوئی وہ بھی ڈاکٹر اقبال کی پھیلائی ہوئی نفرتوں کا نتیجہ ہے۔ لیکن بات اس سے بھی آگے چلی۔ پاکستان کے ٹوٹنے پر بھارت کے ہندو قوم پرستوں نے خوب بغلیں بجائیں اور کہا کہ ثابت یہ ہوا کہ اقبال کا پیش کردہ دو قومی نظریہ بالکل غلط تھا بلکہ احمقانہ خواب تھا لیکن ناقدین یہ حقیقت بھول گئے کہ بنگلہ دیش نے بھارت میں مدغم ہونے کی بجائے ایک آزاد مسلم ملک کے طور پر رہنا پسند کیا۔ اب بھارت کو برِ صغیر کے خطے میں دو آزاد مسلم ممالک کا سامنا کرنا ہے۔ اور یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اقبال پر ہندوؤں کی متعصبانہ تنقید کے باوجود شاعرِ مشرق کو پاکستان ایران اور مشرقِ وسطیٰ کے علاوہ جرمنی میں بھی پڑھا اور سمجھا جا رہا ہے۔ انھیں ایک ایسے مصلح کے طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جنھوں نے اپنے ایقان و اعتقاد کو قائم رکھتے ہوئے مشرق اور مغرب کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔
اقبال مغرب کی جدید فنی اور صنعتی ترقی کو پسند کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے اسلامی فلسفے کے تحت سائنسی ترقی حاصل کی جائے، مغرب سے ایک خاص ہم آہنگی کے ذریعے اعلیٰ ترین ذہنی سطح سے باہمی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے۔ یوں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی نظر اپنے زمانہ حال ہی پر نہیں بلکہ وہ آنے والے وقت اور اس کے تقاضوں کو بھی بخوبی دیکھ رہے تھے۔

محمد طارق غازی۔ کینیڈا

صلح حدیبیہ کا عمرانی رُخ

(انصار مدینہ کی تاریخ پر غیر مطبوعہ کتاب کا ایک باب)

غزوہ اُحد مشرکین مکہ کے لیے درحقیقت بیداری کا گجر تھا اس دن وہ جان گئے تھے کہ میدان جنگ میں مسلمانوں کو شکست دینا ان کے بس کی بات نہیں تھی اس واقعہ کے بعد اگر حیی ابن اخطب اور اس کے وہم آفریدہ گروہ نے انہیں رنگین خواب نہ دکھائے ہوتے تو مشرکین دوبارہ مدینہ پر فوج کشی کی ہمت نہ کرتے مگر پھر گیارہ ہزار فوج کی ایک مہیب یورش کا جو تباہ کن نتیجہ نکلا وہ قریشی مشرکین اور حیی گروہ کے وہم و گمان تک میں نہ تھا جنگ احزاب میں اتحادیوں کی صفیں ٹوٹیں تو ہر رنگ کے کافروں میں صف ماتم بچھی جس رات میں گرجتے بادل، کڑکتی بجلی اور چنگھاڑتی آندھی اتحادیوں کو حواس باختہ کر رہی تھی، چند قدم کے فاصلہ پر بادِ صبا کے نرم اور فرحت بخش جھونکوں اور خاموش فضا میں حضرت سلیمانؓ ابن صرد کی روایت کے مطابق پر سکون رسولؐ اللہ اپنے جان نثار اصحاب سے فرما رہے تھے کہ ''اب ہم ان پر پیش قدمی کریں گے آئندہ وہ ہم پر کبھی یورش کر کے نہیں آسکیں گے''(۱)

تاریخ نے اس معجزاتی بیان کی تصدیق کی

اس جنگ کے ایک سال بعد ذی قعدہ ۶ ھ/ مارچ ۶۲۸ء میں رسولؐ اللہ تقریباً ۱۴۰۰ مسلمانوں کے ساتھ مکہ کے لیے روانہ ہوئے عرب روایت کے مطابق یہ اصحاب کمر سے تلواریں ضرور باندھے ہوئے تھے مگر ان کے ارادے جارحانہ نہیں تھے اور نہ رسولؐ اللہ کی طرف سے انہیں جارحیت کی اجازت تھی یہ ایک پر امن قافلہ تھا ویسے بھی رسولؐ اللہ کو خونریزی سے طبعاً کراہت تھی آپؐ غیر ضروری خونریزی کو رخِ انسانیت پر داغ تصور کرتے تھے اسی لیے ایسی کسی بھی کاروائی سے اجتناب

کرتے تھے جس میں انسان کا لہو بہنے لگے سوائے اس کے کہ جاہلیت کے شکار انسان خود ہی ایسے تکلیف دہ حالات پیدا کردیں جس میں مقابلہ کی مجبوری آن پڑے ذاتی طور پر آپؐ نے کسی ایک بھی انسان کی گردن تن سے جدا نہیں کی اور اپنے ایک بھی ذاتی دشمن سے انتقام نہیں لیا۔

انسان کے اکرام کا اعتراف

رسولؐ اللہ اگر چہ ایک بہت بڑی جمعیتہ لے کر مکہ کے لیے روانہ ہوئے تھے مگر آپؐ کا مقصد مشرکین کی چھ سالہ یورشوں سے بالکل مختلف تھا آپؐ کے ذہن میں تو اپنے دشمنوں کی تذلیل وتحقیر تک کا خیال نہ تھا آپؐ سے بہتر کون جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں انسان کے بارے میں دو اعلانات کئے تھے ایک یہ کہ ''ہم نے انسان کو بہت خوب صورت سانچہ میں ڈھالا ہے''، اور دوسرا یہ کہ ''ہم نے آدمؑ کی اولاد کو عزت دی ہے'' جس نبیؐ پر یہ اعلانات نازل ہوئے تھے ان کے نزدیک کافر ومشرک بھی بطور انسان تو مکرم تھا اگر چہ اس کا عمل اور بداعتقادی اسے عزت ومکرمت کے اس مقام سے گرا رہی تھی یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اللہ کی نظر میں مشرک نہیں اس کا شرک ناپسندیدہ اور قابل ملامت تھا اسی بنیاد پر آپؐ علی العموم کسی کو بھی انسانوں کی توہین کی اجازت نہیں دیتے تھے۔(۲)

رسولؐ اللہ کو معلوم تھا کہ حجاز میں آسانی سے امن قائم نہیں ہوا تھا اہل مدینہ پر مشرکین مکہ کی چھ سال کی لگاتار مگر بے فائدہ یورشوں اور مستقل حالت جنگ کے خاتمہ کے بعد اہل ایمان کے لیے بارگاہ الٰہی میں نذرانہ شکر پیش کرنے کا موقعہ آیا تھا اور اس نذر گزاری کے لیے مکہ کے اس گھر سے بہتر کونسا مقام تھا جسے مسلمانوں کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا اور جو اللہ کی زمین پر سب سے مقدس مقام تھا، اگر چہ معبودانِ باطل سے اس کی حرمت متاثر تھی یہ مقدس سفر رسولؐ اللہ کے اس بیان کی عملی صورت تھا کہ ''اب ہم ان پر پیش قدمی کریں گے'' اس سفر کے ذریعہ اہل ایمان وامن کو یہ بھی بتانا تھا کہ امن کی فوجوں اور حرب کی فوجوں کی پیش قدمی میں کیا فرق ہوتا ہے مسلمان برائی اور خامکاری، نخوت اور غرور، نفرت اور عدم برداشت، جنگ اور خونریزی کی طاقتوں کے لیے امن وسلامتی کا پیام لے کر مکہ کی سمت رواں تھے

امن اور جنگ کا فرق

البتہ جنگ چھیڑنے کے مقابلے میں امن قائم کرنا زیادہ مشکل کام ہے جنگ کے لیے احساس کمتری کے مارے ہوئے ایک معاشرہ میں محض ایک جنونی انانیت پسند آدمی کا ہونا کافی ہے جو طیش میں آئے ہوئے اپنے معاشرتی گروہ کے اتفاقی مفادات کی خاطر خود اپنی قوم کی تمام عقلوں کو خون کے دریا میں غرق کر ڈالتا ہے امن کے لیے پاک باز انسانوں کی شرط ہے جو تکبر اور احساس کمتری کی نفسیاتی بیماریوں کا شکار نہ ہوں اور صحت مند معاشرہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہوں ایسے آدمی کم ہوتے ہیں اور حصول مقصد کے لیے ان کو انتھک محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی بزرگی، برگزیدگی اور کرامت کو قرآن حکیم میں نمونہ بنایا گیا ہے۔

رسول اللہ کی قیادت میں امن کا یہ جلوس ابھی نواح مکہ سے کچھ دوری پر تھا کہ مکہ کے گلی کوچوں میں اس قافلہ کی خبر گونجنے لگی مشرکین کے سردار مضطرب ہو گئے سال بھر سے یہی خوف ان کی راتوں کی نیندیں حرام کئے ہوئے تھا انہیں ایسی صورت حال کا ڈر تو تھا مگر ان میں سے کسی کے پاس اس سے نپٹنے کا کوئی خیال تھا نہ منصوبہ۔ خبر ملنے کے بعد اپنے حواس کو مجتمع کرنے میں انہیں کچھ وقت لگا۔

تعطل کا توڑ معاہدۂ امن

ان کے برخلاف رسول اللہ خود اعتمادی کا پہاڑ تھے اہل ایمان کا قافلۂ امن مکہ سے کچھ فاصلہ پر عسفان میں خیمہ زن تھا جب قریش کا پہلا سفیر بشر ابن سفیان کعبی رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اس کے بعد لگاتار چار دیگر سفراء بات چیت کے لیے آئے یہ رویہ دلیل تھا کہ اہل مکہ جنگ و جدال سے تھک چکے تھے اور اس خوف کے باوجود کہ مسلمان فوج شہر کا محاصرہ بھی کر سکتی تھی اور اعلان جنگ بھی قریش دل سے چاہتے تھے کہ ایسی صورت پیدا نہ ہو تاہم جنگ کے ڈر کی بناء پر مسلم قافلہ کے عزائم اور حربی استعدد کا اندازہ کرنے کے لیے انہوں نے مکرز ابن حفص کی سالاری میں ۵۰ سواروں کا ایک رسالہ بھیجا اس سے پہلے کہ یہ رسالہ مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچا سکے مسلم

نگراں حضرت محمدؓ ابن مسلمہ کے دستے نے اس کو گرفتار کے حفاظتی تحویل میں لے لیا مگر تھوڑی ہی دیر میں رسولؐ اللہ کے حکم پر ان سب کو کوئی بھی گزند پہنچائے بغیر رہا کر دیا گیا اس پر مشرکین کو سخت تعجب بھی ہوا۔(۳)

قریشی سفیر بات کو کسی بھی نہج پر آگے نہ بڑھا سکے رسولؐ اللہ کا ارادہ عمرہ کرنے کا تھا اس لیے مذاکرات بھی ہو رہے تھے اس کے علاوہ دوسرا معاملہ جنگ کا تھا وہ ارادہ ہوتا تو رسولؐ اللہ بات چیت میں وقت کیوں صرف کرتے سیدھا حملہ کیا جاتا اضطراب میں مبتلا قریش یہ بات بھی نہ سمجھ سکے نہ ان کے قریشی اور غیر قریشی سفیروں کو اس کا احساس ہوا جب کوئی قوم تخریب کو نصب العین بنالے اور نفرت کو پالیسی تو وہ کبھی درست نتائج پر نہیں پہنچتی اور بالآخر اپنی تباہی کا باعث بن جاتی ہے خاص طور سے جب مخالف طاقت بھی منفی نقطۂ نظر رکھتی ہو مگر قریش کے مدمقابل دنیا کی سب سے بڑی رجائی شخصیت تھی جب قریش کے سفراء آپ کے مقصد سفر کو سمجھنے یا قریشی قیادت کو سمجھانے میں ناکام ہو گئے تو رسولؐ اللہ نے اپنا سفیر بھیجنے کا انتظام کیا آپؐ نے پہلے حضرت خراشؓ ابن امیہ کو اپنے اونٹ ثعلب پر سوار کر کے بھیجا مگر مکرمہ ابن عمرو ابن ہشام نے اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور خود حضرت خراشؓ کے قتل کا بھی ارادہ کیا مگر لوگوں نے اُسے باز رکھا اس کے بعد امن مذاکرات کے لیے حضرت عمرؓ کی تجویز پر آپؐ کی نگاہ نے حضرت عثمان غنیؓ جیسے ذہین و متین شخص کا انتخاب کیا۔

حضرت عثمانؓ ابن عفان (ابن ابوالعاص ابن امیہ ابن عبد شمس ابن عبد مناف ابن قصیٰ) قریش میں ایک ذی عزت قبیلہ کے ذی عزت فرد تھے مکہ میں ان کا قبیلہ بہت بڑا تھا جس کے بیشتر افراد نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا اس اثنا میں دس دیگر مسلمان بھی رسولؐ اللہ کی اجازت سے مکہ میں داخل ہو گئے ان میں حضرت کرزؓ ابن جابر فہری، حضرت عبااللہ ابن سہیل ابن عمرو، حضرت عبداللہؓ ابن حذافہ سہمی، حضرت ابوالرردمؓ ابن عمیر ابن عمرو، حضرت عمیرؓ ابن وہب جمحی، حضرت حاطبؓ ابن ابی بلتعہ، حضرت عبداللہؓ ابن امیہ اور حضرت ابن زنیمؓ کی شہادت سے جو فضا بنی اس میں حدیبیہ کے مقام پر مسلم خیمہ گاہ میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ حضرت عثمانؓ ہی کو مکہ میں شہید کر دیا گیا (۴)

ببول تلے بیعت رضوان

اس افواہ کی راست تصدیق کا امکان نہیں تھا بلکہ اندیشہ تھا کہ تصدیق کے لیے جانے والے سفیر کو بھی شہید نہ کر دیا جائے، چنانچہ رسولؐ اللہ نے ببول کے ایک درخت کی نیچے صحابہؓ سے بیعت لی کہ اگر واقعی حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے تو مسلمان فوجی کاروائی کریں گے۔ حضرت ابوسنان اسدیؓ نے سب سے پہلے بیعت کی انصار میں سبقت کرنے والے حضرت سلمہ ابن اکوع اسلمی تھے جنہوں نے درحقیقت تین بار آغاز، درمیان اور آخر میں بیعت کی تھی اپنے دست مبارک پر دوسرا ہاتھ مار کر رسولؐ اللہ نے حضرت عثمانؓ کی طرف سے بیعت کی تھی، یہ ایک تاریخی واقعہ تھا جس میں امن کا ارادہ اور جنگ کا امکان خلط ملط ہو گئے تھے اس وقت اللہ نے مسلمانوں کے دلوں پر سکینت اور اطمینان نازل کیا اس موقعہ کی یادگار سورہ الفتح کی وہ آیت ہے جس میں جلد ہی ایک بڑی فتح کی خوش خبری دی گئی تھی قرآن حکیم میں کہا گیا: ''بلاشبہ اللہ ان مومنوں سے راضی ہو گیا جو درخت کے نیچے بیٹھ کر آپ سے بیعت کر رہے تھے اور اللہ کو ان کے دلوں کی کیفیت معلوم تھی تو اللہ نے ان کو سکینت اور اطمینان سے بھر دیا اور لگے ہاتھ ایک فتح کی نوید بھی دے دی'' (۵)

اس آیت میں لفظ سکینت اہم ہے امام راغب نے اس آیت کے ذیل میں حضرت علیؓ کا قول بھی نقل کیا ہے کہ ''حضرت عمرؓ کی زبان پر سکینت بولتی ہے'' اور پھر وضاحت کی کہ سکینت سے مراد عقل ہے (٦) گویا یہ بیعت صحابہ کے عقل و شعور کی دلیل تھی اور وہی سبب تھی ان سب سے اللہ کی دائمی رضامندی کا۔

امن کی تلاش کا کام مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنی خزاعہ نے شروع کیا تھا اس قبیلہ کے سردار بدیل ابن ورقا نے اگرچہ اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا مگر انہیں رسولؐ اللہ کے مزاج اور ارادوں کا درست اندازہ تھا تاہم بات آگے بڑھانے سے پہلے وہ رسولؐ اللہ کی خدمت میں آئے انہیں بتایا گیا کہ مقصد نہ جنگ کرنا تھا نہ تباہی پھیلانا نہ دنیاداروں کی طرح بعد میں اپنی برتری یا قریش کی کمتری کے جھوٹے سچے گیت گانا تھا۔ رسولؐ اللہ نے بڑے غم انگیز لہجہ میں فرمایا کہ ''قریش

کا برا ہو، ان کے دماغوں کو جنگ کے خیال نے چرلیا ہے'' آپؐ نے کہا کہ قریش کا کیا جاتا ہے اگر وہ اس معاملہ کو مجھ پر اور عربوں پر چھوڑ دیں اگر عرب مجھے ہلاک کر دیں تو ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اور اللہ نے ان پر مجھے غالب کر دیا تو لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو جائیں گے'' اس کے بعد رسول اللہؐ نے ایک جلالی بیان دیا آپؐ نے فرمایا ''اگر قریش اسلام میں داخل نہیں ہوتے تو جب تک ان میں دم خم ہے جنگ کرتے رہیں گے پر وہ کس خیال میں ہیں اللہ کی قسم (وہ جنگ کریں گے تو) اس مقصد کے لیے میں برابر جہاد کرتا رہوں گا جس کے لیے اللہ نے مجھے مبعوث کیا ہے تا آں کہ وہ پاک ذات اسے غالب کر دے یا میری موت آجائے'' (۷)

رسول اللہؐ کی خواہش بس یہ تھی کہ قریش مسلمانوں کو عمرہ کرنے دیں ''کاش وہ سلامت روی اختیار کریں'' کیونکہ ان کو کسی بھی طرح کا نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، بالخصوص جب کہ سال گزشتہ کی جنگ خندق کی اتحادی یورش مکہ کے معاشرہ اور معیشت دونوں کو تباہ کر چکی تھی۔

قریشی عزت نفس کا مسئلہ

اگر چہ قریش میں شورش پسندوں کی کمی نہیں تھی، پھر بھی مکہ کے سمجھ دار لوگوں نے بدیل کی زبانی رسول اللہؐ کی بات توجہ سے سنی شورش پسندوں کے برخلاف بدیل کی سفارت سے مکہ کے سرداروں نے دو نتائج اخذ کیے ایک تو بیعت رضوان سے کہ مجبور کیے گئے تو مسلمان نتیجہ خیز جنگ سے پہلو تہی نہیں کریں گے؛ دوسرے یہ کہ زور زبردستی اور جبر و تعدی کے ذریعہ حرم میں داخل ہونے سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ یہ دونوں باتیں خاصی متضاد تھیں مگر ان سے مسلمانوں کے عزم کا اندازہ کوئی بھی لگا سکتا تھا اس بات کو سمجھنے میں قریش نے غلطی نہیں کی یہاں تک کہ انتہا پسند عناصر نے بھی یہی نتیجہ نکالا کہ مسئلہ کو میدان جنگ کے بجائے باہمی گفت و شنید کے ذریعہ طے کرنا زیادہ سود مند تھا (۸)

حقیقت یہ ہے کہ مالی اور معاشرتی اسباب کی بنا پر وہ خود بھی جنگ سے توبہ کر چکے تھے مگر اپنی حیثیت عرفی کی وجہ سے پریشان تھے وہ دیکھ رہے تھے عرب کا مرکز اقتدار مکہ سے مدینہ منتقل ہو چکا

تھا ناکام جنگِ احزاب کا بانی حیی ابن اخطب کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا اور اس کی ہم نوائی کے جرم میں قریظہ بھی اپنے سارے سرداروں سے محروم ہو چکے تھے وہ محسوس کر رہے تھے کہ رسولؐ اللہ چاہیں تو فوجی اقدام سے بہ آسانی مکہ کو فتح کر سکتے تھے قریش کے وسائل ختم ہو چکے تھے مہاجرین کی متروکہ جائدادوں کی دولت اور بڑے قافلوں کا سارا نفع وہ تین جنگوں میں جھونک چکے تھے ان کی تجارت ختم ہو چکی تھی، جنگ خندق انہیں تباہی کے اس کنارے پر لا کر چھوڑ گئی تھی کہ ایک چھوٹا سا غلط قدم انہیں تاریخ کی ریگ رواں میں ڈبونے کو کافی تھا ان کے پاس اب کسی جھڑپ کے لیے بھی سرمایہ نہیں رہ گیا تھا تو انہوں نے مذاکرات کی تجویز کو لبیک کہا اور بے لچک سفارت کے ماہر سہیل ابن عمرو کو رسولؐ اللہ سے بات کے لیے منتخب کیا۔

قریش کے اکرام کا تحفظ

مقابلہ کے بجائے مذاکرات پر قریش کی آمادگی فقط معاشی نہیں بلکہ قریش کی نفسیاتی کیفیت کی غماز بھی تھی رسولؐ اللہ کو اس ذہنی کیفیت کا پورا اندازہ تھا ایک عام سیاست داں اس کیفیت کا پورا فائدہ اٹھاتا اور اخلاقیات کے چبوترے سے بیانات داغتا اور دھمکی بھی دیتا کہ ۱۴۰۰ کا لشکر جرار قریش کا شکست دینے اور شہر میں غارت ڈالنے کو کافی تھا۔

رسولؐ اللہ اس صورت حال کو بہت مختلف زاویہ سے دیکھ رہے تھے قریش اپنی سیاسی اور حربی غلطیوں کی وجہ سے پہلے ہی خاصی شرمندگی کے شکار تھے اب اپنے ہی شہر میں ان کی فوجی شکست، جو پیش آمدہ حالات میں غیر ممکن نہیں تھی عرب بھر میں ان کے اعزاز و اکرام کو تہس نہس کر ڈالتی کہ پھر وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے ان کا وہ اثر و رسوخ خاک میں مل جاتا جو پانچ نسلوں کی قیادت میں انہوں نے انتھک محنت اور بے مثال قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا اس کا دوسرا بڑا نقصان خود بنی اسمٰعیل کی مسلمہ بزرگی کو پہنچتا عرب بھر میں ان سے زیادہ محترم اور مقدس کوئی اور نسل نہیں تھی یہاں تک کہ ان کی برگزیدگی کو جزیرۃ العرب کے باہر بھی تسلیم کی جاتا تھا، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ قیصر و کسریٰ کے درباروں، شام و یمن اور مصر و حبشہ کی حکومتوں سے انہیں وہ

تجارتی مراعات حاصل ہوتیں جوان کے علاوہ کوئی اور قبیلہ حاصل نہ کرسکتا تھا بنی اسمٰعیل اور قریش کا یہی عمرانی وقار اور تہذیبی امتیاز تھا کہ ان کو توحید کی اس عظیم دعوت کا نقطۂ آغاز بنایا گیا تھا، جب کہ قوت و جبروت، شوکت و حشمت کے لحاظ سے اطراف و جوانب میں بھی اور باقی مہذب دنیا میں بھی اور بھی کئی قومیں برتری کی دعوے دار تھیں ۔ ربانی مقاصد میں بنی اسمٰعیل اور ان میں قریش کو ایک عالمی نظام کی تشکیل کے لیے اسی واسطے منتخب کیا گیا تھا۔

مکہ میں قریش کی آخری فوجی شکست ان کو اس مقام ہی سے گرا دیتی جس کے لیے صدیوں سے ان کی تربیت کی جارہی تھی اور جس کا صلہ خود انہی میں رسولؐ اللہ کی بعثت کی صورت میں انہیں مل چکا تھا صلح حدیبیہ سے پہلے مسئلہ صرف مشرکین قریش کی عزت نفس کا نہیں تھا وہ غلط سمت میں کھڑے ہوئے تھے اس سے واقف تھے اور اس پر بضد بھی تھے بدر، احد اور احزاب کی جنگوں کے نتائج سے ان کی عزت پر جو حرف آگیا تھا اس کے ذمہ دار وہ خود تھے اور اس کا علاج ان کی اشک شوئی اور عمرانی ہمدردی نہیں، اسلام کے نسخے میں تھا جو بالآخر انہیں قبول کرنا پڑا۔

رسولؐ اللہ کو ان مشرکین قریش کا دفاع منظور نہیں تھا آپؐ کے پیش نظر قریشی صحابہ تھے قریش کے بہترین افراد تمام کے تمام اسلام قبول کر چکے تھے اس کے لیے متواتر قربانیاں دے رہے تھے اور اس کی بنیاد پر مرتب ہونے والے نظام حیات کے خاکے میں رنگ بھر رہے تھے بات ان کی عزت نفس کی تھی۔

قریشی دبدبہ برقرار رکھنے کی حکمت

اس موقعہ پر اگر اہل مکہ کے خلاف جنگ ہوتی اور اس میں مسلمانوں کو فتح بھی مل جاتی تو اس کے کچھ دوررس منفی اثرات کسی درجہ میں ان بزرگوں کو مضطرب کر سکتے تھے بے شک ان کا ایمان اس قدر مضبوط تھا کہ انہیں اپنے مشرک عزیزوں سے قلبی تعلق باقی نہیں رہ گیا تھا اور موقعہ پڑے تو جنگ کے دوران انہیں تہہ تیغ کر دینے سے بھی انہیں عار نہ تھی لیکن رسولؐ اللہ انسانیت کے حکیم تھے انسانی نفسیات کو جتنا آپؐ جانتے اور سمجھتے تھے دوسرا کوئی اتنا واقف نہ تھا آپؐ ایسے ہی نفسیاتی

حقائق کے پیش نظر اقدامات فرماتے تھے چنانچہ قیام حدیبیہ کے موقعہ پر بھی انسانی نفسیات کی باریکیاں آپؐ پر ہویدا تھیں اور اپنے جاں نثار اصحاب کو منفی اثرات سے ہر طرح محفوظ رکھنا آپؐ کو مقصود تھا۔ یہ درست ہے کہ بزرگ صحابہ اہل مکہ کی شکست سے ہرگز شکستہ دل نہیں ہو سکتے تھے کہ مجرموں کو سزا دینا سنت اللہ ہے جس کا ذکر جابجا قرآن حکیم میں ان کے سامنے موجود تھا گزشتہ چار برس میں ان میں کسی نے ابوجہل عمرو ابن ہشام، ابولہب، عتبہ ابن ربیعہ، امیہ ابن خلف، عقبہ ابن معیط، نبیہ اور منبہ ابناء حجاج کا غم تو درکنار ان کو یاد بھی نہیں کیا تھا ام المومنین حضرت ام حبیبہ رملہؓ بنت ابوسفیان، حضرت سہلہؓ بنت سہیل ابن عمرو، حضرت ابوحذیفہؓ ابن عتبہ ابن ربیعہ انہی مشرکین کے راسخ العقیدہ مسلم عزیز رشتہ دار تھے مگر سوائے اس دعا کے کہ اللہ ان کے اقربا کو ہدایت دے اور کوئی جذبہ قرابت ان کے دلوں کو نہیں گرماتا تھا ان پر مشرکین کی شکست کا کوئی منفی نفسیاتی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ یہ رسولؐ اللہ کی تربیت کا ثمرہ تھا اور آپؐ اس حقیقت سے واقف تھے مسئلہ جداگانہ تھا۔

اپنے ہی شہر مکہ میں اہل مکہ کی آخری شکست کے بعد عالم عرب میں قریش کا وہ دبدبہ بالکل ختم ہو جاتا جس کو مستقبل میں باقی رکھنا سیاسی اور عمرانی نیز نفسیات عامہ کی رو سے ضروری تھا رسولؐ اللہ نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا کہ مستقبل کے امراء قریش میں سے ہوں گے یہ بات صلح حدیبیہ سے پہلے کہی گئی ہو یا بعد میں مگر ایک اہم سیاسی اصول کے طور پر اس ایک قول نے عہد رسولؐ کے بعد اسلام کی تاریخ میں جو کردار ادا کیا ہے وہ کسی پر مخفی نہیں اس قول کا مقصد۔ جیسا کہ آئندہ باب سقیفہ میں تفصیل سے ذکر آیا ہے یہی تھا کہ نہ صرف عرب بلکہ اطراف میں بکھری ہوئی باجبروت شہنشاہیتوں کو بھی قریش کی اعلیٰ نسبی اور ان کے سیاسی اور اقتصادی تدبر و حکمت کا اعتراف تھا اور اسی لیے رسولؐ اللہ نے بعض مواقع پر صحابہ کو ہدایت کی تھی کہ آپؐ کے پردہ فرمانے کے بعد وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے رجوع کیا کریں۔

مکہ میں اگر قریش کو شکست ہوتی تو وہ دراصل اس رعب و دبدبہ اور اس اعتراف تدبر کی شکست ثابت ہوتی جس سے مستقبل میں اسلام کو بڑے کام لینے تھے۔ یہ امت محمدی کا امتیاز ہے

کہ ماضی کی دوسری قوموں کی طرح اس قوم میں اس کے ماضی کو کھرچ کر نہیں مٹا دیا گیا تھا بلکہ مستقبل میں اس ماضی سے ہر ممکن فائدہ اٹھانے کی سنت قائم کی گئی تھی ہر کس نبی نے اپنی قوم کے گمراہوں کو بھی یہ عزت دی تھی کہ جو جاہلیت میں شریف تھے، اسلام میں بھی وہ شریف ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ جب انہیں اسلام کا فہم پیدا ہو جائے (۹) عہد جاہلیت میں جاہلیت کا عنصر اللہ کی وحدانیت کا انکار تھا جب وہ عنصر نکال پھینکا گیا تو یہی قریش تھے جن کو اولین صحابی ہونے کا شرف حاصل ہوا وہ حضرت ابوبکرؓ کی فراست ایمانی ہو یا حضرت عمرؓ کا تفقہ اور قانون شناسی حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن عوف کی سیاسی بصیرت اور جود وسخا ہو یا حضرت علیؓ کی ذکاوت، علم وعدل، حضرت خالدؓ ابن الولید کی حربی دانشمندی ہو یا حضرت عمروؓ ابن العاص کا تدبر متذکرہ بالا حدیث میں ان جیسے بزرگ ہی شرافت کا حوالہ تھے جنہیں شروع میں اس شرافت کا عرفان ہو گیا تھا وہ سابقون الاولون کہلائے، جنہیں دیر لگی وہ مؤلفۃ القلوب میں شمار ہوئے دونوں رتبے بلند تھے اور ان دونوں زمروں میں جو اصحاب ہیں وہ سب ابدی ہدایت کے ستارے ہیں۔

سخت شرائط اور نرم رویہ

قریش کی اس شرافت وعزت کو برقرار رکھنا مقصود تھا یہ تھا وہ سبب کہ رسول اللہؐ نے تمام اسباب مہیا ہونے کے باوجود یوم حدیبیہ کی جنگ سے گریز کیا اس فیصلہ سے دیگر دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہؐ ہر ممکن حد تک جنگ اور خونریزی سے پہلو تہی کرتے تھے اور صلح حدیبیہ کی حربی حکمت دراصل امن وسلامتی کی حکمت تھی۔

حدیبیہ کے موقعہ پر عام سیاسی لیڈر کے نقطۂ نگاہ سے جنگ کا جواز موجود تھا مسلمان مظلوم تھے مشرکین مکہ ظالم تھے مسلمان مستقل طور پر مشرکین کی فوج کشی کے شکار تھے مشرکین بار باران کے شہر کے امن اور معیشت کو برباد کرنے کوششیں کر چکے تھے، بدلی ہوئی صورت حال میں مسلمان طاقت پکڑ چکے تھے اور بدلہ لے سکتے تھے مگر بدلہ لینے سے من کی آگ نہیں بجھا کرتی ہے ایک طرف خون کے چھینٹوں سے اگر شعلے بیٹھ کر انگارے رہ جاتے ہیں اور دوسری طرف ایسے ہی

انگاروں سے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں یہی وجہ تھی کہ عہد جاہلیت کے عربوں کی لڑائیاں ایک کے بعد دوسری نسل تک چلتی تھیں اسی وجہ سے یونان/ بیزنطئم اور فارس (ایران) ۹۶۱ سال تک اُس سلسلۂ جنگ میں مبتلا رہے جسے ۳۳۴ قبل مسیح میں سکندر نے بھڑکایا تھا اور جس کے نتیجہ میں جزیرۃ العرب کے شمالی ممالک کی قومیں اپنی املاک کی ہزار سالہ تباہیوں سے عاجز آ کر اسلام کے شامیانہ میں سکون کا سانس لینے کے لیے دوڑی تھیں، اسی وجہ سے انگلستان اور فرانس کی بادشاہتیں اور ان کے حلیف ملک ۱۳۳۷ء سے ۱۴۵۳ء تک سو سالہ جنگ کے نام سے مشہور انتقامی، اقدامی اور جوابی لڑائیوں کا شکار رہے، اسی لیے یورپ نے اپنے قومی انتقام کی خاطر بیسویں صدی میں دوبارہ ساری دنیا کو دو بدترین جنگوں کی تباہ کاریوں میں جھونک دیا تھا جس کی نحوست سے انسانیت کو آج تک نجات نہیں ملی۔

اور اسی لیے اسلام نے قانون دیا تھا کہ اگر عدل وانصاف کی راہ سے برابر کا بدلہ لے سکو تو لے لو ورنہ انسانوں کے حق میں بہتر ہے کہ وہ معاف کر دیں تا کہ زندگی تعمیر اور ترقی کے راستے پر بڑھتی رہے اور یہ وجہ تھی کہ فوجی سطح پر بدلہ سے اجتناب کر کے رسولؐ اللہ نے مشرکین کے دلوں کو فتح کیا اور وہ فتح کسی شہر کی مادی فتح سے زیادہ دیرپا ثابت ہوئی صلح حدیبیہ کے بعد امن وتعمیر، ارتقاء و تہذیب کی اسی فتح کی نوید دینے کے لیے سورہ الفتح کی آیات نازل ہوئی تھیں۔

صلح حدیبیہ کے مندرجات

اس لیے سہیل ابن عمرو سے مذاکرات کے دوران رسولؐ اللہ نے نفسیاتی طور پر ہزیمت خوردہ اہل مکہ کی سخت شرائط پر اعتراض کیا نہ ان کے جواب میں اپنی طرف سے سخت شرائط پیش کیں سب سے پہلا اعتراض تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پر ہوا قریش روایتاً بِاسمِکَ اَللّٰھُم لکھتے تھے اس شرط کو مان لیا گیا پھر محمد رسولؐ اللہ لکھنے پر اعتراض ہوا کہ اگر رسولؐ مان لیتے تو جھگڑا ہی کیا تھا، رسولؐ اللہ نے یہاں بھی اصرار نہیں کیا اور محمد ابن عبداللہ لکھنے پر رضامندی ظاہر کر دی اس کے بعد بھی کچھ شرائط برابری کے اصول کے خلاف تھیں سہیل ابن عمرو کا مقصد تمام عربوں کو یہ تأثر

دینا تھا کہ قریش نے برتر سطح سے معاہدہ کیا ہے یہی وہ نفسیاتی الجھن تھی جس کی پاسداری رسولؐ اللہ کر رہے تھے، جیسا کہ سطور بالا کے تجزیہ میں عرض کیا جا چکا ہے۔

اس معاہدہ میں دس سال تک جنگ بندی کا عہد کیا گیا اور طے ہوا کہ دلوں کی عداوتوں کو دلوں میں رکھا جائے، ظاہر نہ کیا جائے اور نہ اس عہد میں خیانت اور خلاف ورزی ہو مکہ کا کوئی مسلم اپنے ولی یا آقا یا مربی کی اجازت کے بغیر مدینہ آئے تو اسے واپس کرنا لازم ٹھہرایا گیا جب کہ مدینہ کا کوئی مسلمان مکہ میں پناہ لے لے تو اسے واپس نہ کرنے کی شرط رکھی گئی تھی دیگر قبائل عرب میں سے جو چاہے محمدؐ کی جانب سے اس معاہدہ میں شرک ہو جائے اور جو چاہے قریش کا حلیف بن جائے معاہدہ میں یہ بھی تھا کہ اس وقت مسلمان واپس چلے جائیں اور عمرہ نہ کریں اور آئندہ سال اس غرض سے آئیں مگر تلواریں نیاموں میں رکھے ہوئے صرف تین دن کے لیے جس مدت میں قریش شہر سے باہر چلے جائیں گے۔

معاہدہ کا اعلان ہوتے ہی بنی خزاعہ نے رسولؐ اللہ کی حمایت کا اعلان کر دیا اور بنی بکر نے قریش کے ساتھ کا (۱۰)

رسولؐ اللہ اہل مکہ کو دم لینے کا موقعہ دینا چاہتے تھے اسی لیے مذاکرات کے دوران آپ نے مثالی نرمی کا مظاہرہ کیا سخت شرائط منوا کر قریش کے سفیر نے اپنی قوم کی عزت نفس کو بے شک سہارا دیا لیکن قریش نے اسے مسلمانوں کی کمزوری بہر حال نہیں سمجھا وہ حربی اور سیاسی حقیقتوں سے بے خبر نہیں تھے اور جانتے تھے کہ کمزور ہوتے تو رسولؐ اللہ ۱۴۰۰ اصحابہ کے ساتھ مکہ تک آنے کی ہمت نہ کرتے یہ سفر بجائے خود مسلمانوں کی قوت کا مظاہرہ تھا سہیل ابن عمرو جیسا ذہین سفیر اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھا۔

منفعتِ امن کا اسلامی طریقہ

دوسرا نکتہ یہ تھا کہ صلح حدیبیہ کی حربی حکمت سلامتی کی حکمت تھی ہجرت کبریٰ کے بعد جنود مدینہ کو قریشی کاروانوں اور مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی کے لیے استعمال کیا گیا تھا، جارحیت

کے لیے نہیں عساکر مکہ جنگ اور خونریزی کے لیے یورشیں کرتے رہے معاہدۂ حدیبیہ نے مسلمانوں کے خلاف قریش کی کسی بھی نئی جنگ کے امکان کو مسدود کر دیا تھا اس کے علاوہ مدینہ پر کسی اور کی فوج کشی کی صورت میں بھی معاہدہ نے قریش کو میدان جنگ سے باہر رہنے کا پابند کر دیا تھا رسولؐ اللہ کی سیاسی اور حربی فراست کا پہلا پھل تھا اور مسلم سیاست دانوں اور فوجی سالاروں کے لیے رہتی دنیا تک سنت کفایہ ہے۔

مکہ اور مدینہ کے بیچ حالت جنگ کی وجہ سے تقسیم شدہ خاندانوں اور پرانے دوستوں کے مابین ربط و تعلق ختم ہو گیا تھا دس سالہ امن معاہدہ نے ان سرد تعلقات کو تازہ کرنے کا راستہ کھول دیا باہمی گرمجوشی بڑھی تو افہام و تفہیم کے دروازے کھڑکیاں کھلنے شروع ہوئے اس انتظام سے مشرکین قریش کے مقابلہ میں مسلمین مدینہ کو زیادہ ہی فائدہ ہوا مشرکین کے پاس کسی کو قائل معقول کرنے کا کوئی سامان تھا ہی نہیں جو مسلمان ہوئے تھے وہ کچھ سوچ سمجھ کر اور معقول دلائل ہی کی بنا پر شرک کے جال سے نکلے تھے انہیں شرک کی طرف واپس لانے کی کوئی دلیل نہیں تھی اور اسلام کے ذاتی اور عملی تجربہ کی جو لذت انہیں حاصل ہو چکی تھی اس کے بعد وہ بھلا کیوں کوئی اور بات سنتے ابتدائے اسلام سے صلح حدیبیہ تک کے ۱۹ سال کی مدت میں شدید مظالم اور جسمانی اور نفسیاتی اذیتیں اٹھا کر بھی ایک آدھ شخص کے سوا کوئی بھی اسلام سے نہیں پھرا تھا تو اب ان اذیتوں اور مظالم کا سد باب ہونے کے بعد تو کوئی بھلا کیوں برگشتہ ہوتا۔

اس کے برعکس مسلمانوں کے پاس نہ صرف توحید اور رسالت کا پیغام تھا بلکہ اس سلسلہ کے ذاتی روحانی تجربات، عالم ملکوت کی سیر و مشاہدات، انجانی دنیاؤں کے مکاشفات کے خزانے تھے جن کے سامنے شرک اور کفر و انکار کے تار و پود بکھر جانے تھے جس وقت ظاہری کمزوری کے ساتھ معاہدہ لکھا جا رہا تھا تو مستقبل قریب کی یہ حقیقتیں اور روشن امکانات رسولؐ اللہ کے قلب اطہر پر آئینہ تھے حضرت عمرؓ ابن الخطاب کو حیرانی تھی جو بجائے خود ان کے محکم ایمان اور ان کی مثالی شجاعت کی دلیل تھی ان حق پسند اصحاب کو اضطراب ہوتا تو اللہ اسے دور کر دیتا تھا جو بزرگ مشرکوں

کے مقابلہ میں اہل توحید کی عمرانی اور روحانی برتری کے عینی گواہ تھے ان کی سکینت اور اطمینان قلب کے لیے قرآن حکیم میں ایک بڑی فتح اور کامیابی کی نوید نازل ہوئی۔

فتح مبین کے تاریخی دلائل

''بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلی فتح دی ہے تاکہ اللہ آپ کی اگلی پچھلی سب خطائیں معاف کر دے اور آپ پر اپنے احسانات کی تکمیل کر دے اور آپ کو سیدھے راستے پر لے چلے اور آپ کو ایسا غلبہ دے جس میں عزت اور طاقت ہو۔ وہی ہے جس نے مؤمنوں کے دلوں میں اطمینان اتارا تاکہ ان کا ایمان پہلے سے بھی بڑھ جائے اور زمین و آسمان کے سارے لشکر اللہ ہی کے تو ہیں وہ بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے'' (۱۱)

وہ فتح کون سی تھی؟ وہ حکمت کیا تھی؟ وقت نے ذرا کی ذرا میں سب آنکھوں کے سامنے کھول دیا۔

صلح حدیبیہ کے وقت ۱۴۰۰ مسلمان رسول اللہؐ کے گرد اگر جمع تھے دو سال بعد ۲۰ رمضان ۸ھ/ ۱۱ جنوری ۶۳۰ء میں رسول اللہؐ جب فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوتے ہیں آپ کی ہمراہی میں دس ہزار مسلمان دنیا کی پہلی امن فوج میں آئے تھے (۱۲) صلح حدیبیہ کے چار سال بعد رسولؐ اللہ حجتہ الوداع کے لیے مدینہ منورہ روانہ ہوتے ہیں تو ۷۰ ہزار عازمین حج آپ کے ہم رکاب تھے امن اور ایمان کا یہ قافلہ مکہ پہنچ کر جب منیٰ کے لیے روانہ ہوا تو ایک لاکھ افراد جمع ہو چکے تھے اور یوم عرفہ کو رسولؐ اللہ کا مشہور خطبہ حجتہ الوداع سننے اور رسالت کا حق ادا کرنے کی گواہی دینے کے لیے ۱۲۴۰۰۰ بندگان الٰہی جبل الرحمتہ کے سائے میں دین کی تکمیل، اللہ کی نعمت کے اتمام اور اسلام کو بطور دین ابد تک کے لیے نجات کی سند بنائے جانے کی بشارت (۱۳) سننے کے لیے جمع تھے۔

امن اور صلح کے چار سال میں مسلمانوں کی تعداد دس گنا سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی!

اسلام میں اسی کو امن کی منفعت کہا جاتا ہے

اس سے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ کفر و شرک کی طاقتیں مسلمانوں کو مستقل جنگوں میں کیوں مبتلا رکھنا چاہتی ہیں انہیں پتا ہے کہ امن شیطان کی شکست کا سبب ہوتا ہے۔

عمرہ قضا کی تکمیل

صلح حدیبیہ کے ایک سال بعد رسولؐ اللہ گزشتہ سال کا قضا عمرہ ادا کرنے کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے یہ سفر اور عمرہ معاہدہ کا حصہ تھا اس سفر میں ہر مسلمان کمر سے تلوار باندھے ہوئے تھا مگر معاہدہ کے مطابق ساری تیغیں نیاموں کے اندر تھیں سفر میں شمشیر ساتھ رکھنا ایک قدیم عرب روایت تھی اور اسے مردانگی کی شان بھی سمجھا جاتا تھا۔

رسولؐ اللہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو اپنی اونٹنی پر سوار تھے جس کی نکیل حضرت عبداللہؓ ابن رواحہ انصاری نے تھام رکھی تھی حضرت عبداللہ ایک ممتاز شاعر بھی تھے اور بطور ہدی فی البدیہہ اشعار پڑھتے جاتے تھے

''راستہ چھوڑ دو ، کفار قبیلے والو   خیر ساری فقط اللہ کے رسولؐ کی ہے

''ان کے ہر قول پہ ایمان ہے میرا ، یارب   معرفت ان کی سند، اللہ کے حق کے قبول کی ہے'' (۱۴)

معاہدہ حدیبیہ کے مطابق رسولؐ اللہ اور آپ کے اصحاب تین دن مکہ میں مقیم رہے اس دوران سارے کفار اپنے خاندانوں سمیت شہر خالی کر کے اطراف کی پہاڑیوں کے پیچھے جا ٹھہرے تھے تین دن کی مدت پوری ہوئی قریش نے سہیل ابن عمرو اور حویطب ابن عبدالعزیٰ کو بھیجا کہ وعدہ کے مطابق مسلمان شہر چھوڑ دیں۔ رسولؐ اللہ نے کوئی مزاحمت نہ کی اگرچہ آپ کی خواہش ابھی کچھ اور قیام کی تھی، آپؐ کے حکم پر سارے مسلمان مکہ سے باہر نکل آئے اور مدینہ واپسی پر پہلے نواحِ مکہ میں سَرِف کے مقام پر کچھ قیام کیا۔

سرف کے مقام پر آپ نے ام المومنین حضرت میمونہؓ بنت حارث کے ساتھ عروسی کی وہ حضرت عباس کی اہلیہ حضرت ام الفضل کی بہن اور قریش میں بنی مخزوم سے تھیں اور اپنا معاملہ

انہوں نے اپنی بہن کے سپرد کر دیا تھا حضرت ام الفضل کی تحریک پر رسولؐ اللہ نے حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا تھا۔

رسولؐ اللہ کی خواہش تھی کہ مکہ میں قیام کے دوران ولیمہ کریں جس میں سارے قریش کو مدعو کریں مگر جو یطب نے کہا ''ہمیں آپؐ کے کھانے کی ضرورت نہیں'' (۱۵)

رسولؐ اللہ چپ ہو رہے دعوت کو رد کرنا بھی عرب تہذیب اور روایات کے خلاف تھا شرک نے بہت سی شریفانہ عرب روایات کو دھندلا دیا تھا مگر اس گرد کو تو چھٹنا ہی تھا ایک سال نہ گزرا تھا کہ وہ گرد چھٹ کر ہی رہی۔

حوالے

۱ امام بخاری، الجامع صحیح (تفہیم البخاری) ع۔ا ر ۲۹۷۲۔۱۱۲۸ (ص ۲۹۴)

۲ القرآن، العلق ۹۶:۴ بنی اسرائیل ۱۷:۷۰ دیکھیے قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری ۷:۶۳۔ اسباب عزت حسن صورت، معتدل مزاج قد کا اعتدال، عقل سے اشیاء میں امتیاز، زبان، تحریر اور اشاروں سے سمجھانے کی قوت، معاش و معاد کی ہدایت، زمین کی موجودات پر تسلط یعنی تمام چیزوں سے کام لینا اور مختلف ہنر اور پیشے اور تمام مادی عنصری اور فلکی کائنات کا ربط تا کہ انسان کو مختلف منافع حاصل ہوں اور اسباب رزق فراہم ہوں، پھر دوسرے جانوروں کے برخلاف آدمی کو ہاتھ سے اٹھا کر اور پکڑ کر کھانے کی تعلیم ۔۔۔ امام حاکم نے تاریخ میں اور دیلمی نے حضرت جابر ابن عبداللہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا انگلیوں سے کھانا بھی (انسان کے لیے اللہ کی طرف سے) عزت بخشی ہے مزید دیکھیے مولانا محمد شفیع، معارف القرآن ۵:۵۰۶ امام جلال الدین محلی و امام جلال الدین سیوطی، تفسیر جلالین ۳۰۴

۳ ابن کثیر، سیرۃ النبی ۲:۲۲۸ مزید دیکھیے قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری ۱۰:۳۲۸

۴ ابن ہشام، سیرۃ النبی ۲:۳۷۵۔ ابن کثیر، سیرۃ النبی (البدایہ و النہایہ) ۲:۲۲۹
قاضی ثناءاللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، سورہ الفتح ۱۰:۳۴۸

۵ القرآن، الفتح ۴۸:۱۸۔ مولانا مفتی محمد شفیع، معارف القرآن ۸:۶۰ قاضی ثناءاللہ پانی پتی، تفسیر مظہری ۱۰:۳۴۹

۶ امام راغب اصفہانی، مفردات القرآن ۲۴۳

۷ ابن ہشام، سیرۃ النبی ۲:۳۶۹

۸ مولانا محمد اسلم قاسمی، سیرۃ حلبیہ اردو ۵:۶۲، ۷۰، ۸۰

۹ امام بخاری، الجامع صحیح. کتاب الانبیاء (تفہیم البخاری) ۵۵:۳۱۲:۵۷۸

۱۰ ابن ہشام، سیرۃ النبی ۲:۳۷۸۔۳۷۹

۱۱ القرآن، الفتح ۴۸:۱۔۴ تفصیل دیکھئے ابن ہشام، سیرۃ النبی ۲:۳۸۱۔۳۸۵

۱۲ مولانا حامد الانصاری غازی، اسلام کا نظام حکومت ۵۱۱

۱۳ القرآن، المائدہ ۵ : ۳

۱۴ ابن ہشام، سیرۃ النبی ۲:۴۳۴

۱۵ ابن ہشام، سیرۃ النبی ۲:۴۳۶ ابن کثیر، سیرۃ النبی (البدایہ و النہایہ) ۲:۳۱۰

ترجمہ و تلخیص
محمد طارق علی

ڈاکٹر ذوالفقار علی شاہ

شہنشاہِ فرانس نپولین کا قبولِ اسلام ☆

نپولین بوناپارٹ، معروف تاریخی شخصیت، شہنشاہِ فرانس تھا، طاقت ور ترین، بلا کا ذہین اور دلیر۔ پورا یورپ اس کے نام سے تھر تھر کانپتا تھا۔ اپنی فوج لیے جس طرف نکل جاتا فتح اس کے قدم چومتی تھی۔ جنگی چالوں کا ماہر، عمدہ منصوبہ ساز، دشمن کی کمزوریوں کا شناسا، تساہل پسندی سے کوسوں دور۔ تاریخ آج بھی یہ مانتی ہے کہ وہ دنیا کے چند بڑے فوجی دماغوں میں سے ایک تھا۔ بہت معمولی پس منظر سے اُبھرا ہوا یہ شخص اپنی ذاتی صفات کی بدولت ۱۸۰۴ء سے ۱۸۱۵ء تک فرانس کے تختِ شاہی پر متمکن رہا۔ اُس نے فرانس کی حکومت کو مرکزیت عطا کی، اسے جغرافیائی وسعت دی، بینک آف فرانس قائم کیا۔ فرانسیسی قوانین میں ''نپولین کوڈ'' کے ذریعے اصلاحات کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپ میں اس کی افواج کی پیش قدمیوں اور فتوحات کا ایک طویل سلسلہ بھی تھا۔ لیکن ہر ''کمالے را زوالے'' کے مصداق، دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے ہمہ وقت کمربستہ رہنے والے اس جرنیل کو یورپ کی متحدہ افواج نے واٹرلو کے مقام پر شکست فاش دی اور گرفتار ہوا۔ برطانوی حکومت نے اسے ہزاروں میل دور براعظم افریقہ کے مغربی ساحل کے قریب ایک چھوٹے سے جزیرے ''سینٹ ہلینا'' میں قید کر دیا جہاں وہ ۵ مئی ۱۸۲۱ء کو وفات پا گیا۔

تاریخ کی کتابیں نپولین کی رنگا رنگ شخصیت اور اس کے جنگی کارناموں کے مفصل اذکار سے بھری پڑی ہیں لیکن اس ''مردِ یورپ'' کی شخصیت کی ایک ایسی چشم کشا حقیقت بھی ہے جو اس

☆ زیرِ نظر تحقیقی مقالہ کی فراہمی کے لیے ہم جناب زاہد رضا خان ڈائریکٹر وزارت خارجہ حکومت پاکستان کے نہایت ممنون و سپاس گزار ہیں (ادارہ)

کے کارناموں کے انبار میں دبی رہ گئی، عام نہیں ہوئی اور وہ یہ کہ نپولین دین اسلام اور حضورؐ پاک کا شیدائی تھا۔ اس نے قرآن اور آنحضورؐ کی حیات مبارکہ کا مطالعہ کیا اور حاصل ہونے والے علم کو اس نے اپنے دنیاوی عزائم کی تکمیل کے لیے موزوں پایا۔ اس نے اسلام قبول کیا اور ''علی بوناپارٹ'' نام اپنایا۔ وہ کتاب دوست تھا اور مطالعے کا شوقین۔ وہ مشرق کے مختلف ممالک کی تواریخ کا ایک عمومی اور تاریخ اسلام کا خصوصی طالب علم تھا۔ زیاد المرصفی (Ziad Elmarsafi) کا کہنا ہے:

''یوں تو مصر پر نپولین کے حملے کے علاوہ بھی اسلام کی موزونیت کے بارے میں اہل یورپ کی چند اور قابل ذکر کوششیں ان کی علمی جستجو کا پتہ دیتی ہیں لیکن نپولین نے ایک اچھے صاحب علم کی حیثیت سے نہایت عقل مندی کے ساتھ ''اتھارٹی'' اور مستشرقین کی ''دانش'' کو باہم مربوط کر دیا تھا'' بلاشبہ اس کی فوجی فہم وفراست اور کامیابیوں کے پیچھے اس کے ''مشرقی علم'' کی طاقت بھی تھی۔ ہنری لاریز نے کہا ''نپولین بوناپارٹ نے کوئی چیز ایجاد نہیں کی لیکن اس نے اپنے عہد کے جتنے مشرقی علوم پڑھے، ان کے چند اچھے اصولوں پر عمل بھی کیا۔''

اس نے مشرقی علوم بالعموم اور دین اسلام کی تاریخ اور حضورؐ پاک کی سوانح کو بالخصوص بہت ذوق وشوق سے پڑھا۔ ایک معروف فرانسیسی مستشرق کلاڈ ایتینے سوارے (Claude Etienne Savary) پیدائش: ۱۷۵۰ء/ وفات ۱۷۸۸ء) مصر میں تین سال (۱۷۷۶ء۔۱۷۷۹ء) رہا اور ۱۷۸۷ء میں اس نے قرآن پاک کا ترجمہ کر کے اسے کتابی شکل میں شائع کیا جو نپولین کے لیے اسلام کے بارے میں معلومات کے اہم ذرائع میں سے ایک تھی۔ سوارے حضورؐ پاک کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''آپؐ ایسا غیر معمولی وبے مثل فہم وادراک رکھتے تھے کہ زمانے کا تعاون آپ کو ملتا گیا۔'' اُس کا یہ بھی قول تھا کہ ''حضرت محمد (صلعم) ان غیر معمولی شخصیتوں میں سے ایک تھے جو بہت عمدہ صفات سے متصف تھیں اور اس لیے ظہور میں آئیں کہ روئے زمین کو بدل کر رکھ دیں اور اپنے بعد آنے والے عام انسانوں کی قیادت

کریں۔ جب ہم آپؐ کے نکتۂ اختلاف کو سمجھیں اور یہ دیکھیں کہ عظمت کی بلندی تک وہ کیونکر پہنچے تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنا کچھ تو بہت ذہین وفطین لوگ صرف موافق حالات ہی میں حاصل کر سکتے ہیں نپولین بھی دنیا کا ایسا ہی زیرک فاتح بننا چاہتا تھا۔" حضورؐ پاک نے جو کچھ ساتویں صدی میں حاصل کیا نپولین نے وہی اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کے زمانے میں پانا چاہا۔ اُسے حضورؐ پاک کے خلاف کوئی ذرا سی بھی بات سننا گوارا نہیں تھا۔ اس نے خود بھی آنحضورؐ کی شان کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

"(حضرت) محمد (صلعم) ایک عظیم انسان تھے۔ ایک نڈر سپاہی تھے انھوں نے مٹھی بھر جوانوں کے ساتھ "بیندر" کی لڑائی جیتی۔ وہ ایک عظیم قائد تھے، بہت فصیح مقرر تھے اور امور مملکت کے ایک مدبّر بھی۔ انھوں نے عرب کے صحراؤں کے وسط میں اپنے وطن کی بنیاد رکھی اور ایک نئی قوم اور نئی طاقت کا آغاز کیا۔"

دراصل یہاں نپولین نے "جنگِ بدر" کا حوالہ دیا ہے جو مدینہ میں حضورؐ پاک کی ہجرت کے دوسرے ہی سال لڑی گئی تھی۔ جزیرہ سینٹ ہلینا میں نپولین کی اسیری پر کتاب لکھنے والے مصنّف ایمانوئیل آگسٹن ڈایوڈون جوزف (Emmanuel Augustine Diedonne Joseph) کاؤنٹ آف لاکاسز (Las Cases) کا کہنا ہے کہ نپولین معروف فرانسیسی ادیب والٹیئر سے ناخوش تھا کہ اس نے اپنے ڈرامے "محمد" میں حضورؐ پاک کی حیات مبارکہ کو ڈرامہ بنایا اور اُن کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوا اس نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں سینٹ ہلینا کے جزیرے میں جبری ملک بدری کا سامنا کیا۔ ان ایام میں اُسے بہت سے اہم مسائل پر غور وفکر کا موقع ملا۔ اس عرصے میں اس کے کئی ساتھیوں نے اس کے مکالمات اور حالات زندگی کو قلمبند کیا۔ ان میں کاؤنٹ آف لاکاسز (Count of Las Cases) بھی شامل تھا۔ اپریل ۱۸۱۶ء میں اس کی نپولین سے جو بات چیت ہوئی کاؤنٹ نے اسے پوری تفصیل کے ساتھ نوٹ کیا۔ اور لکھا کہ نپولین کا کہنا تھا:

''حضرت محمد (صلعم) کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ والٹیئر نے اپنے ڈرامے میں حضورؐ پاک کے کردار اور چال چلن کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ لکھا وہ تاریخ اور اصلیت کے بالکل خلاف تھا۔ اس نے حضورؐ پاک کی ذات اقدس کے مقام کو (نعوذ باللہ) کم تر کرتے ہوئے پست قسم کی سازشوں میں ملوث دکھایا۔ اس نے ایک عظیم انسان کے خلاف کہ جس نے دنیا کے رخ کو بدل کر رکھ دیا، اپنی تحریر میں سخت نازیبا کلمات لکھے (جنھیں یہاں دہرایا نہیں جاسکتا) اس کے علاوہ اس نے حضرت عمرؓ بن خطاب کے کردار کو بھی مسخ کیا اور اس طرح دکھایا کہ جیسے وہ (نعوذ باللہ) کسی جذباتی ڈرامے میں کسی خونی کا رول ادا کر رہے تھے۔''

نپولین نے والٹیئر کے مذکورہ ڈرامے کے اس مرکزی خیال کو رد کیا کہ (نعوذ باللہ) حضورؐ پاک جنونی تھے اس نے کہا کہ مختصر مدت میں حضور اقدس حضرت محمدؐ معاشرے میں جس تیزی سے تبدیلیاں لائے اور جتنی سیاسی فتوحات انھوں نے حاصل کیں وہ کسی جنون کا نتیجہ نہ تھیں۔ ''جنونیت کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتی کیونکہ جنونی پن کو غلبہ پانے کے لیے خاصا وقت چاہیے جب کہ حضورؐ پاک نے صرف تیرہ سال کے عرصے میں اتنا کچھ کر دکھایا۔'' اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ حضرت محمدؐ پر (نعوذ باللہ) دہشت انگیز جرائم میں ملوث ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ اکثر عظیم آدمیوں کے بارے میں یہ سوچا جاتا ہے کہ انھوں نے آگے بڑھنے کی خاطر جرائم کیے ہوں گے جیسے زہر خورانی وغیرہ۔ لیکن یہ بالکل لغو بات ہے ایسی حرکات سے کوئی کامیابی نہیں لے سکتا۔''

جنرل بیرون گورگاڈ (Baron Gourgaud) اُن جرنیلوں میں سے تھا جو نپولین کے بہت قریب تھے۔ اس نے بھی والٹیئر کے مذکورہ ڈرامے کے بارے میں نپولین کے تنقیدی جائزے اور اس کے خیالات کی تصدیق کی ہے۔

نپولین حضورؐ پاک کی ذات اقدس اور دین اسلام کا ایک سچا مداح تھا۔ اُن دنوں جب وہ دنیا کا ایک بڑا فاتح اور قانون ساز بننے کی خواہش رکھتا تھا تو اس نے حضورؐ پاک کو اپنا رول ماڈل

بنایا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ آپؐ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ مصر کی فوجی مہم پر جانے سے پہلے اس نے فوجی جوانوں اور افسروں کو ہدایت کی کہ وہ مسلمانوں کے مذہب کا احترام کریں۔ ہم جن لوگوں کے درمیان رہنے جا رہے ہیں، وہ مسلمان ہیں اور ان کے عقیدے کی ایک بنیادی شق یہ ہے کہ "ایک خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور حضرت محمدؐ اس کے رسول ہیں" آپ لوگ کسی بھی انداز میں ان پر اعتراض نہیں کریں گے۔ آپ لوگ قرآن کی بتائی ہوئی رسومات اور مسجدوں کا اسی طرح احترام کریں گے جس طرح آپ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے مذاہب اور ان کے پیروکاروں کی عبادت گاہوں کی تکریم کرتے ہیں۔ ۱۷۹۸ء میں نپولین اپنی پچپن ہزار فوج کے ساتھ مصر پہنچا۔ مقصد یہ تھا کہ مصر پر قبضہ کر کے ہندوستان کے لیے برطانوی تجارتی راستے کو روک دیا جائے۔ اُسے یقین تھا کہ "جو کوئی مصر کا مالک ہے وہی ہندوستان کا مالک ہے۔"

مصر پہنچتے ہی نپولین نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے ان مصری مسلمانوں سے خطاب کیا جو خدا کے احکامات پر کاربند تھے اور حضور پاک حضرت محمدؐ کے آفاقی مشن پر کام کر رہے تھے۔ اس نے کہا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اس کی حاکمیت لاشریک ہے اس کا نہ کوئی بیٹا ہے اور نہ ہی کوئی مددگار۔ جمہوریہ فرانس کی جانب سے جو آزادی اور مساوات کے اصولوں پر قائم ہے میں جنرل بوناپارٹ، فرانسیسی فوج کا سربراہ مصر کے عوام کو یہ برملا بتانے آیا ہوں کہ "بے" خاندان کے لوگوں نے جو ایک عرصے سے مصر کے حاکم ہیں فرانسیسی قوم کی بے عزتی کی ہے اور فرانسیسی سوداگروں کو تضحیک اور گالی گلوچ کا نشانہ بنایا ہے، اب اس کی انھیں سزا دینے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ اجڈ غلام (بے) جنھیں کاکیشیا اور جارجیا میں پروان چڑھایا گیا تھا، ایک عرصہ تک دنیا کے سب سے نفیس خطے کے لوگوں پر ظلم و ستم ڈھا رہے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جو تمام جہانوں کا مالک اور زبردست قوت والا ہے۔ اب ان غلاموں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اے مصریو! کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ

میں تمھارے مذہب کو ختم کرنے آیا ہوں، یہ سراسر جھوٹ ہے اس پر یقین مت کرنا۔ ان لوگوں کو بتا دینا کہ میں تمھارے حقوق بحال کرنے اور قابض حکمرانوں کو سزا دینے کے لیے آیا ہوں میں مملوکوں سے زیادہ اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد صلعم اور عظیم قرآن کا احترام کرتا ہوں۔ جان لو کہ ہم سچے مسلمان ہیں۔ کیا ہم وہی نہیں ہیں جنھوں نے اُس پوپ کو ختم کر دیا تھا کہ جس نے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ کا آغاز کروایا تھا۔؟ کیا ہم نے مالٹا کے سرداروں کا خاتمہ نہیں کیا تھا؟ ان جنونیوں کو یہ یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑنے کا اختیار دے دیا ہے۔"

ایک اور مورخ ہمبر گارشیا کا کہنا ہے کہ نپولین بونا پارٹ نے مصریوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ عثمانیہ مصر میں مساوات پر مبنی انصاف کا نظام قائم کرے گا جو قاہرہ میں ایک اسلامی جمہوریہ کے تحت کام کرے گا۔ اس مجوزہ اسلامی جمہوریہ کو حضرت محمدؐ اور قرآن پاک کے بتائے ہوئے مساوات والے قوانین کے مطابق قائم ہونا تھا۔ نپولین بونا پارٹ نے اسلام قبول کر لیا اور حضرت علیؓ کے نام نامی پر اپنا اسلامی نام علی بونا پارٹ رکھا اس نے اپنی اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ ایک ایسا باقاعدہ طرز حکومت قائم کیا جائے جو قرآن کے بتائے ہوئے اصولوں پر استوار ہو اس لیے کہ قرآنی اصول ہی سچے ہیں اور عام آدمیوں کی بھلائی کو یقینی بناتے ہیں۔

مصر میں اپنے پورے قیام کے دوران نپولین جب بھی مصری عوام سے خطاب کرتا قرآنی آیات اور احادیث کا حوالہ ضرور دیتا۔ ایک بار اس نے کہا: اپنے ساتھیوں کو یہ بتا دو کہ زمانے کی ابتدا ہی میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے دشمنوں کی بربادی کا اعلان کر دیا تھا اور یہ 'صلیب' میرے ہاتھ سے تباہ ہوں گی اور یہ کہ طویل عرصہ قبل ہی اس نے یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ میں مغرب کی جانب سے سرزمین مصر پہنچوں گا تاکہ میں ان لوگوں کو ملیا میٹ کر دوں جنھوں نے اس خطے میں ظلم کیے اور وہ تمام امور سرانجام دوں گا جو اللہ نے میرے لئے مقرر کیے ہیں اور کسی بھی ہوش مند کو اس میں شک نہیں ہوگا کہ یہ سب کچھ اللہ کی مرضی اور حکم کے مطابق ہے۔ اور اپنے ساتھیوں کو یہ بھی بتاؤ

کہ عظیم قرآن کی بہت سی آیات ایسے کئی واقعات کے بارے میں بتاتی ہیں، جو ظہور میں آ چکے ہیں اور ان واقعات کے بارے میں اشارے دیتی ہیں جو مستقبل میں پیش آئیں گے۔ نپولین نے اکثر اپنی تقریروں میں اپنے سیاسی مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے ایسے اسلامی الفاظ اور احادیث استعمال کیں جو مسلمانوں میں مروّج تھے۔ زیاد المرصفی کا کہنا ہے کہ باقی سبھی اعلانات میں قرآن و سنّت والے الفاظ کے استعمال سے اس تصور میں اضافہ ہوا کہ نپولین نہ صرف حضرت محمدؐ کا پیروکار ہے بلکہ امام مہدی کی طرح اس خطے کو فتح کرنا اس کا مقسوم ہے'' اس طرح نپولین نے اپنی تقریروں اور اعلانات میں احادیث اور قرآن کے بے شمار حوالے دے کر انھیں دل نشین بنا دیا۔ ان میں صرف نئی نئی اور روشن خیالی والی باتیں ہی نہیں تھیں بلکہ اب نپولین کو گویا دست غیبی سمجھا جانے لگا''

نپولین نے ضروری مشاورت کے لیے ایک راہ نما ٹیم یا ''ڈائرکٹری'' تشکیل دی جس میں فرانسیسی آفیسرز، قاہرہ کے مقامی زعماء اور مسلم علماء شامل تھے۔ اس نے مسجدوں، مدرسوں اور قرآنی تعلیمات والے مراکز کی سرپرستی کی۔ وہ مقامی اور اسلامی تہوار مناتا اور ان موقعوں پر ہونے والی تقاریب کی صدارت بھی کرتا تھا اس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ فرانسیسی فوج کے افسر و جوان قانونی طور پر اسلام قبول کر لیں البتہ بعض اسلامی رواج مثلاً ختنہ کو نہ اپنائیں، اور ان فوجیوں کی شراب نوشی پر بھی کوئی بندش نہ ہو۔ یوں بھی ہوا کہ فرانسیسی لوگوں اور مقامی مسلمان عورتوں کی اکثر باہم شادیاں ہوئیں۔ ان مردوں نے رسماً اسلام بھی قبول کیا۔ ایک سینئر فرانسیسی جنرل جاک مانو (Jacques Manou) نے ایک معزز مصری خاتون زبیدہ سے جس کا تعلق شریف خاندان سے تھا شادی کی۔ اس کا اسلامی نام ''عبداللہ'' رکھا گیا۔ یہ ۱۷۹۹ء کے موسم بہار کی بات ہے۔ یہ ایک عجیب سی بات ہو گئی تھی اور فرانس کے قانون ساز ادارے کے بااثر اراکین کے لیے جنھوں نے مصر پر حملے کی حمایت کی تھی قطعی ناقابل فہم تھی۔ یہی حال نپولین کی ''ڈائرکٹری'' کے ''جیکوبن'' ممبروں کا بھی تھا، وہ کٹر قسم کے کیتھولک تھے اور حکومت کے ناقد بھی۔ انھوں نے بھول کر بھی یہ نہ

سوچا تھا کہ کیتھولک عقیدے والا پرہیزگار سینئر فوجی افسر اسلامی لبادہ بھی پہن سکتا ہے۔

فرانسیسی افسران اسلام قبول کرتے رہے یہ تبدیلیِ مذہب کوئی اچانک عمل نہ تھا۔ ان میں بہت سے افراد ایسے تھے جن کا عقیدہ پہلے ہی عیسائیت سے اٹھ چکا تھا۔ انقلاب فرانس سے ذرا پہلے ایک تاریخ نگار بیرن ڈی ہولباخ نے اپنی کتاب ''عیسائیت سے پردہ اٹھتا ہے'' (۱۷۹۳ء صفحہ ۲۹۔۲۸) میں بڑی گستاخی سے حضرت عیسیٰؑ اور عیسائیت کے خلاف کھلم کھلا انداز میں لکھا۔

''ایک غریب یہودی یہ دعویٰ رکھتا تھا کہ حضرت داؤد کے اونچے گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ کافی عرصہ تک اپنے ہی ملک میں غیر معروف رہا۔ آخر ایک روز وہ گم نامی سے باہر آ گیا۔ ملکی آبادی کے ایک بڑے جاہل طبقے میں اُسے کامیابی ملی۔ ان لوگوں میں اُس نے اپنے عقائد کی تبلیغ کی اور انھیں یہ باور کرایا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے، پسے ہوئے لوگوں کا نجات دھندہ اور مسیحا ہے۔ اس کے مریدوں نے جو اُسی کی طرح فریبی تھے یا فریب کھائے ہوئے تھے اس کی روحانی طاقت کے خوب گُن گائے اور کہا کہ اپنے بے شمار معجزوں کی بدولت اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کا پیغام سچا ہے۔ تاہم یہ بات اس سے ممکن نہ ہو سکی کہ وہ یہودیوں کو رام کر لے وہ اس کے شاندار اور فائدہ بخش کاموں سے ہرگز متاثر نہ ہوئے بلکہ اسے ایک ذلت آمیز موت سے ہمکنار کیا۔ سو پورے یروشلم کے سامنے خدا کا بیٹا مارا گیا لیکن اس کے حواریوں کا کہنا تھا کہ اپنی موت کے تین دن بعد اس نے خفیہ طور پر پھر زندگی پائی اس حالت میں اپنی قوم کے لوگوں کو نظر نہیں آیا جن کو وہ نیا عقیدہ دینے اور جن کی زندگیوں کو روشن کرنے آیا تھا۔ حواریوں کے مطابق نئی زندگی پانے کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے ان کے ساتھ کچھ وقت گفتگو کی اور پھر آسمان کی طرف چلے گئے اور وہاں انھیں خدا کے مساوی باپ کا درجہ ملا۔ انھوں نے خدا کو بتایا کہ حواریوں نے ان کے دیے ہوئے قانون کی بے حد تعظیم اور اطاعت کی جب کہ (حضرت عیسیٰ کے چلے جانے کے بعد) حواریوں نے اوہام پرستی اور مکاری اختیار کی، من گھڑت اصول اور بعید العقل قواعد بنا لیے۔ اس طرح ان لوگوں نے آہستہ آہستہ ایک مسخ شدہ اور اَن مِل بے جوڑ نظام والا مذہب اپنا لیا جو اپنے بانی حضرت عیسیٰ کے نام پر ''عیسائیت'' کہلایا۔

انقلاب فرانس کے ساتھ ہی ایسا دور آیا کہ فرانسیسی عوام بالعموم اور خواص بالخصوص عیسائیت چھوڑنے لگے۔ ۱۷۸۹ء سے ۱۸۰۱ء تک تو یہ حالت تھی کہ کیتھولک چرچ، اس کی زمینیں، جائیدادیں، تعلیمی ادارے، خانقاہیں، عبادت خانے یہاں تک کہ بشپ اور پادری بھی انقلابیوں کا نشانہ بنے رہے۔ اس سے پہلے چرچ بہت طاقتور تھا، اس کی ملکیت میں تقریباً ہر وہ چیز تھی جو فرانس کے بادشاہ کی ملکیت میں نہ تھی۔ انقلاب کے بعد چرچ کی تمام مراعات ختم کر دی گئیں۔ اس کی تمام زمینیں خانقاہیں، سکول مکتب وغیرہ چھین لئے گئے تمام صلیبیں، گھنٹیاں، مورتیاں اور عیسائیت کے تمام نشانات بشمول مقدس مجسمے تک اٹھا لئے گئے۔ پھر ۲۱ اکتوبر ۱۷۹۳ء میں ایک قانون پاس کیا گیا جس کی رُو سے تمام چھوٹے بڑے پادریوں اور ان کے حمایتوں کو دیکھتے ہی قتل کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ اس نئے دَور سے پہلے تک یہ کیفیت تھی کہ پورے یورپ میں لفظ ''مذہب'' کا صرف ایک ہی مطلب تھا ''عیسائیت'' اپنی مختلف شاخوں اور گرجوں سمیت۔ لیکن اب اس مذہب ہی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا کام شروع ہو گیا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۰ نومبر ۱۷۹۳ء میں نوٹرے ڈیم کے سب سے بڑے گرجا کو ''مندر'' بنا کر اس میں ''عقل'' کی دیوی کا بت رکھ دیا گیا۔

ان حالات سے گزرے ہوئے بہت سے فوجی افسر و جوان جب سرزمین مصر پہنچے تو اس وقت وہ عیسائی کی بجائے منکرِ خدا یا دہریئے ہو چکے تھے۔ ایک معروف مصنف جوآں کول کے مطابق انقلاب فرانس کے دَور میں بہت سے فرانسیسیوں کا خیال تھا کہ اگر واقعی کوئی خدا ہے تو (نعوذ باللہ) وہ ایک کائناتی ''گھڑی ساز'' کی طرح ہے جس نے پوری کائنات کو متحرک رکھا ہوا ہے لیکن وہ اس کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ عیسائیت سے منحرف بہت سے فرانسیسی مشرق وسطیٰ کے عیسائیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے کہ ''وہ پس ماندہ ہیں اور پادری ان کے اعصاب پر سوار ہیں۔'' ایسے ہی اور بہت سے بگڑے ذہن والے فرانسیسی یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ کوئی بہت عظیم وجود'' نیچر کو اپنے چند قوانین پر چلا تو رہا ہے لیکن وہ اس کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ بہت سوں کا خیال تھا کہ ''عیسائی خدا'' کائنات کے معاملات میں مداخلت اس وقت

کرتا ہے جب پادری اسے ایسا کرنے کی ترغیب دیں اور یہ پادری زمین پر اس کے نمائندے ہیں۔ یہ سب دہریہ خیالات انقلاب فرانس کے بعد معاشرے میں پادریوں یا کلیسا کے جنونی اثرات کے خلاف ابھرے۔ تاہم اسی دور میں منکرین نبوت کا یہ بھی ماننا تھا کہ حضرت محمدؐ مارٹن لوتھر کنگ سے بہت پہلے آئے اور اس سے کہیں بہتر مصلح تھے۔ فرانسیسی سرکار مخالف لوگ ''جیکو بن'' بھی یہ یقین رکھتے تھے کہ ''محمڈن لوگ اپنی معقولیت کے معیار کے اعتبار سے عیسائیوں سے بہت آگے ہیں۔''

مذکورہ بالا ماحول میں نپولین کے لیے یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ اپنے فوجیوں کو اسلام قبول کرنے کے لیے کہے اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے عیسائیت پر تنقید کے سلسلے میں کچھ ممتاز فرانسیسی مفکرین نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اسلامی تعلیمات کی مکمل تفصیلات جانے بغیر یورپین/ یورپی/ مغربی لوگ کس حد تک ان تعلیمات کے قریب جا سکتے ہیں۔ انھوں نے پادریوں کے منفی اثرات کو ختم کرنے کے لیے چند اسلامی خیالات سے فائدہ بھی اٹھایا۔ فرانسیسیوں کے ذہن میں اسلام اور حضورؐ پاک کے بارے میں جو ایک واضح اور روشن تصور پیدا ہوا تھا، نپولین نے اسی تصور کو اپنایا۔ جب کہ اس کا ذاتی میلان طبع کافی حد تک ملحدانہ ہی تھا تاہم اس نے یہ جان لیا تھا کہ اس وقت مصر میں ازمنۂ وسطیٰ والی اسلامی تہذیب کا رنگ ہے اور ایک خدا کی عبادت کا تصور بھی۔ سو اس نے نہ صرف اس ماحول کو بلکہ اہم سیاسی مصلحت کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے اپنے فوجیوں کو اسلام قبول کرنے کے لیئے کہا۔ فرانسیسیوں نے اسلام کو ایک نئے مذہب کے طور پر نہیں بلکہ درحقیقت یہ سمجھ کر قبول کیا کہ وہ اپنی مذہبی سوچ اور تصور کے مطابق ایک درست عقیدہ اپنا رہے ہیں۔

تاہم بوناپارٹ کے قبول اسلام کے سلسلے میں مستثنیات بھی موجود تھیں کچھ فرانسیسیوں کے نزدیک اسلام قبول کرنے کا حکم قابل نفرین تھا اس لیے کہ یہ محض ایک ''ڈرامے'' کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ تاہم وہ خاموش رہے کہ جنرل علی بوناپارٹ جو انھیں اسلام کی طرف راغب کر رہا تھا بہت طاقت ور تھا کہیں ان کا ردِ عمل جان کر بھڑک ہی نہ اُٹھے۔ سو وہ جنرل موصوف کی اسلام والی حکمت عملی کو چپ چاپ دیکھتے رہے۔

قبول اسلام کے بعد بونا پارٹ کے رنگ ڈھنگ بدل گئے تھے اب وہ اسلامی لباس پہنتا تھا۔ اس نے اسلامی آرٹ اور سائنسی علوم کو فروغ دیا۔ فرانسیسی مذہبی اصولوں اور اسلامی شرعی قوانین کی باہمی یکسانیت پر زور دیتا تھا۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے زمانے سے تعلق رکھنے والے عباسی خلفاء کی تعریف کیا کرتا تھا کہ انھوں نے آرٹ اور سائنسی علوم کی بھرپور سرپرستی کی، یونانی اور لاطینی زبانوں سے عربی میں ترجمے کروائے وہ بالخصوص کہا کرتا تھا کہ ان ترجموں سے اہل یورپ کو بھی فائدہ پہنچا اور وہ یقیناً عرب۔ یونانی علوم کا ورثہ پا کر احسان مند ہیں۔ ایک بار مصری علماء نے شریف مکہ/ مدینہ کو اپنے خط میں بونا پارٹ کے بارے میں لکھا:

''اس نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ وہ خدا کی وحدانیت سے آگہی رکھتا ہے اور اس بات کا بھی کہ فرانسیسی لوگ حضورؐ پاک اور قرآن مجید کا احترام کرتے ہیں اور اسلام کو ایک بہترین مذہب تصور کرتے ہیں۔ فرانسیسیوں نے مالٹا میں نظر بند مسلمان قیدیوں کو رہا کر کے اسلام سے اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔۔ ان مسلمانوں نے وینس شہر میں گرجا گھروں اور صلیبوں کو تباہ کر دیا تھا۔ ان کا مقصد پوپ سے بدلہ لینا تھا کہ جس نے ایک اہم مذہبی فریضے کے طور پر عیسائیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو قتل کر دیں''

تاہم مصریوں کے نزدیک بونا پارٹ کی دیگر پالیسیوں کی نسبت اس کا کھلم کھلا قبول اسلام زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ نپولین بونا پارٹ کی قبول اسلام والی خبروں کو فرانس اور انگلستان کے بڑے اخباروں نے خوب نمایاں طور پر شائع کیا۔ خصوصاً برطانوی اخباروں نے آٹھ ایڈیشنوں میں جنرل بونا پارٹ کے اصل خطوط کی نقول شائع کیں اور مرچ مصالحہ لگا کر یہ لکھا کہ عیسائیت کے خلاف مصر میں ''فرانس۔ عثمانیہ سازش'' نے جنم لیا ہے۔ نپولین کے قبول اسلام کے اعلان کے بارے میں یہ تشہیر کی گئی کہ یہ اعلان فرانس کی طرف سے ''اسلام نوازی'' کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے اور برطانیہ کے قومی مفادات کو ملک میں اور ملک سے باہر زک پہنچانے کی ایک کھلی سازش ہے اسلامی مصر اور جمہوریہ فرانس کے اس ''اتحاد'' نے انگریزوں کے اسلام دشمن جنون کو اور

ہوا دی اور برطانیہ میں بڑے پیانے پر اسلام کے خلاف مزاحمتی مواد لکھا جانے لگا۔ ساری تان اس بات پر ٹوٹی کہ حضورؐ پاک کہ جنہیں بونا پارٹ اپنے لیے ایک رول ماڈل سمجھتا تھا کی ایک نئی سوانح حیات لکھی گئی جو ۱۷۹۹ء میں لندن سے شائع ہوئی اس میں ان کی ذاتِ اقدس پر کیچڑ اچھالا گیا۔ کم وقت میں مختلف زبانوں میں اس کے بہت سے ایڈیشن چھاپے گئے۔ جنھیں تیزی سے فوری طور پر پورے یورپ میں پھیلا دیا گیا۔ انگریز بادشاہ اور چرچ آف انگلینڈ نے بہت جوش وخروش سے اس سارے کام میں حصہ لیا۔ نمایاں طور پر ظاہر ہوا کہ برطانیہ اور اس کے یورپی حواری کتنی شدت اور منظم انداز میں اسلام دشمنی کر رہے تھے۔

بونا پورٹ کا اسلام لانا یورپ والوں کے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ یورپی دانش ور اور اہلِ قلم غصے سے پیچ وتاب کھا رہے تھے۔ ان کے قلم حضورؐ پاک کی ذات اقدس اور مذہب اسلام کے خلاف زہر اُگل رہے تھے۔ ایک فرانسیسی مصنف ہمفرے پرائیڈیو (Humphrey Prideux) نے حضورؐ پاک کی ایک نام نہاد سوانح بہ عنوان 'حیات محمدؐ' لکھی جس کے صفحۂ اول سے لے کر آخری صفحے تک سطر سطر میں زہر بھرا تھا۔ ہمفرے کا دعویٰ تھا کہ فرانس اور انگلینڈ میں سینکڑوں/ ہزاروں ''محمڈن'' لوگ چھپے بیٹھے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے یورپ کو کس طرح غیر ثقافتی خیالات کی یلغار سے آلودہ کیا جا رہا ہے۔ بونا پارٹ کی اسلام نواز پالیسیوں پر اُسے برا بھلا کہتے ہوئے ہمفرے پرائیڈیو نے اہلِ برطانیہ کو اکسایا کہ وہ ان نام نہاد ''روشن خیال'' لوگوں کی خبر لیں جو بونا پارٹ کی طرح اسلام پسند ہیں اور خود ان کی اپنی صفوں میں چھپے بیٹھے ہیں (یہاں اس نے کئی اور افراد کے نام بھی لکھے) اس کا کہنا تھا کہ دراصل یہی لوگ ''مسلم دنیا'' سے گھناؤنی ''سیاسی روحانیت'' فرانس اور انگلینڈ میں لانے کے ذمہ دار ہیں۔ ''عیسائی یورپ کی آسمانی سچائی والی شہنشاہیت اور کلیسائی اختیارات آج اسلامی نظریات کی وجہ سے انتشار کی کیفیت میں ہیں۔ یہ نظریات عیسائی یورپ کے لیے قطعی اجنبی ہیں''۔ ہمفرے کے مطابق نپولین کے قبول اسلام کے مفروضے کے بعد عوام کو اس خیال نے لرزا کر رکھ دیا کہ کوئی

اسلامی سازش یورپ کو گھیر رہی ہے۔ رہا نپولین تو اسلام اور آنحضرت محمدؐ کے نام اب اس کی مکمل پہچان بن چکے ہیں۔

جیسا کہ اوپر کہیں یہ کہا جا چکا ہے کچھ یورپین دانش وروں کا خیال تھا کہ نپولین کا اسلامی لبادہ بنیادی طور پر اُس کے ''سیاسی ایجنڈے'' کا حصہ تھا۔ مصر میں داخلے کے بعد اب وہ مصریوں کے مذہبی جذبات سے کھیل رہا تھا تا کہ ان کے دل جیت لے اور ان کی مزاحمت سے بچ جائے۔ لیکن ایک مصنف جوآن کول (Juan Cole) ایک دوسری بات کہتا ہے اور وہ یہ کہ ''اگرچہ بونا پارٹ نے تو اسلام سرے سے قبول ہی نہیں کیا وہ کبھی مسجد نہیں گیا اور کبھی مسلمانوں کی طرح عبادت نہیں کی، سو اس کے اسلام لانے کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے بیکار بات ہے۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ وہ ایک ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہتا ہے کہ جس کے ذریعے اُن فرانسیسیوں کو مسلمان قرار دلوا دیا جائے جو خدا کو مانتے اور وحی سے انکار کرتے ہیں اور یہ فراستِ حکمرانی کی بات ہے۔ یہ حکمت عملی نپولین کے اس ابتدائی عربی خطاب کا حصہ ہے جس میں اس نے یہ کہا تھا کہ فرانسیسی فوج کسی خاص مذہب کی پیروکار نہیں لیکن اب تثلیث کو چھوڑ کر ''مسلم'' ہو چکی ہے، ''(مسلم'' چھوٹے ایم (m) کے ساتھ (حقیقت یہ ہے کہ ''اسلام'' نپولین کے لیے اتنا اہم نہیں تھا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں وہ جائز (Legitimacy) یعنی قانونی لحاظ سے درست کو زیادہ ضروری سمجھتا تھا کہ اس کے بغیر فرانسیسی زیادہ عرصہ مصر پر اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ البتہ خود کو ایک 'عجیب' طرح کا مسلمان کہلوانا ایک ایسی آسان سی بات تھی جو بونا پارٹ کو پسند تھی۔

نپولین کی زندگی کے آخری سالوں کے دوران اس کے خیالات کا باقاعدہ مطالعہ کیا جائے تو یہ ثابت ہو جائیگا کہ وہ حضورؐ پاک اور دین اسلام کا ایک سچا مداح تھا معروف مصنف جوآن کول ایک جگہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ تمام کہی گئی منفی باتوں کے برعکس، حضورؐ پاک کے لیے نپولین کی مدحت اصلی تھی۔ ۱۷۹۹ء میں جب وہ ناکام ہو کر مصر سے واپس فرانس جا رہا تھا تو اس وقت بھی اس نے اس موضوع پر اپنے مثبت جذبات کا اظہار کیا تھا اس نے مصر میں متعین فرانسیسی منتظموں کو یہ

خصوصی ہدایت دی کہ وہ قرآن مجید اور حضورؐ پاک کے لیے بے حد عزت و محبت سے کام لیں اور
"مقامی مسلمانوں کو بالالتزام آگاہ کریں کہ قرآن مجید اور حضورؐ پاک کے لیے ہمارے جذبات کیا
ہیں۔ خیال رہے کہ منھ سے نکلا ایک غیر ذمہ دارنہ لفظ ہماری برسوں کی محنت ضائع کر دے گا۔ جب
وہ بحرالکاہل کے چھوٹے سے جزیرے سے سینٹ ہلینا میں اسیری کے دن گزار رہا تھا، تب بھی
حضورؐ پاک کے لئے اس کے جذبات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا حالانکہ اب نہ ہی اس کی رہائی اور نہ
ہی کوئی سیاسی طاقت یا دنیاوی فائدہ حاصل کرنے کی کوئی امید باقی تھی۔ لیکن وہ اب بھی پختہ یقین
رکھتا تھا کہ حضورؐ پاک کا تصورِ خدا بالکل درست و عظیم تھا۔ آپؐ دنیا والوں کے لیے ایک مثالی
قانون ساز تھے اسیری کے دوران ایک بار اس نے کہا" دنیا میں حضرت عیسیٰؑ کی آمد کے سات
صدی بعد جب حضرت محمد صلعم تشریف لائے تو اس وقت عرب میں بت پرستی کا رواج تھا۔ آپؐ
نے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت موسیٰؑ، اور حضرت عیسیٰؑ کالایا ہوا الوہی وحدانیت والا
سلسلہ قائم رکھا۔ آریائی اور دیگر اقوام نے مشرق کے مختلف خطوں میں افراتفری پھیلا رکھی تھی۔ ان
کے سوال تھے کہ وہ آسمانی باپ اور اس کا بیٹا کیسا ہے؟ روحِ مقدس کیا چیز ہے؟ حضرت محمدؐ نے
تصریح کے ساتھ اعلان کیا کہ خدا ایک ہے، نہ اس کو کسی نے جنا اور نہ وہ کسی بیٹے کا باپ ہے اور یہ
کہ تثلیث بت پرستی کو جنم دیتی ہے۔ ایک بار نپولین نے قرآن پاک کے ٹائیٹل پر لکھا: "اللہ کے
سوا کوئی معبود نہیں"

فرانسیسی جنرل بیرن گوئیداد (Baron Guidaud) کے مطابق ایک بار نپولین نے
کہا" حضرت محمدؐ اس وقت دنیا میں تشریف لائے جب لوگوں کی پیاسی روحیں خدا کی وحدانیت کا
اقرار کرنے کے لیے ترس رہی تھیں۔ ان ہی دنوں میں عرب میں برپا ہونے والی جنگوں نے لوگوں
کو جھنجھوڑا۔ جنگ بہادروں کی ہمت آزماتی ہے۔ جنگ بدر میں حضورؐ پاک ہیرو بن کر سامنے
آئے۔ آدمی دیکھنے میں تو ایک آدمی ہی ہوتا ہے لیکن اس میں بڑے سے بڑا کام کرنے کی
صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ آتش گیر چیزوں کے لیے صرف ایک چنگاری ہی کافی ہوتی ہے۔ میں آج

کے دَور کے عرب کی بات نہیں کرتا لیکن اپنے دَور میں حضورؐ پاک کا لایا ہوا دین صرف دس سال کے عرصے میں معلوم دنیا کے نصف حصے میں پھیل گیا تھا۔ جب کہ عیسائیت کو مضبوطی سے قدم جمانے میں تین سو برس کا عرصہ لگا تھا۔ میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے جب میں نے آغاز کیا تو اپنی ایمپائر قائم کرنے کے لیے تمام ضروری اسباب موجود تھے۔ یورپ والے طوائف الملوکی سے تھک چکے تھے اور اس سلسلے کا خاتمہ چاہتے تھے۔

نپولین پیدائشی کیتھولک تھا لیکن وقت کے ساتھ اس کی سوچ بدلتی گئی۔ وہ حضرت عیسیٰ کی ''خداوند'' والی حیثیت اور تثلیث سے انکاری ہو گیا۔ اس سلسلے میں اس کا یہ قول سامنے آیا ''میں نے دنیا کے تین مذاہب کے بارے میں تیس (۳۰) صفحات لکھوائے۔ میں نے بائبل کا بھی مطالعہ کیا۔۔۔ کرسچئن مذہب انسانی آنکھوں کو بہت چمک دمک دکھاتا ہے۔۔۔ لیکن تثلیث ایسا اصول ذہن میں ابتری پیدا کرتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ مذہب معاشرے میں امن و سلامتی لاتا ہے۔ بندوں کو بندوں سے جوڑ کر رکھتا اور ان کے باہمی رشتوں میں مضبوطی پیدا کرتا ہے۔ نپولین کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پادریوں کی ''حاکمیت'' کے خلاف تھا۔ تمام مذاہب کا احترام اس کے دل میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جتنے بھی ممالک فتح کیے وہاں رائج کسی بھی مذہب کو نہیں چھیڑا۔ اس میں کیتھولک عقیدہ بھی شامل تھا لیکن وہ دل سے عیسائیت کی طرف راغب نہیں تھا۔ تاہم وہ اسلام کی پیش کردہ الوہی وحدانیت کا احترام کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسلام ہی دنیا کا بہترین مذہب ہے۔ عیسائی مذہب میں ایسی باتیں کافی زیادہ ہیں جن پر یقین کرنا مشکل ہوتا ہے جب کہ اسلام میں ''ایک خدا کی خدائی پر یقین'' عقل سے قرین ہے۔ اس عقیدے سے بھاری بھرکم رسومات ختم ہو جاتی ہیں مصر میں اکثر مشائخ نے یہ سوال کر کے مجھے بہت زچ کیا۔ ''کہ بتایئے'' ''خدا کا بیٹا'' سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے، اگر ہم کہیں کہ ''خدا تین ہیں'' تو ہم کافر ہو جائیں گے۔ نپولین اسلامی اخلاقیات کا بہت معترف تھا۔ جسے وہ معاشروں کی بھلائی کے لیے بہت ضروری خیال کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا ''آدمی خواہ بے دین ہو لیکن

اسے اخلاق سے متصف ہونا چاہیئے۔ معاشرے کی خاطر'' اس کے اسلام پسند ہونے کی دو وجوہات تھیں۔ صاف اور سیدھا خدائے واحد والا عقیدہ اور عمدہ اخلاق۔ وہ حضورؐ پاک کی ذات اقدس کو ایک تاریخی معجزہ قرار دیتا ہے۔ آپؐ قریباً دس سال کے مختصر سے عرصے میں حیران کن فتوحات کے علاوہ ہمہ گیر معاشرتی تبدیلیاں لائے۔ اسی لیے وہ آپ کو ایک مثالی مدبر اور ایک جری فاتح مانتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سپاہیوں میں کیسے ولولہ پیدا کیا جاتا ہے۔

نپولین اسلامی شریعت کے کئی پہلوؤں سے اتنا متاثر تھا کہ انھیں ''نپولین کوڈ'' میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ ایک برطانوی مورخ کے مطابق نپولین کئی اسلامی قوانین پر اعتراضات کو رد کرتے ہوئے ان کی حمائت کرتا تھا۔ مثلاً ایک سے زائد شادی والا قانون۔ اس کا کہنا تھا کہ ایشیا اور افریقہ میں مختلف رنگ ونسل کے لوگ رہتے ہیں، ان کے لیے کثیر الازدواجی والا قانون درست ہے تا کہ وہ آپس میں اس طرح گھل مل جائیں کہ سفید لوگ کالوں پر اور کالے لوگ سفید لوگوں پر کوئی نسلی زیادتی نہ کریں۔ یہ قانون رنگ ونسل کا امتیاز ختم کرتا ہے اور یوں مختلف رنگ والوں کو باہم مل بیٹھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اگرچہ مشرقی خطوں میں رنگ کا کوئی امتیاز نہیں ہے تاہم اس رواج کو پختہ کرنے لیے چار بیویاں کافی سمجھی گئیں۔ ہم جب مناسب سمجھیں گے اپنی زیر قبضہ کالونیوں میں کالے لوگوں کو پورا موقع دیں گے تا کہ رنگ والا تعصب ختم ہو جائے۔ اس سلسلے میں مقننہ کثیر الازدواجی کی اجازت دے گا۔

فرانس میں اسلام نے ایک خاص رول ادا کیا۔ اس کی بتائی ہوئی مثالوں، اصولوں اور روایات کو عیسائی عقائدوروایات کے مقابلے میں بہتر سمجھا گیا۔ اسلامی جمہوریت نے فرانس میں بلاشرکت غیرے والے شاہی راج کے تسلط اور چرچ کی ظالمانہ پالیسیوں کو مسمار کر کے غیر مطلق العنان آزادی اور عوامی اختیار لانے کی راہ ہموار کی۔ اس سلسلے میں عوامی مقامات پر کافی ہاؤسوں اور مہمان خانوں میں چلنے والے بحث مباحثے بالآخر انقلاب فرانس کی بنیاد بنے۔ لیکن بوناپارٹ نے ان بحث مباحثوں کے لیے کافی ہاؤسوں کی بجائے ایک بڑا ''میدان'' منتخب کیا اس طرح کہ

جب ۱۷۹۸ء کے موسم گرما میں کوئی بتیس (۳۲) ہزار فرانسیسی فوج مصر میں جا اتری تو وہاں اسے اسلام کو قریب سے دیکھنے، جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ یوں صلیبی جنگوں کے بعد پہلی مرتبہ فرانسیسی مداخلت اور اثرات کے تحت وسیع پیمانے پر اسلامی اور مغربی یورپی ثقافتوں کے مابین تقابل و مسابقت کا ماحول پیدا ہوا۔

حوالہ جات

1 Ziad Elmarsafy, The Enlightenment Qur'an: The Politics of Translation and Construction of Islam, Oxford: Oneworld, 2009,p.143 Quoted from Ziad, Ibid, p.143

2 Ziad, Ibid, p.146

3 Ziad, Ibid, p.147

4 Ziad, Ibid, p.148

5 Ziad, Ibid, .150

6 AugusteDieudonne comte de Las Cases, Memorial de Sainte Helene: Journal of the private life and conversations of the emperor Napoleon at Saint Helena, Volume 1, Part 1 -Volume 2, Part 4, Wells and Lilly, 1823,p. 46

7 Las Cases, Memorial de Sainte Helene, p. 46;

8 General Baron Gourgaud, Talks with Napoleon at St. Helene, translated by Elizabeth Wormeley Latimer, A.C McClurge and Co., 1903, p.255-256

9 Talks of Napoleon, p. 262

10 The Project Gutenberg EBook of Memoirs of Napoleon Bonaparte, Complete by Louis Antoine Fauvelet de Bourrienne,

11 Talks of Napoleon, p. 70

12 John Tolan, "European accounts of Muhammad's life" in The Cambridge Companion to Muhammad edited by Jonathan E. Brockopp, Cambridge: University Press, 2010, p. 243

13 Humberto Garcia, Islam and the English Enlightenment, Baltimore: John Hopkins University Press, 2012, p. 127

14 Garcia, Ibid, p. 127

15 See Garcia, Ibid, p. 138

16 Cole, Ibid, p. 130

17 Garcia, Ibid, 138

18 Cole, Ibid, p. 130

19 See Ziad, Ibid, p. 154

20 Ziad, Ibid, p. 155

21 Ziad, Ibid, p. 154

22 Ziad, Ibid, p. 156

23 Garcoa. Os;a,. P.139

24 Garcia, Islam, p. 13924 Cole, Ibid, p. 135

25 Baron d "Holbach, Christianity Unveiled: being and Examination of the Principles and Effects of the Christian Religion, New York: Robertson and Cowan, 1793, p. 28-29; see it athttp;/books.google.com/books?id=T AAAAAYAAj&q= accumulating+superstitio... See Robert R. Palmer, Catholics and Unbelievers in Eighteenth-Century France (Princeton, N.J., 1939;

25 John Mcmanners, Death and the Enlightenment: Changing Attitudes to Death in Eighteenth-Century France (Oxford, 1981); and French Ecclesiastical Society under the Ancien Regime: A Study of Angers in the Eighteenth Century (Manchester, 1960)

26 John McManners, The French Revolution and the Church. Westport, Conn.: Greenwood Press, 1982

27 Juan Cole, Napoleon's Egypt: Invading the Middle East, New York: Palgrave Macmillan, 2007, p. 31-32

28 Garcia, Ibid, p. 7

29 Garcia, Ibid, p. 9

30 Cole, Ibid, p. 141

31 See Cole, Ibid, p. 136ff

32 Garcia, Ibid, p. 141

33 Cole, Ibid, p. 131

34 Garcia, Ibid, p. 141

35 Garcia, Ibid, p. 141

36 Garcia, Ibid, p. 141

37 Garcia, Ibid, p. 142

38 Humphrey Prideaux, The True Nature of Impostor Fully Displayed in the Life of Mahomet, London: 1967, p. 182

39 Garcia, Ibid, p. 143

40 Cole, Ibid, p. 294

41 Cole, Ibid, p. 294

42 Tolan in Cambridge Companion to Muhammad, p. 243-244 Ibid, p. 244

43 Tolan, Cambridge Companion to Muhammad, p. 244 Ibid, p. 244

44 Talks, of Napoleon, p. 68

45 Talks, of Napoleon, p. 68

46 Talks, of Napoleon, p. 276

47 Talks, of Napoleon, p. 272

48 Talks, p. 277

49 Talks, of Napoleon, p. 271

50 Talks, of Napoleon, p. 271

51 Talks, of Napoleon, p. 271

52 Talks, p. 272

53 Talks, p. 274

54 Talks, p. 279

55 Talks, p. 280

56 Talks, p. 280

57 Tolan in Cambridge Companion to Muhammad, p. 245

58 Tolan, Ibid, p. 245

59 Tolan, Ibid, p. 245

60 Cole, Ibid, p. 142

ڈاکٹر شیر زمان ☆

بیاد ڈاکٹر محمد معز الدین (مرحوم و مغفور)

جو بادہ کش تھے پُرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں   کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

ڈاکٹر معز الدین مرحوم و مغفور تدریس و تربیت، علم و تعلّم، تعلیم و تحقیق، دانش وری و دانش جوئی، سخن شناسی و سخن پروری، حق پرستی و حق گوئی، محبت و شفقت، ایثار و انکسار حسن گفتار و عظمت کردار کی حسین و جمیل اور دل آویز و دل افروز روایتوں کے اساتذہ و ادباء کے اُس محترم و موقر حلقہ کے شب چراغ تھے جن سے ہماری جمعیت علم و ادب کی صفیں برابر خالی ہوتی جا رہی ہیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور سرسیّد کالج راولپنڈی جیسے اداروں کی برسوں سربراہی، ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی اور کیمبرج یونیورسٹی کی اقبال چیئر جیسی ذی وقار مسانید کی رونق افزائی ان کے علمی سفر کے چند نشان منزل ہیں اور اس ناچیز جیسے بیسیوں خوشہ چینوں کے سینے ان کی اخلاقی عظمتوں کے امین ہیں۔

جلالت علمی کے ساتھ ان کی انسانی عظمت کے براہ راست مشاہدہ کا ایک موقع اس وقت ملا جب وہ سقوط مشرقی پاکستان کے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے اور کچھ عرصہ بعد ان کا تقرر اقبال اکیڈمی پاکستان کے ڈائریکٹر کے طور پر ہوا۔ اس وقت اکیڈمی کا دفتر کراچی میں تھا اور جناب ایس اے واحد مرحوم اس کے ایک طرح مطلق العنان کارپرداز تھے۔ طبائع کے اختلاف کے باوصف ڈاکٹر صاحب نے وضعداری رواداری اور بردباری کے ساتھ علمی خدمت و محبت کی اقدار کو جس توازن و وقار کے ساتھ نبھایا وہ انہی کا حصہ تھا۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

☆ سابق وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد و چیرمین اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان

وزارت تعلیم میں وفاقی علمی و تحقیقی اداروں (Learned Bodies) کے شعبہ سے متعلق ہونے کے باعث راقم الحروف کا اکیڈمی کے امور سے براہ راست رابطہ رہتا تھا اور یہیں سے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رشتۂ مودّت قائم ہوا جو وقت گزرنے کے ساتھ پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ یہ تعلق اب بھی اس ناچیز کے لیے بے بہا سرمایۂ افتخار و اعتزاز ہے۔

حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے فکر و فن پر ان کی سی عمیق نظر رکھنے والے اہل علم ہمارے ہاں شاذ ہی ہوں گے۔ اردو فارسی زبان و ادب، صرف و نحو، عروض، نقد علمی و ادبی ہیں ان کے علم کی گہرائی و گیرائی ایسا اثاثہ تھا جس سے ہماری نسل نو کا اعراض و اغماض ہماری تہذیب و ثقافت اور روایت علمی کو اس کی اساس اور شناخت سے مسلسل دور کرتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تدریسی و تحقیقی خدمات اور اسلامی اقدار سے ان کی محکم وابستگی میں ہمارے جواں سال رفقاء اور اساتذہ و ادباء کے لیے سب سے اہم پیغام یہ ہے کہ غالب و اقبال جیسے اساطین و اکابر کی طرح خداداد علمی صلاحیتوں اور ادبی ملکہ کو اپنی تہذیبی و ثقافتی میراث علمی سے محکم و مربوط کیے بغیر میادینِ فکر و فن میں کسی پائدار اور لائق شمار منارِ امتیاز کی تعمیر ممکن نہیں۔

ریڈیائی انٹرویو

میزبان: محمد صادق

پروفیسر ڈاکٹر محمد معز الدینؒ

(حیاتِ مستعار کے آئینہ میں)

محمد صادق: بہت ہی محترم شخصیت دانشور ڈاکٹر محمد معز الدین، ماہر تعلیم اور اسکالر ہیں۔ اقبالیات کے ماہر نیشنل ہجرہ کونسل کے سیکریٹری ہیں، سرسید کالج کے پرنسپل ہیں۔

جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے خود بتایا۔ ڈاکٹر صاحب نے دو ایم اے کیے۔ اُردو اور فارسی میں جن میں یہ فرسٹ کلاس فرسٹ رہے۔ دونوں میں گولڈ میڈل لیے۔ انہوں نے پی ایچ ڈی بھی کی قائم چاند پوری پر ان کا مقالہ ہے۔

ڈاکٹر محمد معز الدین: صادق صاحب آپ کا شکریہ کہ ان الفاظ میں میرا تعارف کرایا۔ میری ابتدائی زندگی بہار کے ایک گاؤں سے وابستہ ہے جسے بازید پور کہتے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ بایزید بسطامیؒ کے مبارک نام پر بسا ہوگا جو بگڑ کر بازید پور ہوگیا۔ یہ پٹنے سے مغرب کی طرف آٹھ میل کے فاصلے پر تھا میری ابتدائی تعلیم مقامی اسکول بہتہ (Bihta) میں ہوئی۔ وہیں سے میں نے میٹرک کیا۔ الحمد اللہ طالب علمی کے زمانے میں میں اچھا طالبِ علم تھا۔ اساتذہ بھی مجھے پسند کرتے تھے۔ ماحول بھی اچھا تھا اس وقت ہندو مسلمانوں میں ایسی تفریق نہیں تھی۔ میرے ساتھ کچھ کائیستھ حضرات تھے۔ ہندو مسلمان خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد میں شہر میں آگیا۔ یہاں ہاسٹل کی زندگی رہی یہاں سے میں نے بی۔ اے آنرز اور اُردو میں ایم اے کیا میں فرسٹ کلاس فرسٹ آیا اور گولڈ میڈل لیا۔ میری تعلیمی کارکردگی پر پٹنہ کالج میں جہاں سے میں نے پڑھا تھا میرا تقرر ہوگیا۔ جو اُس وقت کلاس ٹو گزٹیڈ پوسٹ ہوتی تھی۔

پہلے میں نے انگلش آنرز میں داخلہ لیا تھا۔ میری انگلش اچھی تھی اور اس سے تھوڑی قربت

بھی تھی۔ مگر اس وقت پروفیسر کلیم الدین احمد جن کا آج مقام ہے وہ انگریزی پڑھاتے تھے۔ جنگ کا زمانہ تھا وہ ریڈیو دلّی میں چلے گئے۔ تو میں نے کہا کہ کلیم صاحب کی وجہ سے تو میں نے انگلش ڈیپارٹمنٹ کی طرف توجہ کی تھی۔ بڑی کوششوں کے بعد بلکہ اساتذہ کی مخالفت کے باوجود میر اسپیشل امتحان لیا گیا اور مجھے اُردو میں آنرز کی اجازت ملی۔ الحمدللہ اس میں بھی میں فرسٹ کلاس فرسٹ رہا۔ اسی طرح ایم اے میں یونیورسٹی میں اوّل آیا اور گولڈ میڈل ملا۔

۱۹۴۶ء میں بہار کے مختلف علاقوں میں ہم لوگ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے تقریر کرتے تھے۔ قائداعظمؒ ۱۹۳۸ء میں پٹنہ گئے تھے میں اس وقت اسکول میں تھا۔ میری تمنا تھی کہ ایک جھلک دیکھتا مگر ان دنوں میں بیمار تھا۔ میرے بڑے بھائی گئے اور انہوں نے آنکھوں دیکھا حال بتایا۔

قائداعظیمؒ نے پٹنہ میں علاّمہ اقبال اور مصطفےٰ کمال پاشا 'ترکی' کا بھی ذکر کیا۔ جو حال ہی میں رحلت فرما گئے تھے۔ میں نے اخبارات میں یہ خبریں پڑھیں مگر دیکھنے کی حسرت رہی۔

اس کے بعد بہار میں مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا جذبۂ نفرت ابھر کر سامنے آ گیا۔ ۱۹۴۶ء میں بہت ہنگامہ ہوا جسے Great Killing of Bihar کہتے ہیں۔ جس پر ایک کتاب بیرسٹر عزیز صاحب کی ہے جو قائداعظم کے میزبان تھے۔ اس زمانے میں ہم لوگ زخمی عورتوں اور بچوں کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو گئے تھے۔ مجھ کو یاد ہے ایک گاؤں سے بہار کے نواح میں جس کا نام تلہاڑہ تھا۔ تین دن تک جب وہ جلتا رہا تو پنڈت جواہر لال نہرو نے ہوائی جہاز سے دورہ کیا اور انہوں نے کہا "میں آزادی اس لیے نہیں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کا آپ لوگ بے دریغ قتل کریں" مجھ کو وہ منظر بھی یاد ہے جب پٹنہ سینٹ ہال میں یہ بات کہی تو ہندو لڑکوں نے ان کا سلک کا کرتہ جو وہ پہنے ہوئے تھے پھاڑ دیا اور کہا "آپ مسلمانوں کی تائید کرنے آئے ہیں؟" اور جوتوں کے ہار سے پذیرائی کی۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ہمارا دوقومی نظریہ کتنا مضبوط ہے کہ ہندو قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔

اس زمانے میں جب میں ایم اے کے فائنل ایئر میں تھا۔ مجھ کو یاد ہے مولانا ابوالکلام کانووکیشن میں شرکت کے لیے ۱۹۴۸ مین پٹنہ تشریف لائے۔ اس وقت میں ایم اے اردو کے پریویس میں تھا لیکن میں بزم ادب کا منتخب کردہ سکریٹری بھی تھا۔ میں نے مولانا ابوالکلام کو دتی تار دیا کہ آپ میری بزم میں بھی خطاب کریں۔ جواب نہیں ملا۔ مگر میرے اساتذہ نے کہا کہ "اگر وہ آگئے تو اس کے لیے انتظام تو کرنا ہوگا"۔ تو ہم دو تین طالبعلم ان کے یہاں گئے جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے سکریٹری مشتاق صاحب نے فرمایا "وہ وقت تو نہیں دیں گے مگر تم لوگ طالب علم ہو یہاں بیٹھ جاؤ وہ غسل فرما رہے ہیں" وہ نکلے تو میں نے کہا "میرا نام معزالدین ہے میں سکریٹری ہوں بزم ادب پٹنہ کالج کا۔ میں نے آپ کو ٹیلیگرام دیا تھا" انہوں نے کہا "ٹیلیگرام کا جواب میرے سکریٹری نے دے دیا ہوگا لیکن میرا اصول ہے کہ میں ایک کام کے لیے جاؤں تو سرِ راہ یہ بھی کر دو وہ بھی کر دو نہیں کرتا"۔ میں نے برجستہ ان سے کہا "حضور آپ کا یہ اصول تو ٹوٹ چکا" انہوں نے خشمگیں ہو کر کہا "کیا مطلب ہے؟" میں نے کہا "یہ سرچ لائٹ (اخبار) رکھا ہوا ہے اس میں مہامایا پرشاد جو کانگریس کے صدر ہیں انہوں نے بیان دیا ہے کہ کل آپ پٹنہ لان میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے خطاب کریں گے۔" مولانا بالکل خاموش ہو گئے میری طرف دیکھا اور بیٹھ گئے۔ وہ ٹالنا چاہتے تھے کہ کسی طرح جان چھڑاؤ۔ اس کے بعد انہوں نے تقریر کی کہ "اردو زبان ایسی ہے ویسی ہے یہ تو کسی کی زبان نہیں ہے۔ یہ تو عوام کی زبان بن کر ابھری ہے۔ اسے کوئی نہیں دبا سکتا۔ آپ پھر خاص طور پر بلائینگے تو میرا وعدہ ہے آؤں گا۔" اس وقت وہ شعبۂ تعلیم کے منسٹر تھے۔ ۱۹۴۸ء میں اس کے بعد یہ ہوا کہ وہ کانوکیشن ایڈریس کرنے آئے تو اس وقت کے گورنر جے رام داس دولت رام تھے ان کی کتاب Bihar Throught Centuries دو جلدوں میں تھی۔ انہوں نے مولانا آزاد کا تعارف کرایا اور کہا "ان کو انگریزی پر بھی اتنی قدرت حاصل ہے کہ اسمبلی میں جب کوئی بات ہوتی ہے جواہر لال نہرو کسی لفظ کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو مولانا بتاتے ہیں اور نگینہ کی طرح وہ لفظ وہاں پر فٹ ہو جاتا ہے۔ پھر مولانا نے

وہاں تقریر کی۔ رام داس دولت رام نے کہا ''یہ فرنچ بھی جانتے ہیں اور آج کل فرانسیسی کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ ہیں''۔ مولانا نے اپنی تقریر میں ایک بات یہ بھی کہی کہ ''ہندوستان کا ایک مسئلہ زبان کا بھی ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ زبان یہ رائج کریں (ہندی کا نام نہیں لیا) انگریزی کی جگہ کوئی زبان نہیں لے سکتی ہے جب تک کہ یہ نہ ہو کہ ایک نے کرسی چھوڑی دوسرے نے سنبھال لی۔ میں پوچھتا ہوں کہ ہے ہندوستان میں کوئی ایسی زبان ہے جو جگہ لے سکتی ہے؟'' ایک لڑکے نے حاضرین سے کہہ دیا ''ہندی'' مجھے یاد ہے مولانا کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور انہوں نے میز پر مکا مار کر کہا ''نہیں ہرگز نہیں'' اب ہم ڈرے کہ وہاں بلوہ ہو جائے گا۔ لیکن مولانا کا رعب ایسا تھا کہ Pin Drop خاموشی چھا گئی۔ پھر انہوں نے بتایا کہ ''ابھی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو انگلش کی جگہ لے سکے۔''

'غبارِ خاطر' آپ کی مشہور کتاب ہے۔ مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن حکیم کا ترجمہ ہے جسے افسوس کہ وہ مکمل نہ کر سکے۔ اس میں 'الحمد اللہ' کی تفسیر پوری کتاب کی شکل میں ہے۔ دوسرے یہ کہ ذوالقرنین کا قصہ صراحت سے بیان کیا ہے جو کتابی شکل میں بھی آ گیا ہے۔ افسوس ہے کہ وہ پورے کلامِ پاک کی تفسیر نہ کر سکے یہ قوم کے لیے خصوصاً مسلمانوں کے لیے ہے۔ ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ غبارِ خاطر، البلاغ اور الہلال کے رسالے ان کی زبان دانی کے شاہد ہیں۔

مجھے فخر حاصل ہے کہ میں نے ان سے دو بدو گفتگو کی اور ان کو خود تسلیم کرنا پڑا انہوں نے کہا ''میں مہامایا پرشاد کے جلسے میں جاؤں گا۔ مگر تقریر نہیں کروں گا'' اور انہوں نے ویسا ہی کیا۔

بہت ہی مدبرانہ ان کا لب ولہجہ تھا۔ ہم لوگوں سے انہوں نے تقریباً دس منٹ تک بہت ہی شفقت کے ساتھ گفتگو کی۔ ڈھاکہ سے نکلنے والے رسالے ندیم میں 'مولانا ابوالکلام سے ایک ملاقات' کے عنوان سے میرا مضمون چھپا تھا۔

میں جب ڈھاکہ پہنچا تو میں گیا تو اس لیے تھا کہ دیکھوں کیسا پاکستان ہے۔ میرا ارادہ ابھی وہاں رکنے کا نہیں تھا کیونکہ مجھ کو تو پٹنہ کالج میں ملازمت ملی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پاکستان کی تحریک کے لیے جتنا مجھ سے ممکن ہو سکا کر دیا باقی جو لوگ وہاں گئے ہیں کریں گے۔ مگر میں جو

ڈھاکہ آیا تو میں نے دیکھا کہ یہی پاکستان ہے جس کو دیکھنے کی میں نے تمنا کی تھی تو ایک کشش ایسی ہوئی کہ میں نے سوچا کہ وہاں تو میں نے مسلم لیگ کے لیے کام کیا اب یہاں بھی کام کرنے کی ضرورت ہے جو کرنا چاہیے۔ پٹنہ سے پبلک سروس کمیشن سے میرے پاس ٹیلیگرام آیا کہ آ کر جوائین کرلیں۔ مگر میں نے اللہ کا نام لے کر انکار کر دیا اور فیصلہ کر لیا کہ پاکستان میں ہی رہوں گا۔ اس وقت میں ایک کالج میں کام کر رہا تھا اور یونیورسٹی میں شادانی صاحب کی زیر نگرانی ریسرچ شروع کر دی تھی۔ ایک صاحب نے طنزاً کہہ دیا کہ پٹنہ یونیورسٹی کا گولڈ میڈل تو ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی سے کوئی لے کر دکھائے تو بات ہے۔ میں نے عندلیب شادانی صاحب سے جو ڈھاکہ یونیورسٹی کے اُردو ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر تھے کہا کہ ''میں پرائیوٹ طور پر ڈھاکہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کرنا چاہتا ہوں'' انہوں نے پوچھا ''فارسی آپ نے پڑھی ہے؟'' میں نے کہا ایف اے تک میں نے فارسی پڑھی ہے'' اُس زمانے کا معیار اتنا اچھا تھا۔ میں نے دو حصوں میں فارسی کا امتحان دیا اور اللہ کے فضل سے اس میں بھی ٹاپ کیا۔۔ شادانی صاحب سے ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریری میں ملاقات ہوئی انہوں نے کہا ''میں ریزلٹ کسی کو بتاتا نہیں ہوں۔ مگر مجھ کو بہت خوشی ہے تم اوّل آئے ہو۔''

اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ اُردو اور فارسی کا شعبہ ایک ہی تھا اور دونوں کے صدر شادانی صاحب تھے۔ شوکت سبزواری صاحب لسانیات پڑھانے کے لیے تھے۔ وہ کراچی چلے گئے جگہ خالی ہوئی تو انہوں نے اس جگہ کے لیے اشتہار دیا۔ ۳۵ اُمیدوار تھے جسٹس حمود الرحمٰن ایکٹنگ وائس چانسلر تھے انہوں نے ہمارا انٹرویو لیا سب سے زیادہ مجھ سے سوالات کیے اس کے بعد مجھ سے کہا ''آپ ابھی جائیں گے نہیں۔ باہر بیٹھیں''۔

انہوں نے کہا ''فرسٹ اسٹیج کا جتنا ہوتا ہے وہاں تک ہم دیں گے۔ آپ بتا رہے ہیں کہ آپ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار ہے تو پی ایچ ڈی کے بعد تین انکریمنٹ آپ کو اور مل جائیں گے''۔ میں نے کہا ''بسم اللہ ٹھیک ہے۔'' اس طرح میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں آ گیا۔

س۔ آپ نے ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ساتھ کام کیا۔ ان کا ساتھ رہا۔ آپ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے بارے میں تھوڑا سا بتائیے۔

ج۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی بہت پُرکشش شخصیت تھی۔ مشرقی تہذیب کے وہ نمونہ تھے میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان کی کتاب ''نشاطِ رفتہ'' آپ کی نظر سے گزری ہوگی اس کا رومانی انداز بھی ہے اور ان کی غزلوں میں گہرائی ہے میں نے ایک مضمون 'ساقی' میں لکھا تھا ''عندلیب شادانی صاحب کا ایک مطالعہ'' جب میں لندن میں تھا تب یہ مضمون چھپا تھا۔ شادانی صاحب کا شکریے کا خط میرے پاس آیا تھا۔ میں نے جواب میں رضا علی وحشت کا ایک مصرعہ لکھا تھا جس سے ان کی شخصیت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

''کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے''

شادانی صاحب اُردو اور انگریزی دونوں کے بہت ہی اچھے مقرر تھے۔ وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے مسلسل کئی سال تک ڈین رہے۔ ان کی شخصیت بہت ہی قابلِ احترام تھی۔ جامہ زیب آدمی تھے۔ سوٹ بھی پہنتے تھے، شیروانی میں بھی بہت جچتے تھے۔ مشاعروں میں ترنم کے ساتھ اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ ان کی زندگی کے آخری مشاعرے میں ان کی غزل تھی۔

آس نے دل کا ساتھ نہ چھوڑا ویسے ہم گھبرائے تو	دیر لگی آنے میں تم کو شکر خدا کا آئے تو
اچھا! میرا خواب جوانی تھوڑا سا دہرائے تو	جھوٹ ہے یہ تاریخ ہمیشہ اپنے کو دہراتی ہے

میزبان۔ سامعین یہ عرض کردوں ڈاکٹر معتز الدین کی عمر عزیز اس وقت بہتر (۷۲) سال ہے۔ دیکھئے یہ ۱۹۴۶ء کے واقعات سنا رہے ہیں۔ اپنی ملاقاتوں کے سارے حوالے دے رہے ہیں انہیں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے اشعار تک یاد ہیں۔ آپ یہ دیکھیں یہ ہمارے جو بزرگ تھے وہ اہل علم، اسکالر اور دانشور تھے ان کی محنتیں مشقتیں ویسے ہی نہیں ہیں۔ ان سے ہمیں بہت کچھ سیکھنا ہے۔

س۔ ڈاکٹر صاحب آپ کی شادی کس سَن میں کس فیملی میں ہوئی؟

ج۔ میری شادی میرے ایم اے کا امتحان دینے کے بعد ہوئی۔ میرا رزلٹ نہیں آیا تھا۔ میرے والد اس وقت اَسّی بیاسی سال کے تھے اور میں ٹال رہا تھا کہ جب تک میری تعلیم مکمل نہ ہو جائے میں شادی نہیں کروں گا لیکن والد نے مجھ سے کہا "بیٹے اب تو تم تعلیم سے بھی فارغ ہو گئے۔ ایم اے کا امتحان بھی دے دیا تو کیا شادی تم میری موت کے بعد کرو گے؟ میری زندگی میں نہیں کرو گے؟" یہ بات میرے دل کو جا لگی کہ لگتا ہے کہ میرے والد کو کچھ آگہی ہو رہی ہے کہ اب زیادہ دن نہیں رہیں گے۔ میں نے کہا "جناب میں تو شادی کر لوں گا۔ میرا تو خیال تھا کہ ملازمت کے بعد کرتا"۔ اتفاق سے ہزاروی باغ جو رانچی کے قریب بنگال کے بارڈر پر واقع ہے وہاں کے مشہور سینٹ کولمباز کالج کے پروفیسر تھے مسلم عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی کے شاگرد رشید تھے۔ وہ اس گھرانے سے تھے جو صادق پور کا ہے جسے وہابی تحریک سے منسلک کرتے ہیں جو دراصل شاہ ولی اللہ کی تحریک اور جنگِ آزادی تھی، ان کے خاندان کے لوگوں کو انگریزوں نے جنگ، آزادی میں حصّہ لینے کے جرم میں جزائر انڈمان بدر کر دیا تھا یا سرحد کے پہاڑوں میں ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ مسلم صاحب بہت اچھے اسکالر، شاعر تھے ان کی کتاب "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" شائع ہوئی تھی۔ ذاکر حسین صاحب جو بعد میں ہندوستان کے صدر ہوئے وہ جب بہار کے گورنر مقرر ہوئے تھے تو انہوں نے مسلم صاحب کو بلایا جو ان کے ساتھ جامعہ ملیہ دلّی میں کام کر چکے تھے۔ وہ ان کو جانتے تھے انہوں نے مسلم صاحب کو کہا کہ "وہ نسخہ مجھے دے دو" مسلم صاحب نے جواب دیا "جناب وہ نسخہ تو میرے پاس موجود ہے شاد عظیم آبادی نے مجھ کو دیا تھا کہ 'کمالِ عمر' اس کا نام ہے اور اپنے نام سے تم چھپوا لو" مسلم صاحب نے کہا کہ میری طبیعت گوارا نہیں کرتی ہے کہ استاد کی لکھی ہوئی کتاب میں اپنے نام سے چھپوا لوں۔ میری جب شادی ہوئی تو میں نے مسلم صاحب پر زور دیا کہ "آپ اس بات کی وضاحت کر دیں اور اس کا نام شاد پر رکھ دیں 'کمالِ عمر' سے لوگ نہیں سمجھتے ہیں کہ کس کا کمالِ عمر ہے" تو انہوں نے نام بدل دیا۔ ذاکر حسین صاحب نے وہ مخطوطہ ان سے لے لیا اور علی گڑھ میں آلِ احمد سرور کو بھیجا جو اس وقت انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ اس طرح

"شادی کہانی شادی کی زبانی" ۱۹۵۳ء میں ان کے ایماء پر ان کی وساطت سے چھپی تھی۔ مسلم صاحب نے بعد میں پاکستان آکر اپنے عزیز کے انگریزی مقالہ "Wahabee Movement inBihar" کا ترجمہ "وہابی تحریک" کے نام سے کیا جو کراچی میں چھپی تھی۔ مشہور کتاب ہے ان کی صاحبزادی سے میری شادی ہوئی۔

جس وقت میری شادی ہوئی تھی وہ ایف اے میں تھیں۔ اتفاق دیکھئے کہ جب میں ان کو 'کاکو سے 'جو' گیا ضلع کا ایک گاؤں ہے وہاں سے رخصت کر کے اپنے گاؤں کے گھر لے گیا۔ رات کو جب بیوی سے ملا تو اخبار پر میری نظر پڑی میں نے ان کو دکھایا "دیکھو میرا ریزلٹ آیا ہے۔ تم خوش قسمت ہو اور میری بھی خوش قسمتی ہے کہ میں نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا ہے"

جب میں پاکستان آیا تو میرا صرف ایک بیٹا سلطان محمود حالی تھا۔ جو ائیر فورس سے فلائٹ لفٹیننٹ کے عہدے سے ریٹائر ہو کر قلم کی جنگ اخبارات میں اپنے محبانہ وطن مضامین سے آج بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔

س۔ ڈاکٹر صاحب آپ ایم اے کا امتحان دے چکے تھے اور آپ کی بیگم ایف اے میں تھیں آج کل لڑکے میچنگ رشتہ چاہتے ہیں کہ اگر لڑکا ایم اے ہے تو لڑکی بھی ایم اے ہو۔ کیا اس زمانے میں یہ نہیں تھا۔

ج۔ نہیں اس زمانے میں یہ بات نہیں تھی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر علمی ذوق ہے تو انسان سب کچھ کر سکتا ہے میری بیگم نے بھی شادی کے بعد علی گڑھ سے بی اے کیا پھر ڈھاکہ یونیورسٹی سے بی ایڈ کیا پھر ڈھاکہ یونیورسٹی کے انسٹیٹوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ سے ایم۔ ایڈ کیا۔ پھر میرے ساتھ لندن گئیں تو وہاں لندن کاونٹی کونسل میں پڑھاتی رہیں اور آج بھی وہ اپنے گھر پر 'رُومی اکیڈمی' کے نام سے اسکول چلا رہی ہیں۔ قاضی صغیر الحق صاحب ایک بار ہمارے یہاں آئے تو کہنے لگے "بھائی مجھے تو آج پتہ چلا۔ مجھے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ تمہاری بیوی تم سے زیادہ قابل ہیں یا تم"۔ میں نے کہا "قابلیت تو انہی کی زیادہ ہے کیونکہ میری بھی خدمت کر رہی ہیں۔"

س۔ آپ نے ڈاکٹریٹ کس یونیورسٹی سے کی؟

ج۔ ڈھاکہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب کی رہنمائی میں میں نے پی ایچ ڈی کیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سندھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر نبی بخش (فارسی کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ) میرے ممتحن تھے۔

قائم چاند پوری کا انتخاب میں نے اس طرح کیا کہ پٹنہ کے قاضی عبدالودود صاحب جو غالب پر ماہر اُستاد مانے جاتے تھے، شادانی صاحب کے دوست تھے وہ اتفاق سے ڈھاکہ آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کے سامنے ذکر کیا کہ میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا موضوع قائم چاند پوری رکھو اس کا ایک مخطوطہ تمہارے یہاں لائبریری میں ہے اور ایک انڈیا آفس لندن میں ہے۔ اسے Colate کر کے اسی پر پی ایچ ڈی کر لو۔ اس پر کسی نے نہیں کیا ہے۔ اس طرح بات طے ہوگئی۔ شادانی صاحب نے بھی صاد کیا۔

جب میں نے مخطوطہ لائبریری سے نکال کر دیکھا تو پتہ چلا چاند پور ایک جگہ بنگال میں بھی ہے۔ وہاں کے ابوالقاسم صاحب چاند پوری کوئی تھے۔ میں نے قاضی ودود صاحب کو پٹنہ خط لکھا کہ ''وہ مخطوطہ یہاں نہیں ہے'' انہوں نے جواب دیا اس سے کیا فرق پڑتا ہے اگر وہاں نہیں ہے تو انڈیا میں اور نسخے ہیں، لندن میں ہے۔ ان سے استفادہ کرو۔ بعد میں مجھے چار پانچ نسخے مل گئے ایک لکھنؤ کے ادیب صاحب کا، ایک نسخہ کلکتہ کا میں نے اس سے جا کر ملایا۔ میں نے انڈیا آفس لندن کو ڈھاکہ یونیورسٹی سے خط لکھوایا ان لوگوں نے لائبریرین کو وہ نسخہ بھیج دیا۔ رمضان کی چھٹی تھی میں صبح سویرے ڈھاکہ یونیورسٹی چلا جاتا اور اطمینان سے دن بھر کام کرتا۔ رمضان میں کھانے پینے کا بکھیڑا تو تھا نہیں۔ پھر مجھ کو ایک نسخہ عرشی رامپوری نے رام پور سے بھیج دیا اور کلکتہ فورٹ ولیم کے نسخے سے میں نے استفادہ کیا۔ میں شادانی صاحب کو کام کر کر کے دکھاتا رہا۔ اس طرح ۱۹۶۷ء میں میرا پی ایچ ڈی کا کام مکمل ہوا اور مجھ کو ڈگری ملی۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ میرا مقالہ اب تک نہیں چھپا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب میں کراچی آیا تو میرے پاس اس کی کوئی

کاپی نہیں تھی۔ کئی برسوں کے بعد میرے ایک کرم فرما ڈاکٹر نے اس کی ایک کاپی مجھ کو لا کر دی۔ انجمن ترقی اردو والوں سے بات کی ہے انہوں نے چھپوانے کا وعدہ کیا ہے۔ قائم چاند پوری کا ایک شعر میں سناؤں جو زبان زدِ عام ہے بلکہ ضرب المثل بن گیا ہے۔

قسمت کی خوبی دیکھیئے ٹوٹی کہاں کمند   دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

س۔ اس کے بعد آپ لندن یونیورسٹی تشریف لے گئے؟

لندن کا یہ ہوا کہ ۱۹۶۵ء میں کچھ اسکالرشپس کا اعلان ہوا میں نے شادانی صاحب سے کہا کہ میں لسانیات میں کرنا چاہتا ہوں۔ اس طرح میں لندن چلا گیا وہاں میرے سپروائزر نے کہا پی ایچ ڈی کے لیے زیادہ وقت چاہیے اگر ایم فل کرو گے تو تمہیں انگریز لڑکوں کے ساتھ دو پیپر دینے ہوں گے۔ میں نے حامی بھر لی اور اللہ نے لاج رکھ لی۔ Phonetics میں امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس ہوا۔ وہاں جس نے میرا وائیوا لیا ڈاکٹر Ginson وہ مجھ کو وہاں ملازمت بھی دے رہے تھے۔ انہوں نے لکھ دیا ہے کہ ''ڈاکٹر معز الدین کے تھیسس Word Form in Urdu' پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل سکتی ہے۔'' یہ کتابی شکل میں مقتدرہ سے شائع ہو چکی ہے۔

جب میں ۱۹۶۸ء جنوری میں لندن سے واپس آیا تو ڈھاکہ کی فضا بدل چکی تھی۔ لوگوں نے کہا ''تم لندن ہی میں رہتے'' میں نے کہا ''میں تو واپس آیا ہوں تاکہ جو علم میں نے حاصل کیا ہے اس سے اپنے ملک کے نوجوانوں کو فائدہ پہنچاؤں''۔ ایک سردار صاحب سے دلچسپ مذاکرہ ہوا۔ کہنے لگے ''میں نے سنا ہے کہ تم جا رہے ہو'' میں نے کہا ''ہاں بھائی انگریزوں کا بہت ماحول دیکھا''۔ انہوں نے کہا ''میں تو ایک پیشکش لے کر یہاں آیا ہوں کہ یہاں لندن میں ایک Race Relation Department کھلا ہے جس میں Phonetics اور Linguistics بھی ہے۔ تم اس کے لیے بیحد موزوں ہو گے کیونکہ تم کو انگریزی اور اُردو کے ساتھ بنگلہ اور ہندی سے بھی واقفیت ہے۔ تم اگر کہو تو اس کے ڈائریکٹر سے میں بات کئے لیتا ہوں مگر تم واپس نہ جاؤ'' میں

نے کہا ''کیا صرف یہ نوکری کے لیے ہے؟'' کہا ''تمہاری بیوی بھی کاؤنٹی کونسل میں پڑھاتی ہے اگر یہاں دس سال رہ جاؤ گے تو زندگی بھر کے لیے اثاثہ بنالو گے'' میں نے کہا ''آپ نے کلچرل پہلو پر غور نہیں کیا۔ دس سال بعد میرے بچے واپس جانا نہیں چاہیں گے۔ میری ایک بیٹی ہے وہ آکر کہے گی 'Abbu meet my boy friend' تو میں کہاں کا رہوں گا؟ میں ان شخصیات میں سے ہوں کہ۔۔۔ ''ہرچہ گیرید مختصر گیرید''۔۔ پاکستان کے لیے میں نے جدّ وجہد کی ہے۔ وہاں واپس جاؤں گا میری وہاں ضرورت ہے۔ میرے یہاں سے ڈگری لینے کا فائدہ کیا؟ 'وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے'۔ پر میں ایمان رکھتا ہوں۔ میں پاکستان واپس آیا تو بہت کچھ بدل چکا تھا۔ پھر ایسٹ پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ لیکن میں اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے پاکستان کے لیے اپنا وطن چھوڑا تھا۔ پاکستان ہی میں رہا۔ میں کراچی میٹنگ میں آیا تھا کہ مشرقی پاکستان سے سلسلہ منقطع ہوگیا۔ میں نے جو تکلیفیں اُٹھائیں میرا بینک بیلنس، میری زمین میر سارا اثاثہ وہیں رہ گیا۔ بیوی کو دلاسا دیتا رہا ایک دن میں مغرب کی نماز پڑھ رہا تھا کہ اقبال کا شعر ذہن میں آگیا۔ ؎ ''مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا''

اس سے مجھے اطمینانِ قلب حاصل ہوا اور اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد قدرت اللہ شہاب ایجوکیشن سیکریٹری تھے اور حفیظ پیرزادہ ایجوکیشن منسٹر تھے تب میری پوسٹنگ اقبال اکیڈمی میں بحیثیت ڈائریکٹر ہوگئی اور اس درمیان میں کراچی یونیورسٹی میں لسانیات وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے پڑھاتا رہا تھا۔

دو سال میں کراچی میں اقبال اکیڈمی سے منسلک رہا جہاں میں نے علامہ اقبال پر کتابیں چھپوائیں۔ اس کے بعد بھٹو صاحب کا دور آیا اس میں ۱۹۷۷ میں علامہ اقبال کا صد سالہ جشنِ یوم پیدائش منانے کا پروگرام بنا تو اربابِ حل وعقد کی نظر ظاہر ہے مجھ پر پڑی اور مجھ کو یہ اعزاز حاصل ہوا جہاں انڈیا میں Leader of the delegation کے طور پر پاکستان گورنمنٹ کی طرف سے بھیجا گیا جس میں چوٹی کے لوگ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، عالیہ امام میرے ساتھ گئے۔

وہاں کا ایک واقعہ بتا دوں۔ ایڈوانی صاحب ایڈریس کر رہے تھے کہ ''دراصل ہم ایک ہی ہیں۔ ہمارے کلچر میں کوئی فرق نہیں ہے؟'' میں نے انگریزی میں مختصر جواب دیا ''یہ تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ اگر دو ہمسایہ ممالک میں لسانی اور تہذیبی وثقافتی تعلقات اچھے ہوں تو اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔؟'' گوپی چند نارنگ نے پوچھا ''آپ بتائیں اقبال کی عظمت کیا ہے؟'' میں نے کہا کہ ''اقبال کی عظمت ہی ہے جو آپ لوگ یہاں پر ان کا صد سالہ جشن منا رہے ہیں جس کے لیے آپ لوگوں نے مجھ کو دعوت دے کر بلایا ہے۔ ان کی عظمت کو آپ لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔ ان کی شاعری، ان کا فلسفہ، ان کی باتیں اپنی جگہ پر مگر میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی سب سے بڑی عظمت اور کارنامہ یہ ہے کہ وہ پاکستان کے Spiriual Father ہیں'' اس پر وہ لوگ ذرا سٹپٹائے۔ میں نے وہاں ٹی وی اور ریڈیو پر بھی تقریریں کیں۔

۱۹۸۲ء میں پہلی دفعہ اقبال چیئر کیمبرج یونیورسٹی میں قائم کی گئی۔ جنرل ضیاء الحق کا زمانہ تھا اس کے لیے بہت امیدوار کوشاں تھے لیکن جب میرا نام ان کے سامنے پیش کیا گیا تو میری خدمات تھیں جب اقبال اکادمی میں میرا تقرر ہوا تھا تو محمد علی ہوتی اس وقت منسٹر تھے۔ اقبال اکادمی کے لیے چورانوے ہزار روپے گرانٹ ہوئے تھے۔ جب اکادمی کو میں لاہور لے گیا تو فیض صاحب۔ تلقین شاہ، احمد ندیم وغیرہ بڑے دانشور اقبال اکادمی میں آتے تھے۔ میں نے ان لوگوں سے درخواست کی ''میری رہنمائی کریں۔ میں اکادمی کو لاہور تو لے آیا ہوں مگر میں یہاں اجنبی ہوں''۔ انہوں نے بیک زبان کہا ''آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ آپ اسے جاری رکھیں''۔ جس وقت میں نے لندن جاتے ہوئے اکادمی کو چھوڑا تو پہلی دفعہ میں نے اکادمی کے لیے منسٹری آف ایجوکیشن اور پلاننگ ڈویژن سے چونتیس لاکھ روپے علامہ اقبال پر ریسرچ کے لیے حاصل کیے اور چودہ لاکھ عام خرچ کے لیے کیونکہ کام ہونے لگا تھا۔ انٹرنیشنل سیمینار پنجاب یونیورسٹی نے منایا جس میں ڈائریکٹر اقبال اکادمی کی حیثیت سے میں نے حصہ لیا۔

اس کے بعد کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال چیئر قائم ہوئی جس کے لیے میرا تقرر ہوا۔ وہاں

میں دوسال بطور Visiting Professor رہا اور وہاں تمام یونیورسٹیوں، سینٹ اینڈریوز یونیورسٹی، گلاسگو یونیورسٹی وغیرہ میں لکچر دیتا تھا، اقبال کو روشناس کراتا تھا اور جو خدمت مجھ سے ہو سکی میں نے کی۔ وہاں ہمارے سفارتخانے نے اقبال کے صد سالہ جشنِ پیدائش کے موقعہ پر جلسہ کیا وہاں کے چند پروفیسران علامہ کو صرف جاننے والے نہیں بلکہ قدر دان تھے۔ پروفیسر آربری اور نکلس نے ان پر کام کیا تھا۔ اس لیے دانشور حلقہ علامہ اقبال سے پہلے ہی متعارف تھا۔ صد سالہ جشن کے سلسلے میں علامہ اقبال کا کیمبرج میں جس مکان میں قیام تھا اس پر ان کے نام کی تختی لگوائی گئی اور کچھ جلسے وغیرہ بھی ہوئے۔ دُرّانی صاحب جو سائنٹسٹ ہیں انہوں نے علامہ اقبال پر کچھ لکچر دیئے تھے Ian Stephen جو کلکتہ کے Statesman of India کے ایڈیٹر ریٹائر ہو کر کیمبرج میں مقیم تھے انہوں نے اور ایک پروفیسر علی اشرف صاحب جو وہاں اسلامک ایجوکیشن پر کیمبرج میں کام کر رہے تھے ان لوگوں نے مجھ کو کیمبرج میں گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔ این میری شمل کو میں نے وہاں بلایا اور علامہ اقبال پر کئی جلسے کرائے۔ میرا سب سے اہم کام سینٹ اینڈریوز یونیورسٹی اسکاٹ لینڈ میں جو برطانیہ کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہے وہاں میں نے علامہ اقبال کو متعارف کرایا کہ اقبال ایسے ہیں کہ انہوں نے تین سال کے اندر تین ڈگریاں لیں۔ کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا، لندن سے بارایٹ لاء کیا اور ان کا کارنامہ Reconstruction of Religious Thought in Islam ہے جس پر آکسفورڈ کی یونیورسٹی Rhodes نے ان کو لکچر دینے کی دعوت دی مگر موت نے انہیں مہلت نہیں دی۔ اس طرح میں نے انہیں وہاں روشناس کرایا۔

میں جب کیمبرج سے واپس آیا تو لاہور چنبہ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ بروہی صاحب کے پی۔ ایس شجاع صاحب کا فون آیا کہ نیشنل ہجرہ کونسل کے چیئرمین بروہی صاحب آپ کو اسلام آباد بلا رہے ہیں۔ میں دوسرے دن ان کے گھر گیا۔ ڈاکٹر این ایچ بلوچ صاحب بھی وہیں تھے۔ بروہی صاحب نے چھوٹتے ہی فرمایا "برادر میں آپ کا بائیوڈیٹا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آپ سے ملاقات تو

ہوتی رہی مگر پتہ نہیں تھا کہ مشرقی پاکستان میں رہ کر بھی آپ نے اتنا کام کیا ہے۔ میں نے شکریہ ادا کر کے عرض کیا" آپ وضاحت کریں مجھ سے کس نوعیت کا کام چاہتے ہیں؟" انہوں نے کہا

"Brother, you help us in Hijra Council, I don't wanta bureaucrat. I want a scholar Hundred Great Booksof Muslim Cultural Heritage "

ہمارا ارادہ ہے کہ مسلمانوں کی ثقافت اور عربوں کے مختلف ادوار سے انتخاب کر کے ہم سو کتابیں چھاپیں گے گویا ایک انسائیکلوپیڈیا ورک ہوگا جو ہم نکالیں گے"۔ ہجرہ کونسل سے Muslim World Today چھپ چکی تھی۔ جو اس وقت کے باون ترین آزاد اسلامی ممالک جو او۔آئی۔سی کے رکن تھے ان کے متعلق بہت ہی اچھی کتاب تھی۔ جنرل ضیاء الحق صاحب اسلامی ممالک کے فرمانرواؤں کو وہی کتاب فخریہ تحفتاً پیش کرتے تھے۔ ہم نے "Tha Muslim Luminaries" چھاپی تھی جو مجدد الف ثانی سے لے کر جتنے علماء دین گزرے ہیں ان پر مودودی صاحب کی لکھی ہوئی یہ کتاب تھی۔

Hundred Great Books کے لیے کچھ کتابوں کے ترجمے عربی یا انگلش سے ہو چکے تھے۔ بعض مخطوطوں کا ترجمہ مختلف اسکالروں کو دیا گیا تھا۔ ان کتابوں کا انٹروڈکشن کسی بڑے عالم سے لکھوانا تھا جس سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی اور اس کا تعارف ہوتا۔ اس کا انگریزی، اُردو اور پاکستان کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کرانے کا پروگرام تھا۔ کیبنیٹ ڈویژن کے زیرِ تحت یہ کام ہو رہا تھا۔ اس کے لیے او۔آئی۔سی نے پیسے دیئے ہوئے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے جنرل ضیاء الحق کے بعد بے نظیر کی حکومت آئی ان کو خیال ہوا کہ یہ Duplication of Work ہے۔ ادارہ توڑ دیا گیا۔ ساری کتابیں اسلامک انسٹیٹیوٹ کو دے دی گئیں۔ میں اس وقت ریٹائر ہو چکا تھا۔

بروہی صاحب کے بارے میں مَیں کچھ بتاتا چلوں۔ انہوں نے ازراہِ عنایت نیشنل ہجرہ کونسل کی ڈائریکٹرشپ کی مجھ کو پیشکش کی تو میرے خیر خواہ دوستوں نے ڈرایا" ان کے ساتھ تمہارا چلنا بہت مشکل ہوگا۔ He is great task master اور سخت مزاجی کے ساتھ قانون کے بھی

بڑے ماہر ہیں۔ تم ذرا سوچ لو"۔ میں نے کہا "میں تو ان سے ہامی بھر آیا ہوں۔ میری زندگی کے دو اصول ہیں Complete faith in God plus full cofidence in self اللہ پر بھروسہ مجھ کو اس مقام پر لایا ہے اور اس شخص نے مجھ کو خود بلایا ہے تو ہر چہ باداباد"۔ جب میں آ گیا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میری زندگی کے بہترین لمحات ڈاکٹر بلوچ اور اے کے بروہی صاحب کے ساتھ گذرے۔

بروہی صاحب کا یہ حال تھا کہ جب میں فائل لے کر جاتا تو کہتے "تم لکھ دو کہ مجھ سے ڈسکس کر لیا ہے اور بلوچ صاحب کو بڑھا دو۔ میں تم سے کچھ علمی باتیں کرنا چاہتا ہوں" پہلے ہی دن بولے "برصغیر میں عالمِ اسلام کی کسی ایسی شخصیت کا نام لو جسے تم انتہائی سر برآوردہ سمجھتے ہو"۔ میں نے کہا "میں ایک کا نہیں تین کے نام لوں گا۔ جنہوں نے ہماری قسمت بدلی ہے۔ میرے نزدیک جناب مجدّد الف ثانی ان کے بعد شاہ ولی اللہ ہیں اس کے بعد علاّمہ اقبال ہیں۔ اس لیے نہیں کہ میں اقبال اکادمی کا ڈائریکٹر رہا ہوں بلکہ ان کی عظیم خدمات مسلمانوں کے لیے ہیں۔ اس کے بعد مولانا مودودی صاحب کی خدمات ہیں"۔

بروہی صاحب قرآن کا مطالعہ بہت ہی دل سوزی سے کرتے تھے۔ وہ باتیں کرتے تو حوالہ دیتے "دیکھو سورۃ اقراء میں ہے"۔ ایک دن میں گیا تو کسی سوچ میں گم تھے۔ دیکھتے ہی کہنے لگے "میں تمہیں بلانے والا ہی تھا۔ ایک آدمی نے مجھے مضمون بھیجا ہے کہ غالب منکرِ خدا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔" میں نے جواب دیا "میں یہ نہیں کہوں گا کہ غالب منکرِ خدا تھا یا نہیں۔ میں غالب کے دو اشعار پڑھوں گا آپ وکیل ہیں آپ خود فیصلہ کریں گے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

یہ حضرت بی بی رابعہ بصریؒ پر ہے جو ایک ہاتھ میں مشعل لے کر جا رہی تھیں کہ لوگ جنت کے لالچ اور دوزخ کے ڈر سے اللہ کی اطاعت کرتے ہیں تو میں جنت کو آگ لگا دوں گی۔

انہوں نے کہا معنی بتاؤ" میں نے کہا "عبادت میں خدا کے سامنے حاضر سمجھ کر خضوع اور

خشوع ہونا چاہیے نہ کہ جنت کی، شراب اور انگبین کا لالچ۔

انہوں نے کہا"اور دوسرا شعر؟"میں نے پڑھا۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود　　　قبلے کو، اہلِ نظر، قبلہ نما کہتے ہیں

یہ ذرا تشریح طلب ہے۔ میں نے معنی بتائے تو کہنے لگے"نہیں نہیں وہ منکرِ خدا نہیں ہوسکتا ہے" پوچھنے لگے"غالب کی شرح کس نے سب سے اچھی لکھی ہے؟"میں نے بتایا"غلام رسول مہر کی سب سے اچھی ہے۔ وہ عالم تھے اور مذہب و تاریخ پر ان کو عبور حاصل تھا"میں نے ان کی فرمائش پر کتاب بھجوادی تو کہا"اس پر اپنا آٹوگراف بھی لکھو" کہا کہ"میں نے اسکا دیباچہ پڑھ لیا ہے انہوں نے تو غالب کی سوانح حیات بھی لکھی ہے وہ بھی میرے لیے لادو"اس کا مطلب ہے کہ وہ مطالعہ اتنا کرتے تھے اور ہر چیز جاننا چاہتے تھے۔ میں اکثر ان کے پاس جاتا وہ علمی باتوں کی فرمائش کرتے۔ انہوں نے جو مجھ کو سرٹیفکیٹ دیا اس میں لکھا God's own man, I am personally fond of him"

وہ ہر جمعہ کو گولڑہ شریف ضرور جاتے تھے۔ میں آخری بار جو رخصت کرنے گیا تو اور بھی کئی لوگ بیٹھے تھے۔ انہوں نے انہیں کہا"آپ لوگ دوسری گاڑی سے آیئے میں معزالدین کے ساتھ جاؤں گا"۔ وی آئی پی لاؤنج میں مجھ سے آخیر تک باتیں کرتے رہے۔ ایک بہت اہم شخصیت منہ میں سگریٹ دبائے ان کی طرف بڑھی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لیے اور کہا "First throw your cigrettee

میں نے بروہی صاحب اور ڈاکٹر بلوچ صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ نیشنل ہجرہ کونسل میں ڈاکٹر بلوچ ہی مجھ کو لائے تھے۔ یہ دونوں ہر کام لگن اور تدبّر سے کرتے تھے۔ اسلام پر دونوں جان چھڑکتے تھے۔

میں اپنے کام میں ایسا غرق تھا کہ میں نے سوچا ہی نہیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد کیا ہوگا؟ رہوں گا کہاں؟ کیونکہ بقول اقبال۔"گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں، نہ سمرقند" درویشِ خدا مست ہوں میں نے زندگی کے بہت نشیب و فراز دیکھے۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے اقبال کو میں بچپن سے پڑھتا آیا۔ خودی کا سبق تو ملا ہی مگر ان کا فرمودہ:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے　　ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اس پر عمل کر کے مجھ کو زندگی میں سرفرازی حاصل ہوئی۔ لندن میں میں جلسوں میں اُردو اور انگلش دونوں میں تقریریں کرتا رہا مگر یہ جان کر کسی سے مرعوب نہیں ہوا کہ میں اللہ کی ادنیٰ مخلوق ہوں۔ میں اپنی لیاقت اور صلاحیت کے مطابق کام کر رہا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھ کو عزت بخشی ہے۔ میں نے بڑوں کا ادب ضرور کیا مگر الحمد اللہ کسی کی خوشامد نہیں کی۔

میں نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنتے دیکھا۔ وہ ایسی بات ہے کہ "وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا"۔ بعض دفعہ میں دل گرفتہ ہوتا ہوں مگر "لاتقنطو من رحمتہ اللہ" جسے اقبال نے کہا ہے:

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے　　اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

بفضلِ خدا ہم ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔"

"یہ آخری حصہ ان کی آخری ریڈیو کی 'ملاقات' کا نشریہ تھا۔ اسے قلمبند کرنا میں نے اس لیے ضروری سمجھا کہ ان کی زبان پر گرفت۔ قابلِ رشک یاداشت اور اشعار کے برمحل استعمال پر ان کی خداداد قدرت کا اندازہ ہو۔ آج یہ حال ہے کہ مہینوں سے فالج کے حملے سے دنیا و مافیا سے بے خبر، بے حس اعضاء کے ساتھ بے زبان خاموش بستر پر پڑے ہیں۔ مگر چہرے کی بشاشت اور مسکراہٹ ان کی اُمیدوں کے روشن چراغ کی غماز ہے۔ فی امان اللہ۔۔۔" عمرانہ مُعز (اہلیہ)

پروفیسر ڈاکٹر محمد معزالدینؒ
کی یاد میں (ماخوذ)

عمرانہ معز (اہلیہ)

میری یادوں کے مرکز

ڈاکٹر معزالدین صاحب کے دیرینہ دوست منصور عاقل صاحب نیشنل سیونگ کی ڈائریکٹر شپ سے فارغ ہو کر سہ ماہی رسالہ الاقرباء کی اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ تب انہوں نے معزالدین صاحب کو ترغیب دی کہ اپنی سوانح عمری لکھ ڈالیں۔ لیکن بدقسمتی سے چھیاسی سال کی عمر میں یہ اب خود لکھنے کے لائق نہیں رہے۔ مگر منصور عاقل صاحب کب باز آنے والے تھے؟ وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "بھابی یہ کام آپ کر ڈالیے۔ ڈاکٹر صاحب نے زندگی میں گونا گوں تجربات حاصل کیے ہیں ان سے آنیوالی نسلوں کو محروم رکھنا ان کے اُوپر ظلم ہے۔" تب میں نے بھی ان کی بات کے وزن کو محسوس کیا اور اللہ کا نام لے کر یہ مہم اپنے سر لے لی۔ اللہ ان کو صحت دے کہ ساتھ دے سکیں اور مجھ سے یہ کام مکمل کرا دے۔ آمین

اپنی تعلیمی اسناد کے مطابق آپ کا سنِ والادت ۵ جنوری ۱۹۲۷ء ہے ان کے بھائیوں اور بہنوں کی عمروں میں بہت فرق تھا۔ بڑے بھائی کی شادی میں یہ گود میں تھے۔ ان کے دو چھوٹے بھائی ہفتے بھر کے اندر چٹ پٹ عالم بالا کو چلے گئے۔ ان کے والد منیر الدین صاحب کلکتہ میں دواؤں کی فیکٹری میں کیمیکل میں اپنی خداداد سوجھ بوجھ اور مہارت کی وجہ سے اہم حیثیت کے ملازم تھے۔ سال میں صرف ایک بار چھٹیوں میں گھر آتے۔ گھر کا انتظام منجھلے بھائی جوان سے عمر میں سولہ سال بڑے تھے ان کے سپرد تھا۔ ان کا آبائی گھر 'بازید پور' چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مسلمانوں کے مشکل سے پندرہ بیس گھر ہوں گے۔ چند ایمان کی حرارت والوں نے مسجد بنانے کا بیڑا اٹھایا۔ چندہ کر کے زمین خریدی۔ بوڑھے بچے سب نے اپنی بساط کے مطابق مدد کی اور جلد ہی خوبصورت

مضبوط پختہ مسجد تیار ہوگئی۔ ان کی والدہ صاحبہ جو بڑی سوجھ بوجھ کی خاتون تھیں انہوں نے اپنے ایک ریٹائرڈ رشتہ دار مولوی صاحب کا انتظام کرادیا۔ اور بچوں کے مدرسہ کی مسجد میں بنیاد پڑ گئی۔

جب یہ ساتویں جماعت میں تھے تو ایک دن مولوی صاحب چھٹی جماعت کے بچوں کو اردو قواعد کا کوئی سبق پڑھا کر آئے اور آکر کلاس سے اسی کے متعلق سوال کیا۔ ان لوگوں کو پچھلے سال پڑھایا تھا یہ لوگ بھول گئے تھے۔ اُن کو بہت غصہ آیا چھٹی کلاس کے ایک منظورِ نظر لڑکے کو بلوایا۔ اس نے ان کے سوال کا جواب فر فر سنا دیا۔ مولوی صاحب نے حکم دیا کہ "ان سارے نالائقوں کے کان اینٹھو"۔ یہ دوسری لائن میں سب سے آگے بیٹھے تھے۔ جیسے ہی ان کے کان کی طرف ہاتھ بڑھایا انہوں نے ایسا زوردار طمانچہ رسید کیا کہ اُلٹ گیا اور یہ غصّے میں کھڑے ہو گئے اور پوری کلاس سے کہا "اس کلاس کا بائیکاٹ کرتے ہیں جہاں ہم سے ایسی ذلت کا سلوک ہوتا ہے۔" علامہ اقبال کے رسیا بچپن سے تھے۔ خودی پر ان کے اشعار پڑھ ڈالے اور پوری کلاس ان کے ساتھ اُٹھ گئی اور یہ لوگ دروازے سے نکل گئے۔

میٹرک کے بعد ابا (میرے سسر) کو ایک رہن شدہ کھیت کی واپسی کے دس ہزار روپے ملے انہوں نے انہی کو پکڑا دیا اور کہا اسی سے اپنی تعلیم مکمل کرلو۔ انہوں نے پیسے بینک میں رکھ دیئے اور اپنی مثالی خوش پوشاکی کے باوجود سلیقے سے ایم۔ اے تک یہ رقم چلائی۔ ایک دن ان کے ہم جماعت نے آکر بتایا کہ نوٹس بورڈ پر حسن جان اسکالرشپ کے لیے تمہارا نام لکھا ہوا ہے۔ جا کر آفس سے لے لو لڑکوں نے کہا "طوائف کے پیسے کی اسکالرشپ حرام ہے"۔ انہوں نے جواب دیا کہ "طوائف کی بڑائی ہے کہ مرتے وقت تائب ہوکر مسلمان ہونہار لڑکوں کے لیے اس نے اپنا پیسہ وقف کردیا تھا۔ میں تو ضرور لوں گا"

ڈاکٹر معزالدین تین بھائی تھے اور بہنیں بھی تین ہی تھیں۔ یہ سب سے چھوٹے تھے۔ یہ اپنی پڑھائی میں مگن تھے۔ ہوسٹل میں رہتے اور ہفتہ، اتوار گھر پر گزارتے۔ بی اے کا امتحان دیتے ہی گھر والوں کا شادی کا اصرار تھا۔ انہوں نے سنٹرل سوپیریئر سروسز (CSS) کے امتحان میں بیٹھنے کی

ٹھانی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ایل ایل بی کرنے کے لیے لاء کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ انہوں نے آرہ سے انٹر کر کے پٹنہ کالج میں بی اے آنرز میں داخلہ لے لیا۔ اور اُردو، فارسی ہی رکھی تاکہ اعلیٰ ترین نمبر لیں۔ ۱۹۴۶ء میں ان کا بزمِ ادب کے سیکریٹری کے لیے انتخاب ہوا۔ ایک جلسے کی صدارت کے لیے انہوں نے ابا کا انتخاب کیا تھا۔ سالانہ جلسے کے لیے ان لوگوں کی نظرِ انتخاب مولانا ابوالکلام آزاد پر پڑی۔ اتفاق سے وہ پٹنہ آئے ہوئے تھے انہیں بہار کے وزیر (غالباً) گنیش بابو نے جلسے کی صدارت کے لیے بلایا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب پٹنہ کے ایک رئیس جعفر صاحب کے مہمان تھے۔ یہ اپنی سفید شیروانی میں بزمِ ادب کے سیکریٹری کی حیثیت سے مولانا کو بزم کی صدارت کے لیے دعوت دینے کو جعفر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ ملازم نے ان کو بٹھایا اور بتایا کہ ''مولانا غسل فرما رہے ہیں'' یہ انتظار میں بیٹھ کر ٹیبل پر پڑا اخبار پڑھنے لگے۔ مولانا سفید کرتا پاجامہ میں گیلے بالوں کے ساتھ نکلے۔ انہوں نے اپنا مدّعا بیان کیا تو خوش دلی سے فرمایا ''بھائی، میں ایک تیر سے دو شکار کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر ایک جلسے کی صدارت کرنے کہیں گیا ہوں تو اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس لیے اس ٹرپ پر تو مجھ کو معاف رکھو۔ پھر بلاؤ گے تو آجاؤں گا''۔ اسٹوڈنٹ ذات کہاں باز آنے والی؟ انہوں نے ادب سے کہا ''حضور، آپ تو اپنے اصول کی خلاف ورزی کر چکے۔ دیکھیے اسی اخبار میں خبر ہے کہ آج آپ خدا بخش لائبریری کے نئے ہال کا سنگِ بنیاد رکھنے والے ہیں۔ آپ اگر سات بجے تھوڑی دیر کے لیے ہماری بزم میں تشریف لے آئیں تو ہماری عزت افزائی کے ساتھ ہمت افزائی بھی ہوگی'' مولانا نے خوش مزاجی اور شفقت سے مسکرا کر فرمایا ''تم طالبعلموں سے کون جیت سکتا ہے!'' مولانا کی بزمِ ادب میں شرکت واقعی ان لوگوں کے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔ ان کے اساتذہ بھی ان کی جرأت رندانہ پر ششدر رہ گئے۔ کیونکہ مولانا کی صدارت جلسہ کی کامیابی کی ضامن تھی۔

بہار میں مسلمان اقلیت میں تھے پھر بھی اچھے کھاتے پیتے اور تعلیم یافتہ اور مہذب تھے۔

مغلیہ دور کی ان پر چھاپ تھی۔ مغل بادشاہوں کی بخشی ہوئی پشت در پشت تقسیم ہوتی ہوئی یا پھر اپنے زورِ بازو کی کمائی ہوئی جائیدادیں خاندان در خاندان چلی آرہی تھیں۔ مسلمانوں میں تعلیم کا چرچا شروع سے تھا۔ پہلے تو ان لوگوں نے انگریزی تعلیم سے منہ موڑے رکھا مگر کب تک؟ ہونہار لڑکوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کا رخ کیا اور اپنے جوہر دکھائے۔ اسی لیے گاؤں میں بھی مسلمانوں کی بستیوں سے صفائی کے ساتھ خوش حالی ٹپکتی تھی۔ جب کہ ہندو طبقاتی درجوں اور ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اکثریت نچلی ذات کے شُودروں کی تھی۔ جو مفلوک الحالی کا عبرتناک مرقع تھے۔

ان کے ابا ریٹائر ہو کر آچکے تھے بڑی ناامیدی سے بولے ''اب لگتا ہے کہ تمہاری شادی کی تمنا لے کر ہی میں چلا جاؤں گا۔ ان کا دل پگھل گیا۔ انہوں نے شادی کی ہامی بھر لی۔ ابا نے سب کچھ ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ پٹنہ سٹی کے ایک رئیس کے گماشتے ان کو تاکے ہوئے تھے طرح طرح سے ترغیب دلا رہے تھے انہوں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ ایک دن وہ بگھی پر طرح طرح کے حلووں کے تھال، کھانے کے خوان لے کر ہاسٹل پہنچ گئے۔ لڑکے ٹوٹ پڑے اُن کی تو عید ہوگئی۔ ساتھ ہی جہیز کی ایک لمبی لسٹ تھی۔ جس میں پٹنہ سٹی میں گھر کے علاوہ زمین کے مربعے، سامانِ جہیز کے فرنیچر جن میں چاندی کے پاؤں کا پلنگ بھی تھا۔ ان کے جیسے انقلابی کے لیے تو یہ ایک گالی تھی۔ ان کے غصّے کا پارہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ بمشکل ان کو کہا'' آپ تشریف لے جائیے میں بکاؤ مال نہیں ہوں''

ان کے ایک دوست اسرار الحق صاحب تھے۔ ان سے خالو ابا کی ملاقات ہوئی تو پوچھا ''معز ان دنوں بجھے بجھے سے رہتے ہیں کیا بات ہے؟'' انہوں نے پٹنہ سٹی کے گماشتے والا ماجرہ کہہ سنایا۔ اب تو خالو ابا کو میرے لیے یہ آئیڈیل رشتہ لگا۔ اس زمانے میں ٹیلی فون کا تو رواج نہیں تھا۔ ابا کو ٹیلیگرام دے دیا کہ آکر بات طے کرلو۔ انہوں نے کہا میں ابھی شادی کر سکتا ہوں۔ کرسمس میں ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان ہیں۔ میں مصروف ہوں گا۔ سترہ دنوں کے بعد شادی طے پائی۔ مجھ کو اپنے انٹر کے امتحان کی سخت فکر تھی جو مارچ میں ہونے والا تھا۔ میرے وقت بے وقت کے

آنسوؤں سے ابا نے مجھ کو دلاسا دلانے کی بہت کوشش کی کہ انہوں نے معز سے بات کر لی ہے وہ مجھے تعلیم جاری رکھنے دیں گے۔ شادی کے چند ہی دنوں بعد ہم لوگ ابا کے ساتھ ہزاری باغ اور یہ پٹنہ روانہ ہو گئے۔ وائس چانسلر صاحب نے حسب وعدہ ان کو پٹنہ کالج میں شعبۂ اردو میں لیکچرر کی جگہ دے دی۔ یہ بہت خوش تھے ان کے سارے شفیق استاد حافظ شمس الدین صاحب، منان صاحب اور اختر اور نیوی صاحب اور دوسروں نے ان کے سر پر اپنا دست شفقت رکھا۔

کپڑوں کے شوقین تو یہ شروع سے تھے ہی شادی کا سوٹ ماموں جان نے ان کی پسند سے سلوایا تھا۔ اسے بڑے چاؤ سے پہنتے تھے۔ ان کے ایک دوست کی شادی بھی انہی دنوں ہوئی تھی۔ انہوں نے دس ہزار روپے لے کر پٹنہ کے ایک رئیس کی بیٹی سے شادی کی تھی اور اکڑتے پھرتے تھے۔ ان سے کہنے لگے یار معز تم نے یونہی پھوکٹ میں شادی کر لی۔ مجھ کو دیکھو بیوی بھی ملی اور ساتھ ہی بینک بیلنس بھی۔ انہوں نے چھوٹتے ہی کہا "بخشی ہوئی دولت سے پھوکٹ کا نکاح اچھا ہے۔ یہ جملہ ان کے اوپر ایسا چسپاں ہوا کہ جدھر جاتے لوگ یہی دہراتے۔

انہوں نے بنگلہ سیکھ لی تھی اور اپنی خوش مزاجی اور فطری حاضر جوابی سے سب کے دل جیت لیے تھے۔ ایک بنگالی دوست نے اپنے رشتہ دار کا معقول سا گھر مناسب کرائے پر اپنے ہمسائے میں دلوا دیا حالانکہ مشرقی پاکستان میں شروع سے بنگالیوں کا غیر بنگالیوں (جو سارے بہاری کہے جاتے تھے) سے کوئی بھائی چارہ یا زیادہ انسیت نہیں تھی۔ بنگالی بہاریوں سے لین دین کرنے یا گھر کرائے پر دینے سے ہچکچاتے تھے۔

گرمیوں کی چھٹی میں ہم لوگ ہزاری باغ گئے تو انہوں نے ابا سے مدد لے کر فارسی میں ایم۔اے کی نہ صرف تیاری کی بلکہ عروض و بلاغت کی اتنی مشق کی کہ استادی حاصل کر لی۔ فارسی ایم۔اے میں فرسٹ کلاس لا کر سبزواری صاحب کے چیلنج کا جواب دیا جنہوں نے کہا تھا پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں فرسٹ ہو گئے یہاں فرسٹ کلاس لاؤ تو جانیں اللہ نے لاج رکھ لی۔

ایک دن یہ کلاس میں گئے تو لڑکوں نے بیک زبان ان سے درخواست کی کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے اِس شعر کی تقطیع کر دیجئے۔

میری ہنسی ہنسی نہیں میری خوشی خوشی نہیں ترے بغیر زندگی جبر ہے زندگی نہیں

انہوں نے کہا یہ 'ترے' نہیں 'تیرے' ہے۔ ترے پڑھو گے تو مصرعہ غلط ہو جائے گا۔ میٹر سے گر جائے گا۔ انہوں نے 'تیرے' کر کے تقطیع کر دی بحر کا پتہ چل گیا۔ مگر کوئی منچلا شادانی صاحب کو بھی رپورٹ دے آیا۔ ان کو اپنی پی ایچ ڈی کی تیاری کے سلسلے میں برابر شادانی صاحب کے پاس جانا ہوتا تھا۔ اب کے گئے تو چھوٹتے ہی اُنہوں نے شکریہ ادا کیا۔ یہ حیران! تب کہا آپ نے تین لڑکوں کی کلاس کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔ تب یہ سمجھ گئے کہ تقطیع والا قصہ تین لڑکوں کی کلاس سے کسی شادانی صاحب کے مداح نے ان تک پہنچا دیا تھا۔

ان کو احساس ہوا کہ عروض و بلاغت کا علم آسان اور دلچسپ ہوتے ہوئے بھی اس موضوع پر کتابیں اتنی بھاری بھرکم اور دقیق ہیں کہ طلباء کی طبیعت اس طرف نہیں جاتی ہے۔ اس علم کو سیکھنے اور اشعار پرکھنے کے لیے اُردو میں آسان اور سادہ کتاب ہونی چاہیے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ابا کی مدد سے انہوں نے بہت مفید دلچسپ اور آسان کتاب 'رہنمائے سخن' کے نام سے تیار کر کے چھپوالی۔ دیباچہ شادانی صاحب سے لکھوایا۔ ڈھاکہ اور راجشاہی یونیورسٹیوں میں یہ انٹر سے لے کر ایم۔ اے تک کے کورس میں لگ گئی۔

معزالدین صاحب اپنے ساتھیوں میں بنگلہ بولنے اور لوگوں کے کام آنے کی وجہ سے ایسے گھل مل گئے تھے اور اتنے مقبول تھے کہ ان لوگوں نے اصرار کر کے ان کو کالج ایسوی ایشن کا سیکریٹری بنا دیا تھا۔ ایک بار رات کو کلاس لے کر یہ گھر آنے لگے تو نظر پڑی دو لڑکے کھڑے رو رہے ہیں۔ سائیکل سے اُتر کر انہوں نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ دونوں اردو اسپیکنگ ہیں۔ وائس چانسلر انہیں داخلہ دینے سے انکار کر رہا ہے کہ آپ کے نمبر کم ہیں حالانکہ Grace Marks ملا کر مطلوبہ نمبروں سے زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اگر داخلہ نہیں ملا تو کہیں کے نہ رہیں گے۔ انہوں نے

ان سے کاغذات لیے اور گھر کے بجائے سائیکل واپس وائس پرنسپل کے دفتر کو موڑ دی اور اسے درخواستیں دیکھا کر پوچھا ''آپ نے ان لوگوں کو داخلہ سے کیوں انکار کیا ہے؟'' لاپرواہی سے بتایا ''ان کے نمبر کم ہیں۔ میں Grace Marks نہیں مانتا'' یہ سیدھے پرنسپل کے پاس پہنچے ان سے کاغذ پر لکھ کر تصدیق کی ''کیا گریس مارکس کا داخلہ کے نمبروں میں شمار نہیں ہوتا ہے؟ اس نے اسی پر جواب لکھ دیا "Why not" یہ وائس پرنسپل کے پاس آئے وہ سب کچھ سمیٹ کر اُٹھ ہی رہا تھا۔ انہوں نے پرنسپل سے تصدیق شدہ کاغذ دیکھایا تو اب تو آفس کا وقت ختم ہو چکا آج آخری دن تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے اور کہا یہ درخواستیں آپ کے پاس وقت پر آئی تھیں۔ آپ نے بیکار توجیہہ میں وقت ضائع کیا اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ ان درخواستوں کو وصول کریں اور انہیں آج کی ڈیٹ میں داخلہ دیں۔ اس نے غصے میں رجسٹر ان کے سامنے پٹخ دیا تم ہی ان کا نام اس میں لکھ دو۔ انہوں نے رجسٹر کھسکایا کہا لکھنا تو آپ کو ہی ہوگا۔ تب بڑبڑاتے ہوئے رجسٹر میں ان کے نام درج کیے۔ رسید بنا کر دی۔ یہ تھینک یو کہ کر اٹھ گئے۔ لڑکوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

وائس پرنسپل سے جھڑپ کے بعد ان کو احساس ہوا کہ کالج کے پرنسپل اور وائس پرنسپل دونوں ہندو ہیں۔ ان کی monopoly ہے۔ لوگوں نے انہیں بتایا کہ پاکستان بننے سے پہلے جگن ناتھ کالج کا یہ حال تھا کہ ایک بار بوڑھا غریب مسلمان (غریب مسلمانوں کی اکثریت تھی) شامت کا مارا مرغی پکڑے کالج کے میدان سے گزرا۔ ان متعصب مذہب کے ٹھیکیدار ہندوؤں نے اس کی مرغی تو پھینکوائی ہی اسے تپتی دھوپ میں مرغا بنوا کر کھڑا کر دیا۔ وہ دہائی دیتا رہا آخر ڈی ہائیڈریٹ ہو کر مر گیا۔ اس کے رشتہ داروں کی ہمت نہیں تھی کہ اس کے خلاف کچھ کرتے۔ بہر حال یہ پھر ڈبلو بی قادری کے پاس وائس پرنسپل کا معاملہ لے کر گئے۔ انہوں نے بھی ان سے اتفاق کیا اور کالج کے ایک تجربہ کار مسلمان پروفیسر کا تقرر بطور وائس پرنسپل عمل میں آیا۔

اسی طرح ایک بوڑھے ہندو چپڑاسی کا معاملہ ہوا۔ برسوں سے وہی بینک میں پیسہ جمع

کرانے جاتا تھا۔ لاکھوں کی رقم ہوتی۔ ایک بار بارہ سو روپے کی کمی کا انکشاف ہوا۔ متفقہ طور پر یہ لوگ اسے پولیس کے حوالے کر رہے تھے۔ اور وہ بیچارہ زار و قطار رو رو کر اپنی بے گناہی کا اظہار کر رہا تھا۔ انہوں نے دخل اندازی کی کہا "یہ اتنے عرصے سے بینک میں لاکھوں کی فیسیں جمع کراتا رہا ہے کبھی ایک پیسہ ادھر اُدھر نہیں ہوا۔ اسے زیادہ سے زیادہ سزا دیں کہ اس کی تنخواہ سے قسطوں میں پیسے کاٹ لیں"۔ لوگوں نے کہا یہ آج ہی بارڈر پار کر کے ہندوستان چلا جائے گا۔ کون اس کی گارنٹی دے گا۔ انہوں نے کہا میں اس کی گارنٹی دیتا ہوں اگر بھاگ گیا تو میری تنخواہ سے یہ رقم کاٹ لی جائے۔" پھر آخر اس کی گریجویٹی ہوگی؟ بات معقول تھی لوگوں کو تعجب ہو رہا تھا کہ اتنے پرانے ہندو وائس پرنسپل کو تو دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیا اور ہندو چپراسی کے ضامن بن گئے۔ انہوں نے انصاف کا تقاضا پورا کیا تھا۔ وہ چپراسی ایسا معتقد ہوا کہ یہ جیسے ہی کالج آتے ان سے سائیکل تھام کر کھڑی کرآتا اور چابی ان کو دے دیتا۔ ایک دن چابی تھماتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھ کر ان سے آہستہ سے بولا "صاحب میرے بال بچے تو ہیں نہیں میں مولوی صاحب کے پاس جا کر مسلمان ہو جاتا ہوں میری بیوی بھی تیار ہو گئی ہے۔ انہوں نے الحمدللہ کہہ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

CSS کے امتحان کا یہ ہوا کہ یہ پوری دلجمعی سے امتحان کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ کہ والد صاحب کی بیماری کی اطلاع ملی۔ کالج سے چھٹی لے کر ڈھاکہ سے بازید پور پہنچے۔ والد صاحب کی حالت واقعی نازک تھی۔ انہی دنوں ان کا CSS کا امتحان تھا۔ ظاہر ہے وہ ابا سے زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ ان کی دسہرے کی چھٹیوں کے صرف چند دن رہتے تھے۔ ان کی باہمت والدہ نے اصرار کر کے ان کو ڈھاکہ بھیج دیا کہ چھٹی میں آجانا۔ یہ بھی بادلِ نخواستہ چلے گئے۔ CSS کے امتحان کی پروا بھی نہیں کی۔

کالج بند ہوتے ہی عزم سفر کیا۔ رات کو کلکتے سے ٹرین پر بیٹھے تو اُونگھ آگئی ان کو لگا کسی نے ان کا اٹیچی کاٹ کر سارے پیسے نکال لیے ہیں۔ چونک کر اُٹھے اٹیچی تو سالم تھی مگر دل دھڑک رہا تھا پتہ نہیں ابا کیسے ہیں۔ سدیسو پور اسٹیشن پر پہنچے تو اسٹیشن ماسٹر دوڑا ہوا ان کے پاس آیا اور کہا "ابھی

تھوڑی دیر ہوئی آپ کا بھتیجا آپ کو ٹیلی گرام دینے آیا تھا کہ آپ کے والد کا رات دو بجے انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اگلے سال یہ CSS کے امتحان میں پوری تیاری کے ساتھ بیٹھے۔ دو دو کالجوں میں دن، رات کی کلاسیں لے کر بھی فرسٹ ہوئے۔ معلوم ہوا کہ Viva دینے کے لیے Non Subversive Activities کا سرٹیفیکیٹ اپنے کالج سے جہاں سے گریجویشن کیا ہے لے کر آنا ضروری ہے۔ پٹنہ کالج اور لاء کالج کو خط لکھے۔ حالانکہ اتفاق سے اس وقت دونوں کالج کے پرنسپل مسلمان تھے پٹنہ کالج کے کلیم احمد بھائی تھے لاء کالج کے کوئی اور تھے مگر دونوں نے اس طرح کے سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کردیا کہا کہ "یہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ تم نے آزادی کے لیے اور پاکستان بنوانے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ یہ تو تمہارے حق میں جاتا ہے Non Subversive Activities کا سرٹیفکیٹ ہم لوگ کیسے دے سکتے ہیں؟

بہر حال پٹنہ کالج کے وائس چانسلر کلیم احمد صاحب نے ان کو مطلوبہ سرٹیفکیٹ نہیں دیا۔ اور ان کو اپنے دیرینہ خواب سے دستبردار ہونا پڑا جس کے لیے انہوں نے شروع سے اتنی پلاننگ کر رکھی تھی۔ یہ CSS کے وائیوا میں شریک نہ ہوسکے۔ راضی بہ رضائے الٰہی رہے۔ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تیاری میں لگے رہے۔ اللہ نے انہیں اس سے زیادہ عزت سے نوازا آخر میں ان کے آئی جی، ڈی آئی جی اور سی ایس پی دوست ان پر رشک کرتے تھے۔

دس سال جگن ناتھ کالج میں کام کر کے یہ اکتا چکے تھے۔ پی ایچ ڈی میں ان کے سپروائزر شادانی صاحب تھے۔ ان کے کام میں تندہی، محنت اور لگن کا وہ خود اعتراف کرتے تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں جب جگہ خالی ہوئی تو ویسے تو اس کے امیدواروں کی کمی نہیں تھی۔ اس عرصے میں انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی تھی اتفاق سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے ساتھ یہ واحد امیدوار تھے۔ دو ہی سال کے بعد ریڈر کی جگہ خالی ہوئی لوگوں نے جوڑ توڑ شروع کیا اور سردھڑ کی بازی لگا دی۔ بنگلہ زبان پر دسترس حاصل کرنے کی وجہ سے لوگ بہت قدر کرتے تھے۔ ایک بار بنگالی ڈیپارٹمنٹ

میں کوئی سیمینار منعقد ہوا تھا اس کی ہیڈ ایک بنگالی خاتون تھیں۔ انہیں بولنے کو کہا گیا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ تمام اردو دان استادوں کی طرح یہ بھی انگلش کا سہارا لیں گے مگر انہوں نے شستہ بنگالی میں تقریر کر کے سب کو حیران کر دیا۔

اسی طرح یونیورسٹی کونسل کے ممبر کے لیے بھی لوگوں نے ان کی ہمت بندھائی اور کھڑا کر دیا۔ آفتاب صاحب جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں بائیس سال سے تھے انہوں نے بہت مخالفت کی کہ "ہار جائیں گے تو ڈیپارٹمنٹ کی بھی بدنامی ہوگی سبزواری صاحب کھڑے ہوئے تھے تو ان کو صرف تین ووٹ ملے تھے کس قدر لوگوں نے مذاق اڑایا تھا۔ شادانی صاحب نے ان کی ہمت بندھائی "معزالدین سبزواری صاحب نہیں ہیں۔ ہار اور جیت تو کسی نہ کسی کی ہوتی ہی ہے۔ تجربہ ہی ہو جائے گا۔ یہ کھڑے ہوئے اور سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے۔

۱۹۶۲ء میں ان کو لندن اسکول آف اورینٹیل اسٹڈیز سے لسانیات میں پی ایچ ڈی کرنے کا اسکالرشپ ملا۔ ڈھاکہ میں ہمارا کوئی گھر بار تو تھا نہیں۔ یونیورسٹی کا فلیٹ بھی ان کے جانے کے چار مہینوں بعد ہمیں خالی کر دینا تھا۔ ایسے میں ہم نے بچوں کو لے کر ان کے ساتھ لندن جانے کا پروگرام بنایا۔ ہم لوگ ۷ ستمبر ۱۹۶۳ء کو لندن پہنچے۔ یہ پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے وہاں لسانیات میں ایم فل میں داخلہ لیا۔ لسانیات نیا سبجیکٹ تھا۔ جان توڑ محنت سے یہ کامیاب ہو گئے۔ اتنی محنت نے ان کی صحت پر اثر کیا تھا۔ ہسپتال میں بھی داخل ہونا پڑا میں بچوں کو تنہا چھوڑ کر اسکول کے بعد ان کے پاس جاتی۔ شکر ہے جلد ہی گھر آ گئے۔

انہوں نے اپنا مقالہ جمع کرا دیا۔ ممتحن ان کے کام سے بہت خوش ہوئے ایک نے تو ریمارک دیا کہ "اس پر تو پی ایچ ڈی ہونی چاہیے تھی۔ قائم چاندپوری پر پی ایچ ڈی تو یہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر شادانی کے زیر نگرانی کر ہی چکے تھے۔ ایم۔ فل ہی کو غنیمت سمجھا۔
Word Phoneme in urdu پر ایم فل کی ڈگری کے ساتھ ۱۹۶۴ء میں واپس ڈھاکہ پہنچے۔

ڈھاکہ کی فضاء بالکل بدلی ہوئی پائی۔ بنگالی نیشنلزم کا ہر طرف چرچا تھا۔ مغربی پاکستان کی

زیادتیوں کے سب شاکی تھے۔ بنگلہ پر بہت زور دیا جارہا تھا۔ ہمیں اپنی بنگلہ دانی سے اطمینان تھا کہ ہم تو ان کے ساتھ گزارا کرہی سکتے ہیں۔ بچوں کی دوستیاں بنگالی بچوں سے تھیں وہ بنگلہ زبان بالکل بنگالیوں کی طرح بولتے۔ کوئی تمیز نہیں کرسکتا تھا کہ یہ اردو اسپیکنگ بچے ہیں۔۱۹۶۵ء کی انڈیا سے سترہ دنوں کی جنگ کے دوران ہم لندن ہی میں تھے۔

مشرقی پاکستان کے حالات تیزی سے ابتری کی طرف جارہے تھے۔ ایسٹ پاکستان رائیفل EPR پاکستان کے خلاف مکتی باہنی سے مل گئی تھی۔ جن کی پُر تشدد کاروائیاں زور پکڑ گئیں تھیں۔ انہوں نے ہندوستان کے بارڈر سے قریبی علاقوں پر زور شور سے کاروائی شروع کردی۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کا فضائی رابطہ ختم ہوگیا۔

یہیں پر ڈاکٹر معزالدین کی زندگی کا یک باب ختم ہوگیا۔ زندگی کی نئی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۴ء تک اقبال اکادمی کے ڈائریکٹر رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد چودہ سال سرسید سائنس کالج کے انتہائی کامیاب بانی پرنسپل کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔

*****

رومی معز

میرے والد میرے سب سے بڑے رہنما اور استاد

سفر کے دوران جب میرے والد ڈاکٹر محمد معزالدین کی وفات کی خبر مجھ تک پہنچی تو مجھے اپنی بیٹی سے ملے ہوئے چند ہی گھنٹے ہوئے تھے۔ ایسے موقع پر اپنے باقی اقربا کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ والد کی یاد میں میرا دل چاہا کہ اپنی بیٹی سے اس کے دادا کے بارے میں ہی باتیں کرتا رہوں۔ تو میں اسے ان کے بارے میں بتانے لگا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میری زندگی کے ہر موڑ پر وہ میری رہنمائی کے لیے موجود ہوتے۔ اس وقت مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میرے سب سے بڑے استاد در اصل وہی تھے۔

باوجود اس حقیقت کے کہ میں کبھی ان کے علمی جوہر سے فیض یاب نہ ہو سکا۔ جب کبھی میں امتحان سے پہلے اردو پڑھنے کے لیے ان کے پاس جاتا تو وہ اس گہرائی میں چلے جاتے کہ مجھے وقت کی قلت کے سبب اپنے باقی سائنسی اسباق کی فکر لاحق ہونے لگتی۔ اور یوں میں ان سے پڑھنے سے قاصر رہا۔

ان کے انتقال سے ایک دن پہلے ہی میں یورپ پہنچا تھا جہاں مجھے سب سے پہلے اپنی بیٹی سے Amsterdam میں مل کر پھر جرمنی پہنچنا تھا۔ ایمہ کو ابھی صرف دو ماہ ہوئے تھے سکالرشپ لیے ہوئے۔ اس اچانک خبر کو سنتے ہی میں فوراً واپسی کی کوشش میں لگ گیا مگر میں ۲۴ گھنٹے سے پہلے اسلام آباد نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اگرچہ یہ میری طبیعت پر بہت گراں گزرا، لیکن میں اپنی والدہ محترمہ کی اس خواہش کے احترام میں اور اپنے والد کی میت کو تکلیف سے بچانے کے لیے ان کی اُسی دن تدفین کر لینے پر آمادہ ہو گیا۔ ساتھ ہی میں اپنی ماں کے اس قول پر بھی عمل کرنے پر آمادہ ہو گیا کہ وہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ تم اپنی ذمے داری مکمل کیے بغیر لوٹ آؤ۔ اس فیصلے کے بعد

میں اور میری بیٹی ایمہ Vangah muaam کا پروگرام ترک کر کے Amsterdam میں مسجد کی تلاش میں چل پڑے۔ یہ جان کر خوشگوار تعجب ہوا کہ Amsterdam میں بیسیوں مساجد موجود ہیں۔ ہم پیدل ہی چل پڑے۔ راستے میں باغات اور Canals کے درمیان ہم چلتے جا رہے تھے۔ ہفتے کا دن تھا رش بھی نہیں تھا۔ اپنے والد کی باتیں جب شروع کیں تو سب سے پہلے مجھے ابو بنِ ادہم کی نظم جو کبھی بچپن میں پڑھی تھی یاد آئی۔ اس میں ایک فرشتے کا ذکر ہے جو رات کو ابو بن ادہم کو نظر آیا۔ اُس وقت وہ ان لوگوں کی فہرست تحریر کر رہا تھا جو اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ اس فہرست میں ابو بن ادہم کا نام شامل نہ تھا۔ انھوں نے فرشتے سے درخواست کی کہ وہ ان کا نام اس فہرست میں ڈال دے۔ جو اللہ کے بندوں سے سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ اگلی رات وہی فرشتہ دوبارہ نمودار ہوا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں ایک اور فہرست تھی۔ یہ فہرست ان لوگوں کی تھی جن سے اللہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ ابو ابنِ ادہم کا نام اُس میں سرِ فہرست تھا۔

میں نے ایمہ سے کہا کہ ابو بن ادہم کا قصہ اس لیے میں نے سنایا کیونکہ تمہارے دادا انتہائی انسان دوست شخص تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم ابھی اپنی اعلیٰ تعلیم کا آغاز کرنے کے لیے یورپ پہنچی ہو۔ تمہارے دادا نے ۱۹۶۴ میں Post Doctorate وظیفہ پر یورپ میں پہلی دفعہ قدم رکھا تھا۔ لندن میں بحیثیت ایک طالب علم کے انھوں نے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس کا نام انجمنِ ترقی اُردو ہے وہ آج بھی موجود ہے۔ اپنی محنت اور لگن سے ۱۹۸۱ تک علامہ اقبال اور رومی جیسے فلسفیوں پہ اتنا کام کیا کہ حکومت نے یورپ کی مایۂ ناز Cambridge University میں اُن کو اقبال Chain سے نوازا۔ اس طرح یورپین Unversities میں وہ لیکچر دیتے اور وہاں کے لوگوں کو علم سے فیض یاب کرتے۔

اس کے یہ وہی دادا ہیں جنھوں نے ایک چھوٹے سے گاؤں سے تعلیم کی ابتدا کی، اپنے شوق اور لگن کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ عُہدوں پر فائز رہنے کے باوجود چھوٹے ہوں یا بڑے ہر کسی سے انکسار اور خوش اخلاقی سے ملتے کہ لوگ ایک ہی ملاقات میں ان سے متاثر ہو جاتے۔

اللہ پر بھروسہ اور اپنے اندر خود اعتمادی'' ان کا Motto تھا۔ میری دادی ان کے بچپن کے قصے سناتیں کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے باغ کا ایک پھل بھی توڑے لیکن اس کے برعکس میں نے تو انھیں انتہائی شفیق اور درگزر کرنے والا پایا۔ غالباً انھوں نے قرآن کا مطالعہ اور اقبال، رومی اور Goethe جیسے لوگوں کے فلسفے کو نہ صرف پڑھا، پڑھایا، بلکہ سمجھ لیا تھا زندگی میں وہ تکبر اور لالچ جیسی انسانی کمزوریوں سے خود کو بالاتر رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

ایک کو میں نے لاہور ایئرپورٹ کا قصہ سنایا جہاں میں اپنے والد کو Recieve کرنے گیا تھا تو ایک خوش پوشاک شخص اس قدر عقیدت سے ان کا سامان اٹھانے پر بضد تھا کہ میں حیران تھا۔ یہ شخص ایک بڑے ادارے کا سربراہ تھا اور اس کا کہنا تھا کہ ''سر میں آپ کی مدد کے بغیر کبھی انجینئر نہیں بن سکتا تھا۔ جب میرے والد ایک لیکچرار کے طور پر جگن ناتھ کالج میں پڑھاتے تھے تو ہندو پرنسپل کے داخلے سے انکار کرنے پر ابو نے دو لڑکوں کو کالج کے باہر روتا دیکھا۔ ان کے Grace Marks قبول نہ کرنے کے عذر پر ان کا داخلہ نہیں ہونے دیا جا رہا تھا۔ ابو نے ان کی وکالت کی اور Education Board سے اسی وقت Rules نکلوا کر ان کا داخلہ کرا دیا تھا۔ دوسری طرف اسی کالج کا ہندو چپراسی اپنی بیوہ بہن کے لیے Visa لینے میں ناکام ہوا تو اس کو دلوا کر ہی دم لیا۔

مجھے سقوط ڈھاکہ سے پہلے ڈھاکہ University میں ملٹری ایکشن والی رات بھی یاد ہے۔ ایک کثیر تعداد میں بنگالی خواتین نے ہمارے گھر میں پناہ لے رکھی تھی۔ میرے والدین نے ان کی مدد کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی ڈھاکہ سے آنے کے بعد میں ان کے ہمراہ ایک بزرگ سے ملا جو بستر مرگ پر تھے۔ یہ مولانا تمنا تھے جو مشہور شاعر تھے۔ ان کی بیگم کا انتقال چند دن پہلے ہی ہوا تھا انھوں نے بتایا کہ ان کی بیگم کے لب پر اللہ کے بعد میری ماں کا نام ہی رہتا تھا۔

میرے دریافت کرنے پر پتا چلا کہ ان کی بیگم کی پہلی شادی ایک نواب سے ہوئی تھی۔ جو ۱۹۴۷ء کے Partition کے وقت شہید کر دیے گئے تھے اور وہ لٹ پٹ کر ڈھاکہ پہنچیں میری ماں نے ان کو سکول میں نوکری دلا دی تھی مگر کچھ عرصے بعد ہی ان کی بینائی چلی گئی تھی۔ ان کی عزت

نفس کی خاطر میرے والدین نے ان کو ظاہر کیا کہ اسکول سے Pension ملتی رہے گی جب کہ وہ اپنی جیب سے ان کو تنخواہ دیتے تھے۔ مولانا تمنا ایک خوشحال اور باعزت شہری تھے جب ان کی بیگم کا انتقال ہوا تو میرے والدین نے کوشش کر کے ان کی آپس میں شادی کرادی۔ مولانا صاحب نے ان کا علاج کرایا اور ان کی بینائی بھی بحال ہوگئی۔ ان کی بقیہ زندگی بہت خوشگوار گزری اسی لیے ان کے لب پر میرے والدین کے لیے دعائیں رہتیں۔

میں نے اپنے والد کو کبھی مایوس نہ دیکھا بڑے سے بڑے مشکل وقت میں وہ اپنے motto پر ڈٹے رہتے اور ہمیشہ عزت سے اپنا سر اٹھا کر رکھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اللہ کے نزدیک تھے اور اس کے احکام پر کاربند رہے۔

ایمہ کو میں نے ایک اور شام کا قصہ سنایا جب ایک صاحب ہمارے گھر آئے اور انھوں نے ابو کو مشورہ دیا کہ printing ink پر کسٹم ڈیوٹی بہت ہے۔ ابو کے نام پر اگر ایک ادبی رسالہ رجسٹر کریں اور سیاہی اس طرح کم ڈیوٹی پر برآمد کی جائے جسے بازار میں مہنگے دام بیچ کر منافع کمایا جا سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے میرے والد نے انھیں ادب کے ساتھ رخصت کیا اور کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں حلال کماتا ہوں اور سکون سے سوتا ہوں۔ آپ کی اس پیش کش سے میں دونوں چیزوں سے محروم ہو جاؤں گا۔

میں اپنے والد کو اپنا استاد اس لیے کہتا ہوں کہ ان کے عمل، قول اور لوگوں سے معاملات کرنے کے طریقے دیکھ کر میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

مجھے انجینئر بننے کا شوق تھا مجھے Readers' Digest کا ایک شمارہ بے حد پسند آگیا تھا۔ یہ کتاب میری زندگی کی شائد پہلی محبت تھی۔ آج بھی یہ میرے پاس ہے۔ میں نے اسے بغیر کسی سے پوچھے آڈر کر دیا تھا۔ ایک دن میری غیر موجودگی میں یہ C.O.D کے تحت پہنچ گئی میں جب گھر پہنچا تو میرے والد نے صرف یہ کہہ کر بیٹے اتفاق سے روپے میرے پاس تھے تو میں اس کی قیمت ادا کر سکا۔ آئندہ مجھے قبل از وقت بتا دینا۔

ایک اور سبق مجھے انھوں نے سکھایا کہ کبھی کسی پر بغیر سوچے بھروسہ نہیں کرنا چاہیے اور اپنی چیزوں کی حفاظت خود کرنی چاہیے۔ ہوا یوں کہ جب میرا امریکہ میں داخلہ ہو گیا تو زندگی میں پہلی مرتبہ میرا مختلف دفاتر سے واسطہ پڑا۔ مجھے سٹیٹ بینک کی اجازت کے ساتھ tuition فیس کے لیے پے آرڈر بنوانا تھا۔ میرے والد نے Provident Fund سے قرضہ لے کر بینک میں ڈلوایا تھا۔ میں پہلی دفعہ اپنے والد کے ہمراہ بینک گیا تھا۔ بینک کا مینجر ان کے استقبال کے لیے باہر آیا اور احترام سے انہیں اپنے دفتر تک لے گیا۔ مجھے چیک تھما کر وہ مجھے مینجر کے پاس چھوڑ گئے۔ کاروائی اس دن ہو نہ سکی۔ میں نے کراس چیک مینجر کے میز پر چھوڑ دیا۔ جب شام کو میرے والد نے پوچھا کہ کام ہو گیا تو میرے بتانے پر انھوں نے صرف یہ کہا کہ اگر مینجر کل یہ کہے کہ میں نے آپ کے بیٹے کو پیسے دے دیے تھے تو تم کیا کرو گے؟ اُس عمر میں میرے لیے ایک اہم سبق تھا جو کہ ساری زندگی میرے کام آئے گا۔ بچپن سے اپنے والد کو اقبال اور قائداعظم کا گرویدہ پایا۔

میں جب امریکہ پہنچا تو Semester کے شروع ہونے سے پہلے پاکستانی طالب علموں کے ساتھ ایک محفل میں یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ لڑکے گاندھی جی کی تعریف کر رہے تھے اور قائداعظم پر بہتان لگا رہے تھے۔ اس موقع پر بھی میں اپنے اسی استاد کی رائے لی اس کا انھوں نے انتہائی جامع جواب دیا، دلیلوں اور facts کے ساتھ۔ میں نے اس خط کی نقل PakEmbassy کو ارسال کر دی Ambassador Ejaz Azeem نے مجھے بتایا کہ انھوں نے والد صاحب کی اجازت کے بغیر ان کے خط کی کاپیاں پاکستان کی تمام Embassies کو بھیج دی ہیں تا کہ ہمارے طالب علم گمراہی سے بچ سکیں

امریکہ جانے سے پہلے میں نے کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں گزارا۔ اس وقت میں USA کے داخلہ کا انتظار کر رہا تھا تو مجھے کسی نے مشورہ دیا کہ تمہیں کئی Subjects کے Credits مل سکتے ہیں۔ جن سے امریکہ کی University میں فیس کی بچت ہو سکے گی۔ مجھے ایک سیاسی پارٹی کے لڑکوں نے کالج کا Letter Head بھی دے دیا اور پیش کش کی کہ جو Subjects اور Grades چاہو اس پر لکھ کر دے دو۔ دستخط اور مہر لگوانا ان کی ذمہ داری

ہوگی۔ میرے والد کو اس کا پتا لگا تو ڈانٹنے کے بجائے مجھے سمجھایا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہو سکے گی مزید یہ کہ کیا تم اپنے مستقبل کا آغاز جھوٹ سے کر کے فلاح پا سکو گے۔؟

دو موقعوں پر ان کو عمدہ پلاٹ سے نوازا گیا پر انھوں نے کاغذات واپس کر دیے۔ جام صادق نے انھیں ۲۰۰۰ گز کا پلاٹ کے ڈی اے کالونی میں الاٹ کیا تھا جس کو شکریے کے ساتھ واپس کر دیا کہ بیٹی کی شادی کرنی زیادہ ضروری ہے اور کاغذ کا کاروبار ان کو گوارا نہ تھا کہ کسی سے سودا بازی کرتے۔ لاہور میں میاں صلی نے جوان کی بہت عزت کرتے Defence Lahore کے دو پلاٹ الاٹ کیے مجھے امریکہ بھیجنا ان کے لیے زیادہ اہم تھا۔ ان سے کوئی پوچھتا کہ آپ نے مکان بنایا تو فخر سے کہتے کہ ہاں میرے تین بیٹے ہیں یہ میرے مکان ہیں۔ الحمد اللہ میں اپنا اور اپنے بھائیوں کا تو کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے ان کے ہاتھ مضبوط کیے۔ انھوں نے اور ان کی بیویوں نے ان کی بڑی خدمت کی۔ ان کی آخری رسومات کے فرائض بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ انھوں نے جو گھر اس دنیا میں بنائے وہ ان کے نیک اعمال تھے جس سے لوگ آج بھی انھیں یاد رکھتے ہیں۔ کراچی میں ایک نمائش میں جب میں نے اقبال اکیڈمی کے سٹال سے بچوں کے لیے کئی کتابیں خریدیں تو میرے بیٹے نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میرے دادا ابو کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اس پر وہاں کے عملے نے پوچھا کہ اس کے دادا کون ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ انھیں نہیں جانتے ہونگے وہ آپ کے ادارے سے بہت پہلے منسلک تھے۔ ان کا نام سنتے ہی اس نے رسید پھاڑ دی اور میرے بیٹے کو کہا کہ یہ آپ کے دادا کی طرف سے تحفہ ہے۔ جو میں آپ کو دے رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ ان جیسا دیانتدار اور قابل افسر میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہم ان کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ کے دربار میں بھی فرشتے ان کا عزت اور احترام سے ذکر کریں اور ان کی انسان دوستی آخرت میں ان کو اللہ کے قرب کا ذریعہ بنائے (آمین)

جس وقت میں اور میری بیٹی ایمسٹریم کی مسجد میں پہنچے اور اُن کے حق میں دعا کرائی۔ اسی

وقت میرے دو بھائیوں نے ایک عظیم اُستاد کو سپردِ خاک کیا۔ اس لمحے مجھے یہ خیال آیا کہ ان کی ایک پوتی یورپ میں اور ایک پوتا چین میں علم کے سفر پر نکلے ہیں۔ ان کی جلائی ہوئی شمع اس وقت IBA کراچی سے لے کر M.I.T. USA تک رشنی پھیلا رہی ہے۔ اور یوں زندگی کی گاڑی کے پہیے چلتے رہیں گے۔ روشنی دیکھانے والی مشعل کے ہاتھ بدلتے جائینگے۔

ڈاکٹر پروین صادق چوہدری (متحدہ عرب امارات)

''کُل نفسٍ ذائقۃ الموت''

''ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے''۔ بے شک موت برحق ہے موت ہمارے پیاروں کو ہم سے جدا کر دیتی ہے اور ان کی جدائی ہماری آنکھوں کو پرنم کر دیتی ہے۔ جدائی کی ایسی ہی ایک گھڑی کی خبر جو مجھے ساکت کر گئی وہ خبر ڈاکٹر معزالدینؒ کی وفات کی تھی جب میری ہمشیرہ نسرین کوثر نے مجھے پاکستان سے اطلاع دی کہ آج ڈاکٹر معزالدین کا انتقال ہو گیا ہے تو لبوں سے انا للہ وانا الیہ راجعون نکلا اور آنکھیں بے اختیار نم ہو گئیں۔

ڈاکٹر معزالدین نہایت نیک، ایماندار پابند صوم وصلوۃ اور اللہ سے محبت رکھنے والے انسان تھے۔ اردو ادب کے حوالے سے انکا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ''الاقرباء'' سے دلی لگاؤ ان کی انتھک کاوشوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر معزالدین سے میری پہلی ملاقات سرسید کالج راولپنڈی صدر میں ہوئی۔ جب بحیثیت امیدوار اردو لیکچرار میں نے انٹرویو دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا انٹرویو لیا لیکن تب تک میں انھیں صرف ایک رکن انٹرویو کی حیثیت سے جان پائی تھی۔ جب گھر آئی تو شام کو ابا جان نے بتایا کہ آج ڈاکٹر معزالدین نے تمہاری بہت تعریف کی ہے کہ میرا سر فخر سے بلند ہو گیا ہے۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ شام ہی نماز میں حسب معمول مسجد میں ڈاکٹر معزالدین آئے اور انھوں نے تمہاری قابلیت کی داد دی ہے۔ یہ تھا میرا پہلا تعارف جو غائبانہ تھا اگر چہ وہ ہمارے ہمسائے تھے اور میں مشرقی اولاد کی طرح گھر سے سکول کالج کے علاوہ کم ہی نکلتی تھی سو ڈاکٹر معزالدین سے واقفیت نہ ہو سکی۔ رفتہ رفتہ وقت گزرتا گیا ار میں نے پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ لیا جب مقالہ کے نگران کے چناؤ کی باری آئی تو والد گرامی کے انتخاب کے مطابق میں نے ڈاکٹر معزالدین کو چنا اور میں ڈاکٹر صاحب کے گھر گئی اور یوں ڈاکٹر صاحب میرے استاد مقرر ہوئے اور ساتھ ساتھ انکل بھی بن گئے اور میں انھیں انکل

معزالدین کہنے لگی۔ آپ انتہائی خوددار، ملنسار علم وادب کا گوہر نایاب اور انسانیت کا وہ چراغ تھے جو بجھنے کے باوجود آج زمانے کی تاریکیوں کو مٹا رہا ہے۔ اگرچہ اردو زبان وادب کے حوالے سے آپ کی خدمات ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ تحقیق کے فن میں مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اردو ادب کی سیرابی کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

انکل معزالدین اور آنٹی سے میں جب بھی ملی انھوں نے میرے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''متحدہ عرب امارات میں اردو ادب'' کے حوالے سے انتہائی عرق ریزی سے معلومات فراہم کرائیں انہی دنوں انکل نے مجھے الاقرباء کے سرپرست منصور عاقل صاحب سے متعارف کرایا اور یوں ڈاکٹر صاحب کی محبت اور منصور عاقل صاحب کی ادب دوستی کے پیش نظر میرا تحقیقی کام الاقربا کی زینت بنا۔ مگر انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی میں گردش ایام کے باعث میرے مقالے کا عنوان ''متحدہ عرب امارات میں اردو ادب'' مسترد کر دیا گیا اور نیا عنوان ''بلاد عرب میں اردو زبان وادب'' منظور ہوا لیکن یونیورسٹی قوانین کے مطابق میرے نگران صرف یونیورسٹی کے استاد ہی بن سکتے تھے۔ سو ڈاکٹر معزالدین جو ایک انمول ہیرا اور اردو ادب کا ایک بڑا ستون تھے ان کی خدمات میرے مقالے کے نگران مقرر نہ ہونے کے باوجود اسی طرح جاری رہیں جیسے پہلے تھیں انھوں نے ایک بھی حرف شکایت لبوں سے نہ نکالا۔ وہ مرد درویش، حق آگاہ معاشرے کی ناہمواریوں کو بخوبی جانتے تھے۔ شاید دنیا اسی کا نام ہے کہ جب تک ہمارے سامنے لعل و گوہر ہوں ہم ان کی قدر نہیں جان پاتے لیکن نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی ہم ہتھلیاں ملنے لگتے ہیں کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

مرجائے تو بڑھ جاتی ہے انسان کی قیمت زندہ ہے تو جینے کی سزا دیتی ہے دنیا

اردو ادب کا ایک نایاب گوہر اور انسانیت کا نیّر تاباں آج ہم سے جدا ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی روح کو جنت کے باغوں میں جگہ عطا فرمائے اور ورثاء کو صبر جمیل۔ آمین

*****

سید منصور عاقل

پروفیسر ڈاکٹر محمد معزالدین ؒ۔ 'رفتید و لے نہ از دلِ ما'

غالباً سال ۱۹۷۸ء یا ۱۹۷۹ء میں وفاقی حکومت نے میری خدمات عاریتاً حکومت پنجاب کے حوالے کر دیں۔ لاہور سے ویسے ہی میری زندگی کی خوشگوار ترین یادیں وابستہ تھیں چنانچہ میرے لیے اپنے تبادلہ کی یہ خبر نوید جانفزا سے کم نہ تھی کیونکہ نوعمری سے نوجوانی تک بلکہ عہدِ جوانی کا ایک یادگار دور لاہور میں گزرا تھا جہاں میٹرک سے ایم۔اے تک تعلیم ہی حاصل نہیں کی بلکہ میری ادبی تربیت بھی اس شہرِ علم و حکمت کے مرہونِ منت ہے۔ چنانچہ فوراً ہی رختِ سفر باندھا اور پنجاب سول سکریٹریٹ لاہور پہنچ کر صوبائی حکومت کو رپورٹ کر دیا۔ پوسٹنگ کا مرحلہ بھی دو ایک روز میں طے ہو گیا کہ پنجاب کے محکمہ آرکائیوز کے سربراہ کی آسامی اس لیے خالی تھی کہ اکثر افسران اسے بوجوہ پُرکشش نہ سمجھتے تھے۔ میں نے اس آسامی پر تقرری بلا حیل و حجت قبول کر لی اور چند دنوں ہی میں مجھے اپنی خوش قسمتی کا احساس ہوا کہ برصغیر پاک و ہند میں دہلی آرکائیوز کے بعد پنجاب آرکائیوز (پاکستان) دوسرا عظیم الشان گنجینۂ معارف تھا جو لاکھوں کتب اور تاریخی دستاویزات پر مشتمل تھا۔

مجھے لاہور کی جن علمی و ادبی شخصیات سے شرفِ نیازمندی حاصل تھا۔ اِن ہستیوں میں جنابِ خلیل الرحمان داؤدی بھی شامل تھے جن سے میں اپنے طالب علمی ہی کے دور سے متعارف تھا۔ داؤدی صاحب ایک بلند پایہ محقق کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے اور مجلس ترقی ادب نے جس کے سربراہ جناب امتیاز علی تاج مرحوم تھے داؤدی صاحب کی اردو کلاسکس پر متعدد کتب شائع کی تھیں۔ چنانچہ اُنھیں کے توسط سے میں پہلی بار محترم ڈاکٹر معزالدین سے متعارف ہوا جو اُن دنوں لاہور میں ڈائریکٹر اقبال اکیڈیمی کے منصب پر فائز تھے۔ اِدھر میں نے پنجاب آرکائیوز کی ازسرِنو ترتیب و تنظیم کا کام شروع کر دیا تھا اور اِس ضمن میں مجلسِ استناد کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دے چکا تھا جو ملک کے بلند پایہ محققین اور اہل علم حضرات پر مشتمل تھی جن میں

پروفیسر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۔ ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر فارانی جیسی بلند و بالا شخصیات شامل تھیں۔ میں چند ہی ملاقاتوں میں ڈاکٹر معزالدین صاحب کی معارف پروری اور درویشی سے اس قدر متاثر ہو چکا تھا کہ میں نے داؤدی صاحب سے مشورہ کے بعد ڈاکٹر صاحب سے ''مجلس استناد'' کی رکنیت قبول فرمانے کی درخواست کی جسے اُنھوں نے اپنے مخصوص کرم گسترانہ انداز میں قبول فرمالیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت اتفاق یہ بھی پیش آیا کہ اُنہی دنوں صدر مملکت نے آرکائیوز کی علمی و تحقیقی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے وفاقی وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد افضل کی سربراہی میں آرکائیوز کی قومی پالیسی تشکیل دینے کے لیے وفاقی سطح پر ایک کمیشن مقرر فرمایا جس میں ملک کے بلند پایہ محققین اور سکالرز کو نامزد کیا گیا جن میں ڈاکٹر معزالدین صاحب بھی شامل تھے اور مجھے بلحاظِ عہدہ یہ اعزاز حاصل ہوا۔ کمیشن کی رفاقت کے دوران ڈاکٹر صاحب کی علمی شخصیت بالخصوص اُن کا اخلاص۔ صداقت پسندی۔ وضع داری اور سب سے بڑھ کر درویشی نے مجھے اپنا اس قدر گرویدہ بنالیا کہ یہ تعلق شب و روز کی ملاقاتوں۔ نشستوں اور محبت و مودت کے باہمی سلوک کے سائے سائے خوب پروان چڑھا اور قدرت نے یہ موقع بھی مہیا کر دیا کہ مجھے جب وفاقی حکومت نے محتسب کے حالیہ قائم شدہ ادارہ میں تعیناتی کے لیے واپس طلب کیا تو ڈاکٹر صاحب بھی وفاقی وزارت تعلیم سے وابستہ ہو گئے وہیں سے کیمبرج یونیورسٹی میں قائم شدہ اقبال چیئر پر نامزد ہوئے اور واپسی پر نیشنل ہجرہ کونسل کے سکریٹری مقرر ہوئے جس کے سربراہ معروف قانون داں جناب اے۔ کے بروہی تھے جہاں ڈاکٹر صاحب نے اپنی ذہانت و قابلیت کا ایسا سکہ جمایا کہ بروہی صاحب بھی اُن کے گرویدہ ہو گئے۔ ۱۹۸۴ء میں وفاقی حکومت کی ملازمت سے ریٹائر ہوا تو ڈاکٹر صاحب بھی ملازمت سے پنشن لے چکے تھے اور پھر قدرت نے ہم دونوں افراد ہی کو نہیں بلکہ ہر دو گھرانوں کو بھی شیر و شکر کر دیا۔ میں نے اکیسویں صدی کے آغاز یعنی جنوری ۲۰۰۱ء سے تحقیقی و تخلیقی مجلّہ سہ ماہی 'الاقرباء' کا اجراء کیا جسے بین الاقوامی سطح پر بھی زبردست پذیرائی ملی بلکہ دنیا کی معروف ترین یونیورسٹیوں بشمول

ہارورڈ یونیورسٹی آف امریکہ میں اردو شعبہ کے ریسرچ کے طلباء اور محققین کے لیے اس مجلّہ کا استعمال بطور کتاب حوالہ ہونے لگا۔ میری اس والہانہ علمی مہم میں ڈاکٹر صاحب بحیثیت سینئر ترین رکن مجلس مشاورت پوری سرگرمی سے مجھے تعاون و رہنمائی مہیا فرماتے رہے۔ دیگر اہل قلم کی نگارشات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب تسلسل سے اہم موضوعات پر تحقیقی مقالات و مضامین لکھتے رہے جس کے سبب الاقرباء کو الحمد اللہ ایک عالمی سطح کے تحقیقی مجلّہ کا اعزاز حاصل ہوا۔ ایسا بہت کم ہی ہوتا کہ اسلام آباد کی کسی بھی محفل میں ہم دونوں ہم نشین و ہم سخن نہ ہوتے بلکہ حکیم محمد سعید صاحب شہید پاکستان کی قائم کردہ مجلس شوریٰ میں کبھی شاذ ہی ایسا ہوتا کہ میں اور ڈاکٹر صاحب شریک نہ ہو سکتے اور کبھی میں یا ڈاکٹر صاحب تنہا پہنچتے تو اراکینِ شوریٰ تشویش کے ساتھ دریافت کرتے کہ خیریت تو ہے لیکن اب ڈاکٹر صاحب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں اور اب میں بھی اِس توقع پر زندہ ہوں کہ وقت آنے پر شاید دوسری دنیا میں بھی اُن کی گراں مایہ رفاقت میسر آجائے مگر وہ ایک پارسا اور متقی انسان تھے اور میں گنہگار! صرف اللہ تعالیٰ ہی گناہ گاروں کو بھی بخش سکتا ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اِس گھر کی نگہبانی کرے — اقبالؒ

ڈاکٹر گل ناز بانو

احمد ندیم قاسمی بحیثیت شاعر

احمد ندیم قاسمی ہمہ گیر اور رنگا رنگ شخصیت کے مالک، آپ افسانہ نگار، صحافی، ادیب، اور بلند پایہ شاعر بھی گویا آپ کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر فن میں ہیں یہ طاق انہیں کیا نہیں آتا'

احمد ندیم قاسمی ہماری ادبی تاریخ میں ایک مینار، ستون اور ایک تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے نہ صرف افسانہ نگاری میں اپنا لوہا منوایا بلکہ جدید اردو شاعری میں بھی منفرد و ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ اردو زبان میں آپ کا مقام مسلّم ہے آپ کی تعریف و توصیف کے محتاج نہیں ہیں۔ بقول سید ضمیر جعفری ''اس بات میں کیا شبہ ہے کہ اقبال کے بعد عصر جدید میں جو دو چار شاعر ماہ و سال کی سند پر ایک دوسرے کے دوش بدوش بیٹھنے کے لائق ہوئے ہیں ان میں ندیم شامل ہیں۔''

احمد ندیم قاسمی کے بہت سے مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں ان کا پہلا شعری مجموعہ 'دھڑکنیں' اور پھر یہی مجموعہ ترمیم اور اضافے کے ساتھ ۱۹۴۴ء میں ''رم جھم'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ''جلال و جمال''، ''شعلہ وگل''، ''دشت وفا'' اور ''محیط'' منظر عام پر آچکی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کے سربرآوردہ خاندان میں آنکھ کھولی۔ آپ کا خاندانی نام احمد شاہ ادبی نام احمد ندیم قاسمی اور تخلص ندیم ہے۔ آپ ۲۰ نومبر ۱۹۱۴ء میں بمقام انگہ تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا میں پیر غلام نبی عرف نبی چن کے ہاں پیدا ہوئے آپ کے والد متقی اور پرہیز گار شخص تھے آپ کا خاندان انتہائی دین دار اور مذہبی تھا۔ آپ صرف ۸ برس کے تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا تو آپ کے چچا پیر حیدر شاہ مرحوم نے آپ کی پرورش کی ذمہ داری سنبھالی۔ انہوں نے اپنی ذات سے آپ کے ذہن اور کردار کو جلا بخشی۔ مرحوم نے آپ کو قرآن مجید کی تفسیر پڑھائی اور آپ کے علم و ادب کے ذوق کو نکھارا۔

آپ صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے گریجویشن کرنے کے لاہور آ گئے۔ یہ دور آپ کی زندگی کا مشکل ترین دور تھا آپ نے نوکری کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ اس دور کی تلخی اور ہولناکی کو انہوں نے اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔

میں نے راتوں کو اجالوں کی دعائیں مانگیں ۔۔۔ اور مقدر سے گھٹا ٹوپ اندھیرے پائے

یا پھر وہ کہتے ہیں

سقراط نے زہر پی لیا تھا ۔۔۔ ہم نے جینے کے دکھ سہے ہیں

لاہور میں اس بے کاری اور مایوسی میں ندیم کو بالآخر ایک سہارا مل گیا ایک دوست جس نے اپنی شفقت کے پروں میں لے لیا یہ مشفق شخصیت اختر شیرانی کی تھی جنہوں نے ان کی کافی راہنمائی کی۔ اختر شیرانی اور عبدالمجید سالک کے توسط سے وہ نیاز مندان لاہور کے گروپ کے مشاہیر اور دوسرے ادبی لوگوں سے متعارف ہوئے ان دنوں لاہور صحیح معنوی میں علم و فن کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اردو زبان کے چوٹی کے نثر نگار افسانہ نویس اور شاعر لاہور میں رہتے تھے اسی ادبی ماحول میں ندیم قاسمی کا فن بھی عروج کو پہنچا۔

یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ فنکار حوادث اور حالات کی بھٹی میں پک کر ہی فنکار بنتا ہے۔ جس طرح سونا تپ کر کندن بن جاتا ہے ندیم کو عظیم فنکار بننے کے لیے ان تمام منازل سے گزرنا پڑا جہاں اُن کے احساسات پر تازیانے لگے۔ زندگی کے تلخ ترین تجربات نے ہی انہیں زندگی کے حقائق کا ادراک بخشا۔ بقول اکبر آلہ آبادی: "غم بڑا مدرک الحقائق ہوتا ہے"

ندیم نے حوصلے، محنت ذہانت اور فطری صلاحیتوں کی بدولت زندگی کے تمام نشیب و فراز میں استقامت سے کام لیا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ذہن کو ہمیشہ جائز اور مثبت تبدیلیوں کے لیے کشادہ رکھا۔ ان کی ہمہ گیر اور رنگ رنگ شخصیت کا عکس ان کے کلام میں نمایاں ہے ان کے کلام کا رنگ منفرد اور سب سے جدا ہے۔ سوچ کی فراوانی اور اظہار کی ندرت ان کے کلام کی جان ہے

وہ زندگی کے قریب ترین شاعر ہیں ان کے کلام کو پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ

سوئی ہوئی کس ذہن میں تری غیرت فن ہے   جاگا ہوا انساں بھی تو موضوع سخن ہے

جلال و جمال کے دیباچے میں اپنا نظریۂ فن بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''فنکار کا محبوب انسان ہے اور جب تک انسان مضطرب اور بے قرار ہے فنکار کی آسودہ خاطری بددیانتی ہے۔''

مزید اس بارے میں اپنی ایک خواہش ظاہر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

''صرف ایک تمنا ہے کہ میں اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کے ذریعے انسانیت کی عصمت اور طہارت قائم رکھتے ہوئے ایک ایسے نظام کی تعمیر میں ممد ثابت ہوسکوں۔ جس میں ہر انسان دوسرے انسان کو انسان ہی سمجھے کالا یا گورا، مشرقی یا مغربی، غلام یا آقا نہ سمجھے''

وہ رنگ ونسل کے امتیازات سے بیزار ہیں وہ تمام طبقاتی کشمکش، نسلی امتیازات اور فرقہ پرستی کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ ادب کو ایک مضبوط ہتھیار سمجھتے ہیں

ترقی پسند تحریک برصغیر ہندو پاکستان کی ادبی زندگی میں ایک انقلابی تبدیلی کی علم بردار ہے ندیم قاسمی ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں اس تحریک نے ادب کو جو چند قد آور شخصیات دی ہیں ان میں بلاشبہ ندیم کا نام بھی لیا جاسکتا ہے ندیم ترقی پسند اور مقصد پسند ہیں لیکن انہوں نے فن کو مقصد پر قربان نہیں کیا ہے۔ انہوں نے اپنی فنی شعور کی پختگی سے محض جذباتیت اور سطحیت سے اپنے کلام کو بچا کر رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں ترقی پسندوں کے مخصوص موضوعات اور محبوب مسائل کو پیش کیا ہے لیکن ان کے ہاں وہ گھن گرج نہیں ہے جو باقی ترقی پسندوں کی تحریر کا وصف رہا ہے۔ ان کے ہاں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت اور دھیما لہجہ ملتا ہے۔ ان کے دل میں انسانوں کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ موجزن ہے ان کی رگ و پے میں انسانیت کا بے پناہ درد سمایا ہوا ہے۔ ایسے سرمایہ دارانہ نظام سے شدید نفرت ہے وہ اس فرسودہ نظام کو تہس نہس کر دینا چاہتے

ہیں۔ جس میں غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کے احساسات و جذبات کو کچلا جاتا ہے۔ ندیم ایسا انقلاب چاہتے ہیں جو نئے نظام اقدار اور نئی اخلاقیات کی بنیاد بن سکے۔ وہ انسان کی آزادی اور مفادات کے خواہاں ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ: "آزادیوں کا زمزمہ خواں ہے مرا کلام"

وہ محنت کشوں کو جابر سرمایہ داروں کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتے ہیں:

مجھے محنت کشوں کو دہر کا آقا بنانا ہے مجھے تخلیق کو خالق کے پہلو میں بٹھانا ہے۔

وہ انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں اور ہر طرح کی غلامی کے کانٹوں سے اس کے دامن کو بچانا چاہتے ہیں۔

اے مرے جسم کو کانٹوں میں پرونے والے ہے غلامی سے بھی بڑھ کر کوئی آزار یہاں

ہر فنکار کا ایک بنیادی تصور ہوتا ہے ندیم کا بنیادی تصور انسانیت کی بقا اور ترویج ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کا واحد مقصد انسان سے محبت ہے دشمن جاں ہو تو بھی اور رہزن ہوش ہو تو بھی انسان سے محبت خالقِ انسان سے محبت کی منزل ہے۔ وہ کہتے ہیں:

داور حشر ! مجھے تیری قسم عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
تو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ میں نے انساں سے محبت کی ہے

اردو شاعری کی تاریخ میں شاعری کو غم انساں کی جہت سے اس بھرپور انداز میں روشناس کرانے کا سہرا احمد ندیم قاسمی کے سر ہے ان کے نزدیک حیات و کائنات کے اسرار سے آشنائی اور عرفان کی منزل کا سر آغاز عرفانِ انساں سے ہی ہو سکتا ہے۔

جب تک نہ سمجھ میں آئے انساں ہم اپنی سمجھ میں خاک آئیں

یا پھر وہ کہتے ہیں:

اس قدر پیار ہے انساں کی خطاؤں سے مجھے کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا

وہ واحد غزل گو شاعر ہیں جن کے سینے میں دھڑکنے والا دل دنیا کے لیے نہیں بلکہ انسان کے لیے دھڑکتا ہے۔ ان کی رگوں میں دوڑنے والا غم انسان کا غم ہے وہ تو جیتے اس لیے ہیں کہ شاید کبھی انسان اپنے صحیح مقام کو پانے میں کامیاب ہو جائے

اس توقع پہ کہ شاید کبھی انساں سنبھلے　　ہر نئے ظلم نے جینے پہ مجھے اُکسایا

وہ دشمن سے بھی اس لیے محبت کرتے ہیں کہ وہ انسان ہے انسان سے نفرت خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو قاسمی کے مسلک حیات اور نظریہ فن کے خلاف ہے۔

دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے　　میں ایک گھنا پیڑ سر راہ گزر ہوں

انسان کی عظمت اور برتری کا احساس ندیم کی شاعری میں شدت سے موجود ہے۔ ان کی نظم "انسان عظیم ہے خدایا" اس سلسلے میں بڑی اہم ہے۔

تو سنگ ہے اور وہ شرر ہے　　تو آگ ہے اور وہ اجالا

تو نم ہے نمو کا پاسباں وہ　　تو دشت ہے وہ چراغ لالہ

اس نے ہی تجھے حسیں بنایا　　انسان عظیم ہے خدایا

زندگی میں تخلیق پیہم کا وجود انسان کے دم سے قائم ہے انسان نہ ہوتا تو علم اسماء کی تکمیل کون کرتا یہی تو عظمتِ آدم کا راز ہے۔ وہ انسان کے مستقبل کی تابناکی اور اس کے لامحدود مضمرات و امکانات پر کامل یقین رکھتے ہیں۔

ابھی تو خیر سے تسخیر عرش باقی ہے　　ابھی تو اہل زمیں آسماں تک آئے ہیں

ندیم کی شاعری میں فکر کا رنگ اقبال سے ملتا ہے جدید شاعری پر اقبال کے اثرات بہت عمیق ہیں اقبال نے شاعری کو نئی طرز گویائی دی وہ انسانیت کی رفعتوں کے علمبردار تھے بعد میں آنے والے شعراء ان کے نغمات سے بے حد متاثر ہوئے شعراء کی عظمت کا معیار یہ ہوا کہ انہوں

نے اقبالیت کو اپنی افتادِ طبع کے رنگ و بو سے اپنی انفرادیت میں متشکل کیا جو شعراء اس زمرے میں آتے ہیں ان میں احمد ندیم قاسمی کا نام سرِفہرست ہے۔ اقبال فرماتے ہیں

نہ تُو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے　　جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

پرواز کو محدود نہ کر شام و سحر تک　　انساں کی ہیں ملکیتیں حدِ نظر تک

یا پھر اقبال کہتے ہیں

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

ندیم صاحب لکھتے ہیں کہ:

آدم کی رسائیوں سے ڈر کر　　اسرار حیات تھر تھرائیں

انہوں نے اپنی کئی نظموں میں انسان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ وہی انسان ہے جو فرشتوں کا مسجود ہے اور وہی انسان ہے جس نے فرش پر عرش کا سا جمال پیدا کر دیا ہے۔ انسان کا تصور ان کے ہاں بلند و رفیع ہے۔

ہم نہ ہوں تو اس طرح اجڑے خدائی کا سہاگ　　جس طرح خرمن میں بجلی جس طرح جنگل میں آگ

ندیم قاسمی کہتے ہیں کہ زندگی کی خوبصورتی اور رعنائی و دلربائی انسان کے دم سے ہے۔ کارگاہِ زیست میں ہنگامے ہماری وجہ سے ہیں ہمیں ہیں جنہوں نے جذبۂ تخلیق سے ستاروں تک رسائی حاصل کی ہے۔

بڑھا تو راہیں تراشیں، رُکا تو قصر بنائے　　اڑا تو گیت بکھیرے جُھکا تو پھول کھلائے

ندیم کے فن کے سوتے گہرے شعور و ادراک سے پھوٹتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایک خاص گہرائی ملتی ہے۔ ندیم امید کے شاعر ہیں وہ حوادث اور مشکلات کے درمیان پھنس کر گھبرا نہیں

جاتے وہ ہمت نہیں ہارتے اور امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے وہ فطرتاً رجائی ہیں اور اس رجائیت میں کہیں قنوطیت کی چھاپ نہیں۔ ان کی کئی نظموں میں ان کا پُر امید لب ولہجہ آشکارا ہوتا ہے۔ صبح آ گئی۔ رات بیکراں تو نہیں۔ روشنی کی تلاش اس ضمن میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

نجوم بجھتے رہیں تیرگی اُمڈتی رہے مگر یقینِ سحر ہے جنہیں، اداس نہیں

احمد ندیم قاسمی نے اپنے ارگرد کے واقعات کو بڑی ژرف نگاہی اور پختہ کاری سے اپنے کلام میں سمویا ہے۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں۔ "احمد ندیم قاسمی اپنے دور کے انتشار واضطراب کو شعر بنا دینے کی اچھی مہارت رکھتے ہیں ان کی شاعری زندہ رہنے اور مقابلہ کرنے کی تاب پیدا کرتی ہے۔ وہ اقبال کے توسط سے غالب سے متاثر ہیں"

ندیم قاسمی عظیم شاعر ہونے کے علاوہ عظیم انسان بھی ہیں۔ وہ دردمند اور حساس دل کے مالک ہیں۔ ان کی حساسیت اس درجہ کو پہنچی ہے کہ

کسی چمن میں بس اس خوف سے گزر نہ ہوا کسی کلی پہ نہ بھولے سے پاؤں دھر جاؤں

جوش ملیح آبادی احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

"ندیم صرف اچھے شاعر ہی نہیں اچھے انسان بھی ہیں اور چونکہ اچھا انسان ہر دور میں نایاب رہا ہے اس لیے میں ندیم کی دل سے قدر کرتا ہوں اور مجھے ان سے محبت بھی ہے۔"

ندیم کی شاعری میں فکر وفن کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ انہوں نے نظم وغزل دونوں میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے نظم وغزل کے علاوہ قطعہ اور رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں بڑے خلوص اور دیانتداری کے ساتھ کہتے ہیں ان کے یہاں شدید احساس، مطمئن تخیل حالات کا صحیح تجزیہ، حیات انسانی کی حقیقی ترجمانی اور اسلوب کی پختگی کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ ان خصوصیات نے مل کر ان کے کلام کو نہ صرف ایک نیا رنگ وآہنگ دیا ہے بلکہ اسے عظیم

شاعری کی ان سرحدوں کے قریب پہنچا دیا جہاں شاعر ایک ابدی حقیقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ندیم صاحب کے اسلوب بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالمجید سالک 'شعلہ وگل' کے تعارف میں فرماتے ہیں کہ۔

''ندیم نے ہماری شاعری میں نہایت گراں بہا اضافہ کیا ہے اس نے اظہار کے کئی نئے راستے دکھائے ہیں وہ وزن۔ بحر اور قافیہ وردیف کے معاملے میں بھی اس قدر تجاوز یا انحراف کا روادار ہے جو ہماری شاعری کے مزاج کے مطابق ہو وہ الفاظ کے انتخاب میں بے حد محتاط ہے وہ ان کی موسیقی کو بھی سمجھتا ہے اور بعض اوقات ان کے برمحل استعمال میں ایسا اجتہاد کرتا ہے کہ پرانے منہ تکتے رہ جاتے ہیں انہیں انکار واعتراض کی جرأت نہیں ہوتی۔''

ندیم قاسمی عظیم شاعر ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک تحریک ہیں بعد میں آنے والے شعراء ان سے بے حد متاثر ہوئے ہیں ان کی عظمت کا بنیادی وصف عظمت انسانی ہے اسی راگ کو انہوں نے اپنی شاعری کا محور و مرکز بنایا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں

مجھ کو نفرت سے نہیں پیار سے مصلوب کرو ۔۔۔ میں تو شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں

کتابیات

۱۔ احمد ندیم قاسمی شاعر اور افسانہ نگار از فتح محمد ملک
۲۔ 'افکار ندیم' نمبر
۳۔ مجموعہ 'شعلہ گل' از احمد ندیم قاسمی
۴۔ مجموعہ 'دشت وفا' از ندیم قاسمی
۵۔ جدید شعراء اردو
۱۔ ''میراجی پابند نظمیں ص ۱۶
۱۔ میرجی پابند نظمیں ص ۱۷ ۔ ۲۔ میرجی کی نظمیں ص ۲۰
۱۔ '' تین رنگ '' ص ۲۱۔۲۲
۱۔ مشرق و مغرب کے نغمے ص ۳۷۳ ۔ ۲۔ ''ادبی دنیا'' ص ۲۸
۱۔ نئے شعری تجزیے ص ۴۳۰ ۔ ۲۔ لا۔انسان ص ۲۷

غلام ابن سلطان

سرشار صدیقی ۔۔۔ 'کبھی تو کوئی لکھے گا حکایتِ غمِ جاں'

سرشار صدیقی بھی ہماری بزمِ وفا سے کوچ کر کے عدم کی بے کراں وادیوں کو سدھار گئے۔ علم و ادب کا وہ آفتاب جہاں تاب جو پچیس دسمبر انیس سو چھبیس کے دن کان پور (بھارت) سے طلوع ہوا سات ستمبر دو ہزار چودہ کی شام کراچی میں غروب ہوگیا۔ سرشار صدیقی کے نہ ہونے کی ہونی دیکھ کر دِل دہل گیا اور آنکھیں بھیگ بھیگ گئیں۔ آٹھ شعری مجموعوں اور چار نثری تصانیف سے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ کرنیوالے اس لافانی ادیب کی رحلت ایک بہت بڑا قومی سانحہ ہے جس کی تلافی ممکن ہی نہیں۔ ان سے مل کر زندگی کی حقیقی معنویت کا احساس ہوتا تھا اور زندگی سے محبت کے جذبات کو نمو ملتی تھی۔ اردو زبان کا اب ایسا کوئی ادیب دکھائی نہیں دیتا جسے سرشار صدیقی جیسا کہا جاسکے۔ مسجد دارالخیر گلستانِ جوہر کراچی میں اردو زبان کے اس نابغۂ روزگار تخلیق کار اور عظیم شاعر کی نماز جنازہ میں شامل ہزاروں افراد زاروقطار رو رہے تھے۔ اس روشن دماغ کی دائمی مفارقت کے سانحے پر شہر کا شہر ہی سوگوار تھا۔ کراچی کے نواح میں واقع ڈالمیا شہر خموشاں کی زمین نے عالمی ادبیات کے نبض آشنا، اُردو زبان کے عظیم شاعر، انسانیت کے وقار اور سربلندی کے لیے جدوجہد کرنیوالے دانش ور، انسانی ہمدردی کے پیکر، اخلاق اور اخلاص کی مجسم صورت اور حکمت، دانش اور فقر و روحانیت کے آسمان کو ہمیشہ کے لیے اپنے دامن میں نہاں کر لیا۔ اُردو زبان کی تخلیقی نثر اور شاعری کے ہمالہ کی ایک سربہ فلک چوٹی فرشتۂ اجل کے بے رحم ہاتھوں سے زمین بوس ہوگئی۔ اردو صحافت حریتِ فکر کے ایک ایسے مجاہد سے محروم ہوگئی جس نے زہرِ ہلاہل کو کبھی قند نہ کہا اور جس کی زندگی رمزِ لاتخف کی عملی صورت تھی۔ جب ان کی میت لحد میں اتاری گئی تو وہاں

موجودان کے ہزاروں مداح اس جان لیوا صدمے اور فرطِ غم سے نڈھال تھے۔ سرشار صدیقی گزشتہ کچھ عرصے سے پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا تھے۔ ان کے پس ماندگان میں ایک بیوہ اور ایک بیٹا شامل ہیں۔

سرشار صدیقی کا اصل نام اسرار حسین محمد امان تھا لیکن قارئینِ ادب نے انھیں ان کے قلمی نام ہی سے شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں بلند منصب پر فائز کیا۔ ان کا آبائی وطن معظم آباد ضلع اناؤ (بھارت) تھا۔ ان کے والد اولاد حسین اپنے عہد کے ممتاز طبیب تھے۔ طب یونانی میں ان کی علمی فضیلت، بے پناہ قابلیت اور مہارت کا ایک عالم معترف تھا۔ ان کی خداداد صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انھیں طبیہ کالج دہلی میں نوجوان اطباء کی تدریس پر مامور کیا گیا۔ برعظیم پاک و ہند کے متعدد نامور طبیبوں نے اس تاریخی ادارے سے طب کی تعلیم حاصل کی اور حکیم اولاد حسین سے اکتساب فیض کیا۔ حکیم اجمل خان ان کی قابلیت، خلوص، دردمندی اور انسانی ہمدردی کو ہمیشہ بہ نظر تحسین دیکھتے تھے۔ حکیم اولاد حسین کے جن ممتاز اطبا کے ساتھ مراسم تھے ان میں حکیم محمد سعید دہلوی، حکیم آفتاب احمد قرشی، حکیم نیر واسطی، حکیم نذر محمد انصاری، حکیم مولوی امیر الدین، حکیم حاجی غلام محمد، حکیم یار محمد، حکیم محمد صدیق اور حکیم احمد بخش نذیر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ حکیم اولاد حسین اور ان کے خاندان نے تحریکِ پاکستان میں فعال کردار ادا کیا اور برصغیر سے برطانوی استعمار کے خاتمے کے لیے کی جانیوالی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔

سرشار صدیقی نے میٹرک کا امتحان کلکتہ سے پاس کیا۔ حلیم مسلم کالج کان پور سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ زمانہ طالب علمی ہی سے سرشار صدیقی نے جبر کا ہر انداز مسترد کرتے ہوئے حریت ضمیر سے جینے کی راہ اپنائی۔ وہ مولانا حسرت موہانی کی استعمار دشمنی کے بہت بڑے مدّاح تھے۔ اپنے ترقی پسند خیالات کی وجہ سے وہ کمیونسٹ پارٹی اور ترقی پسند تحریک کے جلسوں میں بھی شرکت کرتے۔ وہ ممتاز بھارتی ادیبوں نشور واحدی اور ثاقب کان پوری کی حریتِ فکر و عمل کی روش کو بہت پسند کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ۱۹۴۹ء میں

پاکستان ہجرت کر کے کراچی میں مقیم ہو گئے۔ ۱۹۵۵ء میں وہ نیشنل بنک آف پاکستان میں ملازم ہو گئے اور ۱۹۸۴ء میں اسی بنک کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ پاکستان میں وہ مولانا اسماعیل ذبیح۔ سید اشتیاق اظہر، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر حسنین کاظمی، ڈاکٹر نثار احمد قریشی، ڈاکٹر بشیر سیفی، ڈاکٹر رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر محمد ریاض، سجاد بخاری، نظیر صدیقی، رفعت سلطان، ارشاد گرامی، محمد فیروز شاہ، ڈاکٹر صابر کلوروی، ڈاکٹر صابر آفاقی، محمد شیر افضل جعفری، کبیر انور جعفری، سید جعفر طاہر اور غلام علی خان چین کی علمی، ادبی اور قومی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ صحافت میں ان کی دلچسپی زندگی بھر برقرار رہی اور باقاعدگی کے ساتھ پاکستان کے ممتاز اردو اخبارات جنگ اور ایکسپریس میں کالم لکھتے رہے۔ ان کے کالم بھی تخلیقی ادب کی چاشنی لیے ہوتے تھے جنھیں قارئین ادب بہت توجہ اور دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ اپنے تخلیقی نوعیت کے کالموں میں انھوں نے ہجرت کے باعث انسانیت کو درپیش مصائب و آلام کا احوال، قومی زبان اور تہذیبی و ثقافتی مسائل اور معاشرتی زندگی کے نشیب و فراز پر کھل کر لکھا۔ زندگی کی اقدار عالیہ کی نمو پر انھوں نے ہمیشہ زور دیا۔ انھیں اس بات کا قلق تھا کہ ہوس نے نوع انساں کو خود غرضی اور انتشار کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ قحط الرجال کے موجودہ دور میں زندگی کی درخشاں اقدار و روایات کو شدید خطرات کا سامنا ہے۔ سرشار صدیقی نے اس سلسلے میں عوام میں مثبت شعور و آگہی پروان چڑھانے کی مقدور بھر سعی کی۔ ان کی علمی، ادبی، قومی، ملی اور لسانی خدمات کو پوری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور انھیں مختلف ادبی تنظیموں کی طرف سے متعدد قومی اور بین الاقوامی ایوارڈز ملے۔ حکومت پاکستان نے فروغ اردو زبان و ادب اور اہم قومی خدمات کے اعتراف میں انھیں سال ۲۰۱۱ء میں صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔

اپنی عملی زندگی کا آغاز سرشار صدیقی نے صحافت سے کیا۔ علامہ نیاز فتح پوری کی ادارت میں لکھنو سے شائع ہونیوالے ادبی مجلے ''نگار'' کی مجلس ادارت میں وہ شامل تھے۔ ان کی پہلی غزل ۱۹۴۴ء میں مجلہ نگار میں شائع ہوئی۔ ان کی اہم تصانیف درج ذیل ہیں:

ارتقا (۱۹۴۷)، پتھر کی لکیر (۱۹۶۲)، ابجد (۱۹۸۳)، بے نام (۱۹۸۳) خزاں کی ایک شام (۱۹۸۸)

تخلیق فن کے لمحوں میں خون بن کر رگِ سنگ میں اترنے کی صلاحیت سے متمتع سرشار صدیقی کا اسلوب زندگی کے متعدد نئے حقائق کی گرہ کشائی کرتا ہے۔ ان کے اسلوب میں قومی تشخص کا عنصر قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ وطنِ عزیز کی سماجی اور معاشرتی زندگی کے تمام نشیب و فراز اُن کے پیش نظر تھے۔ اپنے تجربات، مشاہدات، جذبات اور احساسات کو اُنھوں نے پُوری دیانت سے کام لے کر زیب قرطاس کیا ہے۔ ان کی لفظی مرقع نگاری کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اُنھوں نے لفظ اور قلم کی حرمت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور انسانیت کی اعلاترین اقدار کے تحفظ کو ہمیشہ اپنا مطمحِ نظر بنایا۔ ایام گزشتہ کی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے وہ آئینۂ ایام میں اپنی ہر ادا پر کڑی نظر رکھتے اور اپنی تسبیح روز و شب کا دانہ دانہ شمار کرتے وقت احتساب ذات پر توجہ مرکوز رکھتے تھے۔ اُن کی زندگی کے معمولات میں جو توازن اور اعتدال پایا جاتا تھا اس کا راز ان کے سائنسی اندازِ فکر پر مبنی حقیقت پسندی اور خود احتسابی میں پوشیدہ تھا اُن کا خیال تھا کہ ماضی کے تلخ تجربات سے دِل برداشتہ ہونے کے بجائے انھیں مشعل راہ بنایا جائے اور نہ صرف حال بلکہ مستقبل کے لیے بھی لائحہ عمل مرتب کرتے وقت ان کو خضرِ راہ سمجھا جائے۔ ان کی شاعری میں بے لوث محبت اور بے باک صداقت کے جذبات کی فراوانی ہے۔ ان کا اسلوب قاری کے ذہن پر دور رس اثرات مرتب کرتا ہے۔ اسی لیے ادب کے سنجیدہ قارئین ان کی شاعری کے اصلاحی پہلو کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کی شاعری قاری کے ذہن و ذکاوت کو اس انداز میں مہمیز کرتی ہے کہ قاری اپنے اندر ایک ولولۂ تازہ موجزن محسوس کرتا ہے اور تخلیق کار جن عوامل کو اپنے فکر و فن کی اساس بناتا ہے وہ اس کے عام شعور کا ایک اہم حصہ بن جاتے ہیں۔ اس عمل کے معجزہ نما اثر سے جذبات و احساسات کی تہذیب و تزکیہ کے امکانات روشن تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ زندگی کی حقیقی معنویت کو اُجاگر کرنے کے سلسلے میں اُنھوں نے جو طرز فغاں ایجاد کی وہ ان کی انفرادیت کا منہ بولتا ثبوت ہے

ویراں ہیں اور حسرتِ تعمیر بھی نہیں　　لیکن یہ غم تو قابلِ تحریر بھی نہیں

جو بے وطن ہوئے ان کا وطن زمانہ ہوا　　جو بے زمیں ہوئے ان کا کہاں ٹھکانہ ہوا

نہ بام و در ہیں سلامت، نہ سائبان، نہ ہم　　ہمارے شہر میں ہے سنگ و خشت کا موسم

نہ خواب میں نہ طلسمِ شکستِ خواب میں ہوں　　میں اپنی روشنی طبع کے عذاب میں ہوں

کبھی تو کوئی لکھے گا حکایتِ غمِ جاں　　میں ایک سادہ ورق ہوں مگر کتاب میں ہوں

یہ میرے چاند سے بچے جواں ہوئے جب سے　　میں ایک مرتبہ پھر عالمِ شباب میں ہوں

قیام پاکستان کے بعد یہاں حالات نے جو رخ اختیار کیا، اس کے معاشرتی زندگی پر دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ تخلیقِ ادب ہی کو لے لیں فکر و خیال اور تخلیقی فعالیت کا متعدد نئی جہات سے واسطہ پڑا۔ اردو شاعری میں قیام پاکستان کے وقت رونما ہونیوالے واقعات کا واضح پرتو دکھائی دیتا ہے۔ سرشار صدیقی کی شاعری میں ہجرت کے بعد تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور معاشرتی مسائل کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ اندازِ فکر سامنے آتا ہے۔ انھوں نے قومی کلچر کے حوالے سے نہایت دردمندی اور خلوص کے ساتھ اپنے تاثرات کو پیرایۂ اظہار عطا کیا۔ معاشرتی زندگی کے اضطراب، بے یقینی اور خوف و دہشت کی فضا پر اُن کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ گزشتہ سات عشروں میں جن ادیبوں نے پاکستانی ادبیات میں اپنی تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی اقدار و روایات کے فروغ پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے ان میں سرشار صدیقی کا نام ممتاز مقام رکھتا ہے۔ وطن اور اہلِ وطن کے ساتھ ان کی والہانہ محبت اور قلبی وابستگی ان کا سب سے بڑا اعزاز و امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ ارضِ وطن سے وہ ٹوٹ کر محبت کرتے تھے اور اسے اپنے لیے ایک جائے اماں قرار دیتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ فروغِ گلشن وصوت ہزار کا موسم ضرور آئے گا اور وطن کی خاک سے امن و آشتی، راحت و شادمانی، خوش حالی اور فارغ البالی کے ایسے چشمے پھوٹیں گے جو اس چمن کے گوشے گوشے کو سیراب کر دیں گے۔ حریتِ فکر و عمل کے ایک مجاہد کی حیثیت سرشار صدیقی نے معاشرتی زندگی کی قباحتوں اور تضادات کے خلاف کھل کر لکھا اور کبھی کسی مصلحت کی پروانہ کی۔

ہوائے جور و ستم میں بھی انھوں نے حق و صداقت کا علم بلند رکھنے پر اصرار کیا۔ ایک فلاحی معاشرے میں عدل و انصاف کی فراہمی کو وہ وقت کا اہم ترین تقاضا سمجھتے تھے۔ کہیں بھی ناانصافی ہوتی کسی کی حق تلفی ہوتی یا کسی کا انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بننا پڑتا، وہ تڑپ اُٹھتے اور جبر کے خلاف سینہ سپر ہو جاتے۔ ناانصافی کو اذیت اور کرب کو سہہ کر اس کے خلاف حرفِ شکایت لب پر نہ لانے کو وہ منافقت اور اعصاب شکن بُزدلی سے تعبیر کرتے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس نوعیت کا اندازِ فکر جس سے ظلم کو تقویت ملے ظلم و استبداد سے کہیں بڑھ کر اہانت آمیز ہے۔ اپنے تخلیقی عمل کے ذریعے معاشرے میں بے لوث محبت، خلوص، ایثار اور دردمندی کے فروغ کو ان کی اولین ترجیح کی حیثیت حاصل رہی۔

صحرا ہی غنیمت ہے جو گھر جاؤ گے لوگو — وہ عالمِ وحشت ہے کہ مر جاؤ گے لوگو
یادوں کے تعاقب میں اگر جاؤ گے لوگو — میری ہی طرح تم بھی بکھر جاؤ گے لوگو
وہ موجِ صبا بھی ہو تو ہشیار ہی رہنا — سُوکھے ہوئے پتے ہو بکھر جاؤ گے لوگو
اُجڑے ہیں کئی شہر تو یہ شہر بسا ہے — یہ شہر بھی چھوڑا تو کدھر جاؤ گے لوگو
حالات نے چہروں پہ بہت ظلم کیے ہیں — آئینہ اگر دیکھا تو ڈر جاؤ گے لوگو
اس پر نہ قدم رکھنا کہ یہ راہِ وفا ہے — سرشار نہیں ہو کہ گزر جاؤ گے لوگو

سرشار صدیقی نے سال ۱۹۸۴ میں عمرہ کی سعادت حاصل کی اور حضور ختم المرسلینؐ کے روضۂ اقدس پر بھی حاضری دی۔ حرم پاک کی زیارت، عمرہ کی ادائیگی اور رحمتِ عالمؐ کے روضۂ اقدس پر حاضری ان کی دلی تمنا تھی۔ اس مبارک سفر کے بعد جب وہ واپس آئے تو ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ ان کی زندگی میں ایک روحانی انقلاب آ گیا اور فکر و نظر کی کایا پلٹ گئی۔ عشق رسولؐ کے مقدس جذبات ان کے قلب و روح میں سما گئے اور ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس عشق کے اعجاز سے پست کو بالا کیا جاسکتا ہے اور اسی عشق کے فیض سے پوری دنیا سے سفاک ظلمتوں کو کافور کیا جا سکتا ہے۔ دنیا نے یہ روح پرور منظر دیکھا کہ عشق رسولؐ کے فیضان سے حضرت بلال حبشیؓ جیسے سچے عاشق کو دوام

نصیب ہوا مگر سکندر رومی کا سب جاہ و جلال سیلِ زماں کے تھپیڑوں میں خس و خاشاک کے مانند بہہ گیا۔ ارضِ مقدس کے مبارک سفر کے بعد سرشار صدیقی کے اسلوب میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ عشقِ حقیقی کے سانچے میں ڈھل کر سرشار صدیقی کی شاعری رنگ، خوشبو اور حسن و خوبی کے تمام استعاروں سے مزین ہو گئی اور اس کے آہنگ سے دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کرنے اور حریم کبریا سے آشنا کرنے میں مدد ملی۔ اپنے فنی تجربوں میں انھوں نے تخلیقی سطح پر حمدیہ اور نعتیہ شاعری پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ ان کی یہ شاعری عشق حقیقی کا ارفع ترین معیار پیش کرتی ہے۔ اپنے متنوع فنی تجربوں سے انھوں نے افکارِ تازہ کے وسیلے سے جہانِ تازہ تک رسائی کی جو سعی کی اسے بے حد پذیرائی نصیب ہوئی۔ ان کی بہت سی نعتیں آزاد نظم کی ہیئت میں منصۂ شہود پر آئیں انھوں نے نعتیہ ہائیکو بھی لکھے۔ ان کی یہ شاعری قلب اور روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر قاری پر وجدانی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ ان کا یہ نیا انداز جہاں ان کے لیے دین اور دنیا میں سرفرازی کا وسیلہ رہا وہاں ان کا یہ عشق آخرت میں بھی زادِ راہ ثابت ہوگا۔ عشق حقیقی کی اس کیفیت کو وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ اور اپنی پہچان قرار دیتے اور اپنی نعتیہ شاعری کو صفِ حسانؓ میں شامل ہونے کا ایک وسیلہ قرار دیتے تھے اور اسے اپنے لیے توشۂ آخرت سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہر مسلمان کو جان لینا چاہیے کہ دین تو مکمل طور پر عشقِ رسولؐ میں سرشار ہونے کا نام ہے۔

اردو نثر میں غالب کی نثر کو وہ پسند کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کار نے اصلاح اور مقصدیت کے لیے جس سلیس اور عام فہم اردو نثر کو اپنایا اس کے سوتے غالب کی نثر ہی سے پھوٹتے ہیں۔ سرشار صدیقی کی نثر میں بھی یہی رنگ اور آہنگ جلوہ گر ہے۔ ان کی تخلیقی نثر میں سادگی، سلاست، قطعیت اور مضمون آفرینی کا کرشمہ دامنِ دل کھینچتا ہے ان کی نثر میں سنجیدگی، مقصدیت، اصلاح اور تعمیرِ نو قاری کو فکر و خیال کی ایک ایسی وادی میں پہنچا دیتی ہے جہاں فطرت خود بہ خود لالے کی حنا بندی کے عمل میں پیہم مصروف دکھائی دیتی ہے۔ سچے جذبات کی مسحور کن عطر بیزی سے قاری کا قریۂ

جاں معطر ہو جاتا ہے اور ہجوم یاس میں بھی اس کے دل کی کلیں کھل اُٹھتی ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علی گڑھ تحریک سے انھوں نے جو اثرات قبول کیے وہ ان کے اسلوب میں شامل ہو گئے۔ان کی نثر کو تخلیقی نثر اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی نثر کو ایک نیا آہنگ عطا کیا اور اپنی نثر کو وہ نہج عطا کی کہ یہ نثر اپنے دامن میں جہاں علمی و ادبی شان لیے ہوئے ہے وہاں اس نے صحافتی رنگ سے بھی مکمل قطع تعلق نہیں کیا بلکہ ان میں پائی جانے والی حدِ فاصل کو برقرار رکھتے ہوئے ایک شانِ دل ربائی کے ساتھ منفرد انداز میں اپنے اشہب قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سرشار صدیقی کی نثر میں کہیں سوز و ساز رومی کی کیفیت ہے تو کہیں پیچ و تاب رازی کا انداز جو ہر حال میں بہار کے اثبات کی نوید ہے۔

سرشار صدیقی نے اپنی بستی بہت دور بسالی ہے جہاں اب تو یادرفتگاں کی بھی تاب نہیں۔ ہماری محفل کے کتنے بڑے آفتاب و ماہتاب دیکھتے ہی دیکھتے غروب ہو گئے اور دنیا بے بسی کے عالم میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ہم اپنے رفتگاں کو یاد کر کے اپنے دل حزیں کو ان کی یاد سے آباد رکھنے کی سعی کرتے ہیں۔میری دعا ہے اللہ کریم سرشار صدیقی کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی لحد پر آسمان شبنم افشانی کرتا رہے اور سبزۂ نورستہ اس لافانی ادیب کی آخری آرام گاہ کی نگہبانی میں مصروف رہے۔وہ ہماری محفلوں کی جان اور بیش بہا قومی اثاثہ تھے۔ان کی رحلت کی خبر سن کر ہر آنکھ اشک بار ہے اور ہر دل سوگوار ہے۔یہ راز کسی کو معلوم نہیں کہ وہ لوگ جنھیں ہم دیکھ کر جیتے ہیں اس قدر جلد کیوں ہماری محفل سے کنارہ کش ہو کر عدم کی بے کراں وادیوں کی جانب سدھار جاتے ہیں۔ہماری آنکھیں ان کی دید کو ترس جاتی ہیں لیکن وہ تو سب حقائق کو خیال و خواب بنا کر دائمی مفارقت دے جاتے ہیں۔فضاؤں میں صرف ان کی حسین یادیں ہی رہ جاتی ہیں ہم جس طرف بھی نگاہ دوڑاتے ہیں ان کی شخصیت کے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔اور کان میں ان کی آواز کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔زندگی اور وقت کی مثال بھی آبِ رواں کی سی ہے۔کوئی شخص اپنی شدید تمنا اور سرتوڑ کوشش کے باوجود بیتے لمحات اور بہہ جانے والے پانی کے لمس سے دوبارہ کبھی فیض یاب نہیں ہو سکتا۔اپنی

محفل کے تیر تاں زیرز میں دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

سرشار صدیقی نے ۲۲ فروری ۱۹۹۶ء کو اپنی ایک مختصر نظم ''لوح مزار'' میں جن جذبات کا اظہار کیا تھا وہ ان کی قلبی اور روحانی کیفیات کے مظہر ہیں۔ جب میں یہ نظم پڑھ رہا تھا تو میں نے چشمِ تصور سے دیکھا کہ سرشار صدیقی کی آخری آرام گاہ اگرچہ کراچی میں ہے لیکن ان کی روح تو مدینے کی جانب عازم سفر ہو چکی ہے۔ قلبی وابستگی عقیدت اور محبت کے ابد آشنا جذبات سے لبریز یہ نظم ایک سچے عاشق رسولؐ اور عظیم انسان کی لوح مزار پر نصب رہنی چاہیے:

مجھے خدا کی زمیں پر کہیں بھی دفن کرو ۔۔۔ میں خاک پائے رسالت میں گرد راہ حرم

وہ ارض شوق مری جنت یقیں ہوگی ۔۔۔ میں روز حشر جہاں سے اٹھایا جاؤں گا

وہ سرزمین، مدینے کی سرزمیں ہوگی

بیگم ثاقبہ رحیم الدین

درد ہی درد

'کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے'۔ یہ بات ہے تو سچی مگر ہے دکھ بھری۔ کچھ خبر نہیں کہ کیوں اور کیسے اس آنی جانی اور دیوانی سی زندگی کے دکھ درد کہانیوں اور افسانوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ شاید ہمیشہ سے انسان، محبت اور قلم درد کے مشترک رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔

ویسے تو اللہ کے بسائے اس جگ کے سو رنگ، سو ڈھنگ مگر نہ مٹنے والی اداس خاموشی، بے رنگی اور سن سن کرتی ہوا ہر لمحے پھیلی رہتی ہے۔ جدھر دیکھو لمحے بے جان، روشنیاں دھیمی اور خوشبو اُڑی اُڑی ہے۔ ایک کھنڈر کے صحن میں شام سی ہے اور ایک ننھا سا تارا ٹمٹما رہا ہے۔ نہ ہی کچھ دکھتا ہے اور نہ ہی سب کچھ پوری طرح چھپا ہوا ہے۔ جھٹپٹا سا ہے۔ چار سو موسم کی وحشتیں بڑھ گئی ہیں، صبحیں باسی اور بوجھل اور شامیں گم صُم اور اُجاڑ۔ اب شاموں شام نہ کوئی جگنو چمکتا ہے نہ رنگین تتلیاں پروں کو سرسراتی پھرتی ہیں۔ اُجالا تو پہلے ہی نہ تھا مگر اب یہ کیسی بے کلی سی بے کلی ہے کہ گھٹا امڈ امڈ آتی ہے، نہ کھلتی ہے نہ برستی ہے۔ زندگی کی گلیوں میں شام دھیرے دھیرے رات میں ڈھل رہی ہے۔

ہمارے اس جیون کی کہانی بھی بڑی عجیب ہے۔ جیتے جی کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ انسان اس بھری کائنات میں، لوگوں کی بھیڑ میں اور ساری رونقوں میں بالکل تنہا ہے۔ نہ کسی کی اپنی کوئی دنیا ہوتی ہے اور نہ کوئی وقت اپنا وقت ہوتا ہے۔ انسان جیسے بے لباس، مٹھیاں بند، اکیلا اور روتا ہوا آتا ہے اسی طرح لوٹ جاتا ہے۔ وہ صرف آسمان کے بے رحم چھپر تلے، بنجر زمین پر ایڑیاں رگڑتا اور راستا ناپتا ہوا آخر کار مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ کچھ خالی خالی سے لوگ خواہ مخواہ ہی زندگی کے سفر کی کہانیاں گھڑتے رہتے ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ ازل سے محبت اور درد کا ہر پل ہر آن ساتھ ہے۔ ویسے عاشق اور قلم والے کبھی چپ نہ رہے، کبھی روئے کبھی ہنسے اور کبھی حیران ہوئے۔ یوں تو عاشقوں کو اور دیوانوں کو جینے کی بڑی تمنا ہوتی ہے، مگر وہ بہت گھبرا جائیں تو صبر سے قبر تک کی راہ پر چل پڑتے ہیں ورنہ اپنے خونِ جگر سے زندگی کو سینچ کر رنگ بھرتے رہتے ہیں۔ محبت محبت سے مل کر روح کا ساز بنتی ہے۔ اور زندگی کا نور پھیلاتی ہے۔ محبت ہر دم جیتے جاگتے جذبے کا نام ہے جو انسان کی رگ رگ میں سانس لیتا رہتا ہے۔ اس جذبے کو کسی پر طاری نہیں کیا جا سکتا، چھینا نہیں جا سکتا اور نہ بھیک میں مانگا جا سکتا ہے۔ اگر کبھی محبتوں کے زمانے میں ایسا ہو جاتا ہے تو دکھ بھری کونپل پھوٹ پڑتی ہے اور ارمانوں کا خون رسنے لگتا ہے۔ پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ جہاں پر یہ بوندیں زمین کو چھوتی ہیں، پھر نئے سرے سے پودا اگ آتا ہے۔ درد کی فصل پھلتی پھولتی ہے، درد کی رُت مہک اٹھتی ہے اور درد ہی درد چار سو چھا جاتا ہے۔

ہمارا دل تو کبھی کبھی حیرتوں سے گزرتا ہے کہ آخر یہ دردمندی ہے کیا، کہاں سے آتی ہے اور کہاں جا بستی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی کی شدید محرومیوں کے شکار لوگ دردمند ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ہوا ہے کہ بے پناہ سُکھی اور بامراد لوگ اپنے دل کی فیاضی کے ہاتھوں سب کا درد سمیٹنا چاہتے ہیں۔ مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا کرتا کہ درمیانے درجے کے لوگ، عام سے دل و دماغ کے مالک اور ہلکی پھلکی سوچوں والے دردمند بن جائیں۔ شاید انسان کی زندگی کی شدتیں صحیح معنوں میں دردمندی کو وجود میں لاتی ہیں۔ وہ دردمندی جو مصلحتوں سے بالاتر ہو، دکھاوے اور شان سے پرے ہو، تعریف اور انعام سے بے تعلق ہو اور بنا کہے خود بخود انسان کے دل سے پھوٹے سچی دردمندی ہے۔

نہ یہ دنیا جان سکی اور نہ ہم جان سکے کہ درد کیوں اور کب پیدا ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ درد کا ایک مادی روپ ہے اور ایک روحانی۔ کبھی جسم کو کوئی چوٹ لگے تو درد ہونے لگتا ہے۔ کبھی بدن کے اندر کوئی ٹوٹ پھوٹ ہو تو درد ہوتا ہے۔ کسی کو کوئی مرض لاحق ہو جائے تو اسے درد محسوس ہونے لگتا ہے۔ عام طور سے دکھی بندہ یہ کہہ اٹھتا ہے کہ اسے درد ہو رہا ہے۔

آج تک درد کا مداوا کرنے والے مسیحا پریشان ہیں کہ دردزدہ انسان اپنے درد کی شدت پوری طرح بتا نہیں پاتا ہے۔ کبھی درد کو سہہ لیتا ہے، کبھی روپڑتا ہے، کبھی تڑپنے لگتا ہے اور کبھی بے حس ہوجاتا ہے۔ آج تک دنیاوی طور سے درد کو جاننے اور ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ہر جسم اور ہر وجود میں درد الگ الگ انداز سے ابھرتا ہے۔ انسان کم عمری میں معصومیت سے درد کو چلا کر بیان کرتا ہے۔ تو جوانی میں انسان درد کو روکر، بلبلا کر بتاتا ہے۔ پھر جوان لوگ درد کو کچھ سہہ لیتے ہیں اور کچھ بیان کر دیتے ہیں۔ بڑھاپے میں درد خود وجود کے اندر کافی حد تک جذب ہوجاتا ہے مگر پھر بھی بزرگ کسی نہ کسی طریقے سے اپنے درد کا اظہار کر دیتے ہیں

اسی طرح سے ہر زمانے اور ہر دور میں قوموں، نسلوں اور مختلف عمر کے لوگوں میں اظہار درد کے ہزار ہا انداز ہیں۔ کوئی بھلا درد کو اصل صورت میں کیسے جانے جب اس کی شدت کا ناپنے اور اظہار کو مکمل طور سے سمجھنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ بس درد کو دردمند اور صرف دردمند ہی محسوس کر سکتے ہیں

درد کی روحانی دنیا کے اتنے پہلو اور اتنی پرتیں ہیں کہ زمین پر پھیلے ذرّات بھی اتنے نہ ہوں گے۔ اگر اپنے دلوں پر سے مصنوعی پردوں کو ہٹا کر، سچے عشق کے جھرونکوں سے دیکھیں تو درجہ بدرجہ درد کی اُجلی صورتیں جھلکنا شروع ہوتی ہیں۔ یوں تو زندگی میں کسی بھی طرح کی ناکامیوں اور محرومیوں سے درد پیدا ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کبھی دردمندوں کی نامرادیاں ادب کی کامرانیاں بن جایا کرتی ہیں۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ کچھ درد اپنے ہوتے ہیں، کچھ اپنے پیاروں کے، کچھ غیروں کے اور کچھ ساری خدائی کے۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ محبت کسی کی ہستی میں رس گھول رہی ہو اور ساری کی ساری عمر وفا سے سرشار ہو، اور آندھی آئے اور سب کچھ مٹ جائے، تو وہ انسان درد سے بجھ جاتا ہے۔ کہیں کہیں کسی کے اپنے اور پیارے جیون کی آزمائشوں اور مصیبتوں میں گھرے ہوں، تو وہ ان کے درد میں تڑپتا رہتا ہے۔ یہ بھی ہوا ہے کہ وہ لوگ جو کسی کے لئے جنم جنم سے پرائے تھے مگر اچانک حادثوں میں گھر گئے، دردمند انسان نہ چاہتے ہوئے بھی دکھی ہوجاتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ایسے انسان نایاب نہیں مگر کمیاب ضرور ہیں جو اجنبی اور سارے انسانوں کی تکلیف اور درد میں کراہتے ہیں۔ وہ انسانیت کے درد کو لاکھ چھپائیں مگر درد ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے ایسوں کے سارے وجود میں کہیں کہیں اور کبھی کبھی درد نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کا دل خود درد بن جاتا ہے۔ یہی دردمند ایسے درد کے خوگر ہیں کہ ان کی آنکھوں میں نمی، آواز میں خلوص اور نگاہوں میں شفاف محبت ہوتی ہے۔ دردمند انسان ہماری زندگی کا جوہر ہیں۔ یہ سادہ دل اور معصوم نگاہ رکھنے والے اللہ کے پیارے ہوتے ہیں۔

یہ اللہ کے پیارے بہت ڈھونڈے سے بہت صدیوں بعد ملا کرتے ہیں ایسے دردمندوں نے یوں تو زمین پر اونچی عمارتیں نہیں بنائیں، ایجادیں نہیں کیں، دولتوں کے انبار نہیں لٹائے، ملک فتح نہیں کیے مگر انسانوں کے دل فتح کیے۔ ایسے لوگ بلاشبہ قابل عشق ہیں اور ان کا رستہ ہی کچھ اور ہے۔

اس دردمندی کے رستے میں نہ شاہراہیں ہیں، نہ بلند و بالا محل، نہ خوبصورت سرائے، نہ روشنیوں کی قندیلیں۔ پھر یہ دردمند دل والے کس رستے سے چلتے ہیں اور کہاں کہاں محبتوں کے پڑاؤ ڈالتے ہیں اور کیسے کیسے انسانوں کو نور سے اجالتے ہیں، کچھ بھی تو کہا نہیں جا سکتا۔

یوں تو جینے کو ہم سب جیتے ہیں مگر شاذ و نادر ہی کوئی زندگی بتانے کا قرینہ جانتا ہو۔ البتہ ہر زمانے میں اور ہر زمین پر اہل دل، اہل نظر اور اہل درد جنم لیتے ہیں جن کے دم سے انسانیت کی آبرو قائم رہی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ درد خود آگے بڑھ کر ایسے لوگوں کے پاؤں تھام لیتا ہے۔ ایسے کبھی نہ بھلانے والے دردمندوں کے لیے اس دنیا کا ہر مقام قابل دید، ہر جہان جہانِ دیگر اور ہر نظارہ نظر افروز ہے۔ یہ لوگ محبت و دوستی کا پیغام لئے نگر نگر، قریہ قریہ، کیا صحرا کیا آبادی، گھومتے پھرتے ہیں۔ دنیا میں رہے، انسانوں میں بسے مگر اپنا جی نہ لگایا۔

کون ہے جو درد کے ظاہری اور باطنی رُت نئے روپ دکھا سکے۔ درد کی دنیا کو جان لینا اور اس کی طرف آنکھ بھر دیکھ لینا زندگی کو روشنی سے بھر دیتا ہے۔ درد کے وسیع دامن میں انسان کے سب

ہی پہلو آسمٹتے ہیں، جیسے غمِ روزگار، غمِ عشق، دُکھ بھرا بچپن، دوستوں کی محرومیاں، حادثات اور آزمائشیں، بے جا خواہشات کی تکمیل کا دکھ، تنہائی اور ویرانی، قوم وملک کی فلاح کا غم، انسانی بھلائی کا مسلسل جنون اور اللہ اور رسولؐ سے پیار اور دوری کا غم۔ اس کے علاوہ بھی جتنی انسان کی سانسیں ہیں، جتنی ہوا کی لہریں ہیں، جتنے صحرا کے ذرے ہیں، درد ہی درد کے ادلتے بدلتے نقوش ہیں

درد انسان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ درد کسی انسان کے سینے میں ٹھہر کر رہ جاتا ہے۔ جب درد جی کے اندر بیٹھ جاتا ہے تو سوئی بن کر کلیجے کو کریدنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر انسان پر درد ہی درد کے کبھی نہ مٹنے والے نشان بن جاتے ہیں۔

دراصل درد نبض کائنات ہے، یہ انسانوں کی شہ رگ کی دھڑکن ہے، یہ انسانی جگر میں چبھی پھانس ہے اور دیدۂ تر میں چھپا آنسو ہے۔ درد کو سمیٹے رہو تو آنکھ کی پتلی اور پھیلا دو تو سمندر در سمندر درد ہی درد کی کٹھن منزلوں سے گزرتے جائیں تو ایک نامعلوم سی، سبک سی زنجیر بندھتی چلی جاتی ہے۔ گویا کبھی سلسلہ ٹوٹتا نہیں ہے درد کی زنجیر کا۔ پھر درد کے ان گنت سلسلے، درد کی بے شمار راہیں۔ بھلا کون ان سلسلوں کو تھامے بھلا کون ان راہوں پر چلے اور بھلا کون درد کو اپنائے۔۔۔

سچ ہے کہ درد ہمیشہ سے زندگی میں قدم قدم پر موجیں مارتا ہر دم رواں ہر دم جواں سمندر ہے۔ اس سمندر کی نہ کوئی سمت ہے اور نہ کنارا ہے۔ میرے دوستو! یہ آپ پر ہے کہ آپ درد کے سمندر میں ڈوب جائیں یا صرف بھیگ جائیں، اپنے ہاتھ نم کر لیں یا پھر کنارے بیٹھے رہیں، اور چاہیں تو فوراً ہی اُٹھ بیٹھیں۔ ہمیں انتظار رہے گا، ہم راہ تکیں گے کہ آپ کہاں تک ساتھ دیں گے اور یہ کہ آپ ہم سے کیا کہتے ہیں۔

*****

(مترجم) احمد اعجاز الدین رحمت علی۔ ماریشس (بحرِ ہند)

ژاکلین

میں اسٹوو پر رکھے دودھ کے اُبلنے کے انتظار میں تھا کہ یکا یک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ بلا تاخیر میں ٹیلی فون کی طرف دوڑ پڑا۔ پھر اچانک یاد آیا کہ جلدی میں اسٹوو تو بجھانا ہی بھول گیا۔ لپک کر میں باورچی خانے میں پہنچ گیا۔ مگر تب تک دودھ تھا کہ اُبل کر پورے اسٹوو پر پھیل چکا تھا۔ لو ایک اور کام بڑھ گیا، مسلسل بجتے ٹیلی فون کی گھنٹی مجھے اپنی طرف کھینچ ہی لائی۔ ریسیور کو کان تک اٹھاتے ہوئے اور غصے کو دباتے ہوئے میں نے کہا ''ہیلو۰۰۰! مگر دوسری جانب سے کوئی جواب نہ ملا۔ چند لمحوں کے لیے نہایت اُکتاہٹ بھری خاموشی طاری رہی۔ جی چاہتا تھا کہ ٹیلی فون کو زمین پر پٹخ دوں لیکن تبھی ایک جانی پہچانی آواز ٹیلی فون سے اُبھری۔ ''ہیلو! آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟ آپ کو کس سے بات کرنی ہے۔؟''

میں بے تحاشا بول پڑا۔ ''دیکھیے موہن صاحب کی اہلیہ سے ملنا تھا۔''

''ٹھیک ہے موہن ہی بول رہا ہوں۔ میری بیوی باہر گئی ہے۔ کوئی پیغام ہو تو آپ مجھے دے سکتی ہیں۔''

''بات دراصل یہ ہے کہ انہیں ایک لڑکی کی ضرورت تھی۔۔۔ گھر کے کام کاج کرنیوالی لڑکی۔''

''ہاں ہاں مجھے پتہ ہے۔ کیا کوئی اچھی خادمہ نظر آئی؟'' میں نے پوچھا

''مجھے افسوس ہے موہن صاحب لڑکی کو ایک کارخانے میں نوکری مل گئی ہے۔۔۔'' دوسری جانب سے بات ابھی پوری نہیں ہو پائی تھی کہ میں ریسیور رکھ کر نڈھال سا پاس کے گدّے دار

صوفے پر دراز ہو گیا۔ کارخانے میں کام کرنیوالی اتنی لڑکیوں میں سے ایک نوکرانی کا ملنا اس قدر محال ہو گیا ہے یہ کون سوچ سکتا تھا۔ پورا ہفتہ ختم ہونے کو آیا' جب سے میگھا اس گھر سے گئی ہے۔ اُس وقت سے ایک نوکرانی کو ڈھونڈ نکالنا ہمارے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہو رہا ہے۔

میگھا اس گھر سے کیا گئی کہ یہاں کا سارا آرام اور ساری سہولتیں ہی چھن گئیں۔ کسی گھر میں نوکرانی کا اتنا اہم کردار ہو سکتا ہے بھلا؟ لیکن میگھا صرف نوکرانی ہی نہ تھی وہ تو اس گھر کا ایک ستون تھی۔ اس کی غیر موجودگی سے اس گھر میں کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ آج مجھے اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ ایک گھر کے لیے جہاں روپے پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے وہاں گھر کو سنبھالنے کے لیے ایک ذمہ دار انسان کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ریکھا غیر ذمہ دار ہے؟ ایسی بات نہیں، مگر میگھا اس گھر سے اس قدر جڑ گئی تھی کہ ایک ایک کام اس خوش اسلوبی اور سلیقے سے کرتی تھی کہ ہم چین کی سانس لے سکتے تھے۔ میگھا اُس وقت سے ہمارے یہاں کام پر لگی تھی جب ریکھا پیٹ سے تھی۔ ان تین سالوں میں اُس نے ہمیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ کام پر لینے سے پہلے میں نے اُسے تاکید کی تھی کہ ہم دونوں میاں بیوی تو دن بھر گھر سے باہر رہتے ہیں۔ اس لیے گھر کی کسی چیز کے غائب ہونے کی شکایت ملی تو ہم سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ کسی چیز کی ضرورت پڑے تو ہم سے بیشک مانگ لینا۔ مگر کسی چیز کی چوری ہو برداشت نہیں کر پائیں گے۔ میگھا کو اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کرتے وقت شاید میں زیادہ ہی سخت لہجے میں بول گیا تھا۔ لیکن اُس کی لگن اور ایمانداری نے سب کا دل جیت لیا تھا۔

ساڑھے سات سو روپیہ ماہوار تنخواہ پانیوالی میگھا اپنی ذمے داریوں سے بخوبی واقف تھی۔ اس نے باورچی خانے کے سردرد سے لے کر منّی کی دیکھ بھال تک ہمیں مکمل طور پر نجات دے دی تھی۔ بازار سے سبزیاں بھی خرید لاتی تھی بیچاری!۔۔۔ کبھی کبھار پانی اور بجلی کا بل بھی بھر آتی تھی۔ اُس کے کام کرنے کی لگن کو دیکھ کر کبھی کبھی تو میں ایسا سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ "کسی نوکرانی کو اتنی کم تنخواہ دے کر اُس کے کندھوں پر ذمہ داریوں کا اتنا بھاری بوجھ لادنا کہاں

کی ۔۔۔ کہیں یہ غلامی کی نئی شکل تو نہیں ۔۔۔ اِس غلامی سے اُسے آزاد کرنے کے لیے بعض اوقات میں بہت جذباتی ہو جاتا تھا۔ اور جذبات کی اس رو میں میگھا کی تنخواہ میں اضافہ کرنے کا خیال کئی بار دل میں لاتا مگر مہینے کے آخر میں ہمارے دس، ساڑھے دس ہزار روپیوں کی اکٹھی آمدنی کا اس طرح ''بندر بانٹ'' ہو جاتا کہ اپنے اس نیک خیال کو جھٹک دینا پڑتا۔ کبھی میگھا سے ہٹ کر اپنا پورا دھیان معاشرے کے اُن غریب لوگوں پر مرکوز ہو جاتا اور میں سوچا کرتا کہ ایک بر سرِ روزگار بیوی کا گریجویٹ شوہر ہو کر جب مجھے پیسے کی تنگ دستی سے گزرنا پڑتا ہے تو اُن تمام لوگوں پر کیا گزرتی ہوگی جنھیں ہر ماہ ہزار دو ہزار سے کم آمدنی میں گزارا کرنا پڑتا ہے۔ میں اپنے خیالوں میں مستغرق تھا کہ اچانک منّی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میری آنکھیں بے تحاشا میری کلائی پر بندھی گھڑی پر گئیں۔ ابھی تو منّی کو سوئے مشکل سے ایک گھنٹہ ہوا ہوگا۔ پھر یہ رونا کیوں؟ شاید آج بھی وہ شکم سیر نہیں تھی۔ عموماً وہ تین گھنٹوں سے پہلے کبھی نہیں اُٹھی تھی۔ یہ منّی بھی مصیبت کی ایک پُڑیا ہے۔ کھانے بیٹھو تو نا، نا، کرتی رہتی ہے اور گھنٹے بھر بہلا سہلا کر سلاؤ تو گھڑی بھر بعد جاگ جاتی ہے۔ منّی کو دیکھ آنے کے بجائے میں اپنی جگہ پر ہی بیٹھا رہا۔ مجھے پریشان کرنے کے بجائے یہ اُس کے لیے ایک طرح کی سزا تھی۔ بچوں کے نخرے اُٹھانے کے لیے جس صفت کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھ میں قطعی نہیں پائی جاتی ہے۔ مگر میگھا تو لاڈ پیار کا مجسمہ ہے۔ ریکھا نرس ہے، بچوں اور مریضوں کی دیکھ بھال اُسے بخوبی آتی ہے۔ مگر جس خوبی سے میگھا منّی کو سنبھال لیا کرتی تھی ویسی خوبی اور ویسا انداز شاید ریکھا میں بھی نہیں تھا۔ میں دو برس قبل کے اُس واقعہ کو ابھی تک نہیں بھول پایا ہوں جب منّی کے دودھ کے دانت نکل رہے تھے۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ ریکھا کو یہ شکایت تھی کہ اُس نے گھر پر نیند کی گولیاں نہیں رکھی تھیں۔ پہلے پہل تو اس نے بہت ہی صبر سے کام لیا لیکن جب منّی کو چپ کرانے کے سبھی طریقے رایگاں گئے تب ہار کر رات میں میگھا کو اُس کے گھر سے بلانا پڑا تھا۔ بیچاری نے پوری رات منّی کے ساتھ آنکھوں میں کاٹی تھی۔

میگھا جب سے گئی ہے تب سے اس گھر کا نظام ہی درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ گھر کے کام کاج کے لیے ایک دوسری لڑکی کی تلاش۔۔۔ پورا پورا دن منّی کی دیکھ بھال۔۔۔نوکری سے میری غیر حاضری۔۔۔ان باتوں نے مل کر میرے لیے ایک پُر تناؤ کیفیت پیدا کر دی تھی۔ دو دن تو کام سے کسی طرح غیر حاضر ہو گیا تھا۔ مگر تیسرے دن کی غیر حاضری نے مجھے چڑچڑے پن سے بھر دیا تھا۔ آج نوکری پر جانے سے پہلے جب ریکھا نے مجھ سے ہنستے ہوئے کہا۔۔ ''بس ایک دن اور پھر تم نوکری پر جا سکو گے۔'' تب میں نے چڑ کر کہا۔ ''اس گھر میں میرا دم جا رہا ہے ایک ہفتہ اور گھٹے مگر تمہیں تو پوری آزادی حاصل ہے۔''

''آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ ریکھا ایک آتش فشاں کی مانند اُبل پڑی۔

''کہنا تو میں بہت کچھ چاہتا ہوں لیکن تم تو وہی کرو گی جو تم چاہتی ہو، نوکری جو کرتی ہو۔''

ان باتوں سے جیسے میں نے ریکھا کے زخموں پر نمک چھڑک دیا ہو۔ وہ برس پڑی۔ ''ہاں ہاں! میں نوکری کرتی ہوں۔ اسی لیے میں وہی کروں گی جو چاہتی ہوں کیونکہ میں کسی کی باندی نہیں۔''

ایک ساعت کے لیے میں خاموش رہا۔ میں اپنے اندر اُٹھتے ہوئے تلاطم کو لفظوں کا جامہ پہنا پاتا اس سے پہلے ریکھا دروازے کو دھماکے کے ساتھ بند کر کے باہر نکل پڑی۔ میں جل بھن کر اندر ہی اندر کچھ دیر تک اپنے فضول غصّہ پر پچھتاتا رہا۔ دراصل میں نے اپنی احمقانہ باتوں سے ریکھا کو غصہ دلایا تھا۔ ورنہ وہ کبھی اتنے رُوکھے پن سے پیش نہیں آتی ہے۔ بات یہ تھی کہ ہفتے کے دوران فرانس سے امراضِ قلب کے چند ماہرین کی ایک جماعت یہاں کے مریضوں کے آپریشن کے لیے آئی ہوئی تھی۔ ماریشس جیسے چھوٹے ملک میں اتنا اہم آپریشن اپنے آپ میں ایک تاریخ ساز بات تھی۔ دیگر ازاں اس دیس اور اس ہسپتال میں کام کرنے والی نرسوں اور ڈاکٹروں کے لیے بھی یہ فخر کی بات تھی۔ ایسے اہم موقع پر ریکھا کا نوکری سے غیر حاضر ہونا ٹھیک نہیں تھا۔ مگر شوہر ہو کر میرا گھر پر بچے کی دیکھ بھال کرنا اور ریکھا کا بیوی ہو کر باہر رہنا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی میں ریکھا پر بے تحاشا برس پڑا تھا۔

کوئی آٹھ دن کی مسلسل بھاگ دوڑ کے بعد جب ژاکلین نام کی ایک ''کریولی'' لڑکی مل پائی تب کہیں میں نے چین کی سانس لی۔ ژاکلین ایک شادی شدہ عورت تھی۔ اُس کا شوہر ماہی گیر تھا۔ صرف مچھلیوں کی فروخت سے گھر کو چلانا آسان نہیں تھا۔ اس لیے مجبور ہو کر ژاکلین کو بھی کام کی دنیا میں آنا پڑا۔ پہلے ہی دن اُس نے ہمیں صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ صبح سویرے کام پر آئے گی مگر شام کے چار بجے سے قبل اُسے اپنے گھر لوٹ جانا ہوگا۔ ساتھ ہی ہفتے میں وہ صرف پانچ دن کام پر آئے گی۔ سنیچر اور اتوار وہ اپنے لیے رکھنا چاہتی تھی۔۔۔ ژاکلین کو گھریلو کام کاج سنبھالنے کا فن آتا تھا۔ اُس کے کام کرنے کی پھرتی اور چابکدستی کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ مگر ریکھا کسی اور لڑکی کی تلاش میں تھی۔ وہ ژاکلین سے مطمئن نہیں تھی۔ اُس کی نظر میں یہ خادمہ ہمارے گھر کے لیے معقول نہیں تھی اور کہتی تھی وہ صفائی سے کام نہیں کرتی تھی۔۔۔ وہ بچت کرنا نہیں جانتی ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔ اس طرح ژاکلین میں ایسے ہزاروں عیب نظر آتے تھے۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ جب تک کوئی دوسری نوکرانی نہ مل جائے ژاکلین ہی کام پر لگی رہے۔

ایک دن کام سے لوٹا تو گھر کی صفائی دیکھ کر کچھ تعجب ہوا۔ ایک ایک چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ میں بے تحاشا بول پڑا۔ ''گھر کو صاف ستھرا رکھنا کوئی ژاکلین سے سیکھے۔ میگھا بھی اُس کے سامنے پھیکی پڑ جائے گی۔''

ریکھا چڑ کر بولی ''نئی جھاڑو ہے کچھ صفائی ٹھیک ہی کرے گی۔'' جو بھی ہو ژاکلین کے آجانے سے گھر کا ماحول بدل گیا تھا اور ہماری ٹھپ پڑی زندگی معمول پر آگئی تھی۔ کام سے غیر حاضر ہونے کی نوبت اب مجھے نہیں آئے گی یہ سوچ کر میں نے چین کی سانس لی۔

جب ژاکلین دوسرا ہفتہ ہمارے یہاں کام کرنے آئی تب ریکھا کی ''نائٹ ڈیوٹی'' تھی اُس ایک ہفتے کے دوران ژاکلین کو گھر کا سارا کام کاج سمجھا دیا تھا۔ ژاکلین میں کام کو سمجھنے کی جو صلاحیت تھی وہ قابل ستائش تھی۔ لیکن ریکھا اُس سے دور دور ہی رہتی تھی۔ ریکھا کے اس رویہ سے میرے دماغ میں بہت سارے سوالیہ نشان اُبھر آتے تھے۔ وقت کے ساتھ اُس کے رویّے

میں مزید رُوکھا پن آتا گیا۔ ژاکلین کو لے کر وہ بات بات پر ناراض ہو جاتی تھی۔ وہ میرے لیے اجنبی بنتی جا رہی تھی۔ اس کے سلوک اور اطوار سے میں حیران تھا۔

جب میگھا کام پر آتی تھی تو ریکھا گھر کی چیزوں کے رکھ رکھاؤ سے بہت مطمئن تھی۔ کتنی ہی قیمتی چیزیں کئی کئی دنوں تک اِدھر اُدھر پڑی رہتی تھیں مگر اب وہ ہر بات پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ نوکری پر جانے سے پہلے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو الماری میں بند کر دیتی تھی۔ ریکھا کا اس قدر محتاط ہو جانا مجھے اتنا گراں نہیں گزرتا تھا جتنا یہ کہ یہ سب کچھ ژاکلین کو دھیان میں رکھ کر قصداً کیا جا رہا تھا۔

اُس دن رات کو ٹی وی دیکھتے وقت میں نے ریکھا سے کہہ دیا تھا۔ ''اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ ریکھا اگر تم اس طرح بلاوجہ ژاکلین پر شک کرتی رہو گی اور ذرا ذرا سی بات پر اُبل پڑو گی تو یہ اُس کے ساتھ ایک طرح کی ناانصافی ہوگی۔''

ریکھا خاموش رہی مگر مجھے لگا کہ وہ لفظوں کے بغیر ہی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر اچانک ریکھا کی اَن کہی باتیں جیسے میری سمجھ میں آ گئیں۔ ژاکلین نوخیز لڑکی نہ تھی اور اس حقیقت سے بھی ناواقف نہ تھی کہ ہوس کا شکار ہو سکتی ہے۔ یوں بھی ژاکلین ایک مقناطیسی جسم کی مالکن تھی۔ اُس کی موجودگی سے ریکھا اپنے حق کو خطرے میں محسوس کیا کرتی تھی۔ معاملے کو اور بھی سنگین بنانے کے لیے میں انجانے میں کئی بار ژاکلین کی تعریفوں کے پل باندھ دیتا تھا۔ مجھے یہ اندازہ تھا کہ ریکھا ژاکلین سے کھنچی کھنچی سی رہتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ میری باتوں سے ریکھا ژاکلین کو پسند کرنے لگے گی۔ مگر یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔

اُس دن کے بعد میں نے ژاکلین کے مدمقابل ایک غیر جانبدار اور میانہ رویہ اختیار کیا۔ ریکھا کی موجودگی میں ژاکلین کے سامنے جانا ہی چھوڑ دیا۔ ریکھا سے گفت و شنید کرتے وقت میں ان سبھی باتوں سے کترا جاتا تھا جن کا تعلق ژاکلین سے ہوتا۔ دراصل میں ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ژاکلین سے مجھے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی اور یہ کہ وہ میری دلچسپی کے قابل ہے بھی نہیں! ستم

بالائے ستم کبھی کبھار موقع کا فائدہ اُٹھا کر میں اُس کی برائی بھی گنوا دیتا تھا۔ ژاکلین کے جسم سے ایک عجیب طرح کی بو آتی تھی، خاص طور پر جب وہ پسینے میں شرابور ہو جاتی تھی۔ ایک دن میں نے ریکھا سے کہا "یہ لوگ نہاتے نہیں ہیں کیا" بغل سے گزرو تو ایسی بدبو آتی ہے کہ طبیعت متلانے لگتی ہے۔"

"تمہیں شاید پتہ نہیں یہ لوگ پانی سے کم عطریات سے زیادہ نہاتے ہیں۔ خوشبو بھی کم نہیں لگاتی ہے۔ یہ! مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے اس کے شوہر کی ساری کمائی اس کے سجنے اور سنورنے میں چلی جاتی ہوگی۔" ریکھا نے چہک کر کہا تھا۔

ریکھا کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ریکھا سے زیادہ مجھے مسرت ہوئی تھی۔ ژاکلین کی وجہ سے ہمارے مابین جو دیوار کھڑی تھی وہ منہدم ہوتی ہوئی نظر آئی۔۔۔۔"

ریکھا کے دماغ میں اُٹھتے ہوئے شک کی موج اب خاموش پڑ گئی تھی۔ مگر کچھ چاہتی تھی بس وہی مجھ پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ مگر ایک دن ایسا حادثہ پیش آیا جس سے میں کچھ دنوں کے لیے بہت پریشان رہا۔

جمعہ کا دن تھا۔ میں گھر پر اکیلا تھا۔ سر توڑ بخار کی وجہ سے کام پر نہیں گیا تھا۔ ریکھا منّی کو تین سال کا ٹیکہ لگوانے کے لیے ہسپتال لے گئی تھی۔ ژاکلین نے پہلے سے ہمیں آگاہ کر دیا تھا کہ وہ کسی وجہ سے کام پر نہیں آپائے گی۔

رات بھر سر درد اور بخار کی وجہ سے مرا بُرا حال تھا۔ سر جیسے پھٹا جا رہا تھا۔ دو بار رات میں ریکھا نے مجھے اسپرین کی گولیاں کھلائیں۔ مگر درد تھا کہ جانے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ رات کے آخری پہر جب درد کچھ کم ہوا تب میں کچھ سو پایا تھا۔ سویرے نیند کی آسودگی میں منّی اور ریکھا کا ہلکا سا بوسہ میں نے اپنے گال پر محسوس کیا تھا۔

اُن کے جانے کے بعد بوندا باندی شروع ہو گئی تھی اور رفتہ رفتہ موسلا دھار بارش بھی ہونے لگی تھی۔ چادر تانے میں بستر پر پڑے پڑے کھڑکی کی اوٹ سے بارش کا لطف لے رہا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر تک میں یوں ہی پڑا رہا۔ اچانک دروازے کی گھنٹی سنائی دی۔ پھر دروازے پر دستک دی گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نیم برہنہ حالت میں دروازے کا پردہ اُٹھایا۔ میں چونک پڑا۔ میرے پاؤں کے نیچے سے گویا زمین کھسک گئی تھی۔ وہ بارش میں بُری طرح بھیگ گئی تھی۔ بارش سے بچنے کے لیے وہ چبوترے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔

''تم۔۔۔تم تو آج آنے والی نہیں تھی نا۔'' میں نے دروازہ کھول کر ہکلاتے ہوئے کہا۔

''بس آ گئی۔ سوچا کہ پیر کو کام بہت زیادہ ہوگا۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''مگر آپ اس طرح حیران کیوں ہیں؟ کیا میرا آنا آپ کو اچھا نہیں لگا؟'' اُس نے معلوم کیا۔ مجھے لگا کہ اُس کی زبان پر جیسے یہ شرارت کے کلمات تھے۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ پوچھ بیٹھی۔ ''منّی گھر پر نہیں ہے کیا؟'' میں نے اُسے منّی اور ریکھا کے بارے میں بتایا۔

''تم پوری طرح بھیگ گئی ہو۔ جا کر کپڑے بدل لو۔''

میرے آخری جملے پر اُس نے مجھے کنکھیوں سے دیکھا تھا۔ ایک پل کے لیے میری آنکھیں اُس پر جم گئی تھیں۔ میری سانسیں پھولنے لگی تھیں اور دل چاہتا تھا کہ اُنہیں اپنے ہاتھوں میں قید کر لوں۔ مگر جیسے میرے مافی الضمیر نے مجھے آگاہ کیا۔ جلد بازی میں معاملہ بگڑ جائے گا۔ پہلے دانا ڈالو، چڑیا خود بخود جال میں پھنس جائے گی۔

ژاکلین باروچی خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ میں نے آواز دے کر کہا ''غسل خانے کے ہینگر پر ریکھا کے کپڑے ہوں گے۔ انہیں پہن لینا۔ ورنہ سردی لگ جائے گی۔''

میں دالان سے نکل کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ ابھی بستر پر لیٹا ہی تھا کہ قدموں کی آہٹ سے اندازہ ہوا کہ ژاکلین غسل خانے کی طرف جا رہی تھی۔ پھر حمام خانے کا دروازہ بند ہوا۔ بعد ازاں غسل خانے سے فوارے دار نل سے پانی کے گرنے کے ساتھ ساتھ چھپ چھپ نہانے کی آواز بھی آنے لگی۔۔۔ اور حمام خانے کے قد آدم شیشوں کے سامنے والا منظر میری آنکھوں کے سامنے ناچ اُٹھا۔ میرے جسم میں جیسے بجلی کوند گئی تھی۔ مجھے ایک عجیب قسم کی تپش

محسوس ہورہی تھی۔ میں گھر سے باہر نکل پڑا تھا۔ میرے ہاتھ میں ٹوتھ برش اور پیسٹ تھا اور اسی کشمکش میں، میں دانت صاف کر رہا تھا۔ فضا صاف ہوتی جا رہی تھی۔ بادلوں سے سورج نکلنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اس طرح موسم کا خوشگوار ہونا مجھے اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ بارش ہو اور خوب جم کر ہوتا کہ مجھے ژاکلین سے کھل کر باتیں کرنے کا موقع مل سکے۔

کچھ دیر کے بعد جب میں باروچی خانے کی طرف گیا تو دیکھا کہ ژاکلین شبینہ لباس میں ملبوس ہے اور دھلائی کے لیے میلے کپڑے لیے جا رہی ہے۔ میں ہمت کرتے ہوئے بولا۔

''ژاکلین ادھر آنا تو، مجھے تم سے کچھ معلوم کرنا ہے۔'' ژاکلین کے چہرے پر تشویش کی شکنیں اُبھر آئیں۔ ایک پل کے لیئے وہ سہم سی گئی تھی کہ کہیں اُس کے ہاتھوں سے کوئی کام غلط تو نہیں ہو گیا۔ اُس کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے میں نے فوراً کہا تھا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔۔ میں بس جاننا چاہتا تھا کہ تمہیں یہاں کام کرتے ہوئے چھ مہینے سے زائد ہو گئے ہیں نا۔؟

''جی کل پورے سات مہینے ہوئے ہیں۔''

اُس دوران تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟

''جی نہیں''

''دن کا کھانا یہاں ٹھیک سے مل جاتا ہے نا؟''

اُس نے سر ہلا کر حامی بھری۔

''دیکھو ژاکلین! میں چاہتا ہوں کہ تم اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ اپنے کو اس گھر سے جوڑو۔ میں محض اس گھر کا مالک ہی نہیں بلکہ تمہاری بھلائی اور نقصان کے بارے میں بھی سوچتا ہوں۔ ریکھا کبھی غصے میں آ کر تمہیں کچھ کہہ بھی دے تو اُس کی باتوں کا بُرا نہ ماننا''

مجھے لگا کہ ژاکلین کی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔ ہمت کر کے میں نے بات آگے بڑھائی۔

''اچھا ژاکلین تمہیں کسی چیز کی ضرورت پڑے تو مجھ سے ضرور کہنا۔ تمہاری مدد کرنے میں مجھے از حد مسرت ہوگی۔

ژاکلین ایک پل کے لیے خاموش کھڑی رہی۔ پھر دھیمے انداز میں بولی۔ ''آپ بُرا نہ مانیں تو سو روپے کی پیشگی مانگنے کی میں گستاخی کر سکتی ہوں۔؟''

میں نے اندھیرے میں جو تیر چھوڑا تھا وہ نشانے پر جا بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے بھی ژاکلین دو تین بار پیشگی کا تقاضہ کر چکی تھی۔ اُس کی اسی معاشی پریشانی کا فائدہ اٹھانے کے لیے میں نے مدد کرنے کی بات کی تھی۔

''ہاں مل جائے گی۔ تن اور من دونوں سے خدمت کرنے پر۔۔۔'' بہت ہی شاطر منصوبوں کے پیش نظر میں اپنے شکار کو پھانستا جا رہا تھا۔ ''آپ لوگوں کی خدمت میں کوئی کسر نہ رہے میری تو یہی کوشش ہے۔'' اُس نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا

میں سمجھ نہیں نہیں پا رہا تھا کہ ژاکلین سچ مچ ناسمجھ تھی یا سمجھ کر بھی ناسمجھ بننے کا ناٹک کر رہی تھی۔''

''اچھا ژاکلین ذرا ایک بات بتانا۔ ڈیڑھ سو روپیوں کی آمدنی سے کیا تمہارا گزارہ ہو جاتا ہے۔؟''

''جی ! کرنا پڑتا ہے۔''

''مطلب یہ کہ نہیں ہوتا ہے! پھر تو میں اپنے فرائض سے چوک جاؤں گا اگر میں تمہاری مدد نہیں کرتا ہوں۔؟'' ژاکلین کی آنکھوں میں کئی سوالیہ نشان نظر آ رہے تھے۔ ''ہاں ژاکلین ! میں تمہاری تنخواہ بڑھا دینا چاہتا ہوں۔ اسے تم کچھ کہہ سکتی ہو۔ میری فراخ دلی۔ میری نرم دلی یا صرف میری انانیت۔ دراصل مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم دونوں شادی شدہ ہیں۔ مگر یہ بھی کم سچ نہیں کہ بیوی کے بعد ہر عورت بہن نہیں ہوتی اور ہر مرد بھائی نہیں ہوتا۔ عورت اور مرد کے بیچ نئے رشتے قائم ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے اور میں۔۔۔''

میں نے سب کچھ کہہ دیا تھا جو کچھ سوچا تھا اور جتنا کچھ نہیں بھی سوچا تھا۔

میرے چپ ہوتے ہی بالٹی بھرے کپڑے لے کر ژاکلین دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے لپک کر اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''تم نے کچھ کہا نہیں؟'' میں نے اُس سے کہا
۔؟''تو میں یہی سمجھ لوں کہ تمہاری طرف سے ''ہاں'' ہے۔''

ژاکلین نے مجھے اُوپر سے نیچے ایک تولتی ہوئی نظر سے دیکھا، پھر چپ چاپ کمرے سے باہر چلی گئی۔۔۔۔

اگلے پیر کو بیماری کا بہانہ بنا کر جب میں آفس سے نکلا تو مجھے اپنی مراد پوری ہونے میں کوئی شائبہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ویک اینڈ کے دوران ژاکلین کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اُمید اور نا اُمیدی کے بیچ میں اپنے کو گرفتار پاتا۔ کہیں ژاکلین نے میری پیش کش ٹھکرا دی تو؟ پھر خیال آتا کہ نہیں ژاکلین ایسا نہیں کرے گی۔ ٹھیک ہے اُس نے صاف لفظوں میں ''ہاں'' نہیں کہا تھا مگر انکار بھی نہیں کیا تھا۔ اُس نے تو صرف خاموشی اختیار کر لی تھی اور خاموشی کا مطلب انکار تو نہیں ہوتا۔ میری پیش کش کو نامنظور کر کے ژاکلین بھلا پیش کی ہوئی رکابی پر لات کیوں مارے گی۔ کیا وہ نہیں جانتی ہے کہ میری بات کو نامنظور کر کے وہ اپنا نقصان کرے گی۔

ویسے ژاکلین فرغ البال نہ تھی۔ اُس کا شوہر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتے کرتے خود تصلیب ہو گیا تھا۔ پھر جوانی کے عروج کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی اسے فرصت ہی کہاں ملتی ہو گی۔ ابھی کچھ دن ہوئے ژاکلین نے ریکھا کو بتایا تھا کہ اُس کے شوہر نے اسے زدوکوب کیا تھا۔ اُسے بس مارنے پیٹنے کے لیے بہانا چاہیے تھا۔ ایسی عورت کو جہاں بھی تھوڑی ہمدردی مل جاتی ہے وہیں وہ کمزور پڑ جاتی ہے، اور میں نے ژاکلین کو کوئی کم ہمدردی دکھائی تھی؟ پھر تو۔۔۔ مجھے تمام معاملے کا رجائی پہلو نظر آنے لگا اور مجھے اپنے منصوبے میں کامیاب ہونے کا راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔

ہاں مجھے ژاکلین کو پانے کی ہوس تھی۔ اس میں چاہت یا محبت کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ اسے ایک قسم کا لالچ کہا جا سکتا ہے۔ گویا ذائقہ بدلنے کا لالچ! مجھے ژاکلین کو پانے کا لالچ تھا اور اسی

مچلتی ہوئی آرزو کے پسِ پشت ایک پرائی عورت کا دیدہ زیب نیز مقناطیسی جسم تھا۔

دفتر سے بس سٹاپ تک کا راستہ میں نے ٹیکسی سے طے کیا کیونکہ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ قسمت اچھی تھی اڈے پر پہنچتے ہی بس مل گئی۔ میں بیٹھا ہی تھا کہ وہ چل پڑی۔ بس میں آگے کی باتوں کی دل ہی دل میں پریکٹس کر رہا تھا۔ کیا ہی اچھا موقع تھا کہ ریکھا گھر پر نہیں تھی۔ منّی تو اب تک سو گئی ہوگی۔ گھر پہنچتے ہی میں ژاکلین کو آواز دوں گا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چونکنے کا ناٹک کرے گی۔ پھر شرماتی لجاتی وہ دروازہ کھولے گی۔ اندر جاتے ہی میں قمیض کی جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالوں گا۔ جیسے ہی وہ نوٹ لینے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھائے گی میں اُس کی کلائی پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچ لوں گا۔ پہلے تو وہ شرمائے گی، پھر نخرے دکھائے گی! پر دوسرے ہی پل وہ میری بانہوں میں ہوگی۔ میں اُسے لیے بیڈروم کی طرف بڑھوں گا۔

یکا یک میں خیالوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آگیا۔ ہوا سے باتیں کرتی بس، میری منزل کے بس سٹاپ کو پار کرنے والی تھی۔ میرا ہاتھ ہوا میں اوچھل پڑا۔ میں نے جھٹ گھنٹی بجائی بس ابھی پوری طرح رُکی بھی نہ تھی کہ میں نیچے کود پڑا۔ گھر جاتے ہوئے مجھے پہلی بار گھر اور بس سٹاپ کا فاصلہ زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

موڑ پر آیا تو گھر دکھائی دیا۔ میری دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔ پیروں میں لڑکھڑاہٹ سی مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ مجھ سے آگے کا راستہ طے نہیں ہو پائے گا۔ جیسے تیسے گھر پہنچا تھا۔ اپنے دل کی ڈھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔

منّی ''پاپا آگئے پاپا آگئے۔'' چلاتی ہوئی میری طرف دوڑی چلی آئی۔ اُسے اسوقت سوتے ہوئے نہ پا کر میں آپے سے باہر ہوگیا تھا۔ اُس کے گندے ہاتھوں سے اپنے کپڑوں کو بچاتے ہوئے میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو اپنی گود میں اُٹھالیا۔

''آپ نے اسے گود میں اُٹھالیا؟ آپ کے کپڑے خراب ہوگئے ہوں گے۔'' اپنے پیش بند سے ہاتھ پونچھتی ہوئی ژاکلین منّی کو لینے کے لیے میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ ''یہ ابھی تک

سوئی کیوں نہیں؟ میں نے اپنے غصّہ کو دباتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''سلانے کا موقع ہی نہیں ملا صاحب۔ آج صبح سے ہی پورے گھر کی صاف صفائی میں لگی ہوں۔ مگر آج آپ اتنے سویرے کیسے آگئے؟''

ژاکلین کا یہ سوال مجھے ذرا گراں گزرا۔ میں نے قریب قریب اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''دیکھو اسے لے جاؤ اور جلدی سے نہلا کر سلا دو۔''

وہ منّی کو لے کر چلی گئی اور میں اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ فیتے کی گانٹھ کھولے بغیر میں نے موزے اور جوتے اُتارے۔ چھت کی جانب ٹکٹکی باندھے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کون سا بہانا بنا کر اُسے پاس بلاؤں۔؛ چنانچہ میں نے اُسے آواز دی۔ کمرے سے دبی ہوئی آواز آئی۔ ''ابھی آئی'' وہ شاید منّی کو سلا رہی تھی۔۔اور میں اُس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ ہی دیر بعد ژاکلین کمرے میں داخل ہوئی۔

''ذرا وہ کتاب تو دینا لال جلد والی۔'' میں نے لیٹے لیٹے کتابوں کی طاق کی جانب اشارہ کیا۔ بڑے ہی احتیاط کے ساتھ وہ کتاب نکالنے لگی۔ اُس کا ردِعمل دیکھنے کے لیے میری آنکھیں اُس کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ ژاکلین نے کتاب نکال لی، اُس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر ایک تبسّم کے ساتھ میری طرف بڑھا دی۔ میں نے لپک کر اُس کی کلائی پکڑ لی اور زور سے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ میری گود میں آگری۔ اپنے کو چھڑانے کے لیے اُس نے ہر ممکن کوشش کی۔ پھر اپنے کو آزاد کراتی ہوئی وہ کسی زخمی شیرنی کی مانند ترش لہجے میں بولی ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے ہیں آپ؟ کیا یہ سب آپ کو زیب دیتا ہے؟'' کم سے کم مجھے آپ سے یہ اُمید نہیں تھی۔ میں آپ کو بہت شریف انسان سمجھتی تھی۔ مگر اچانک یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں، سمجھ دار ہیں! میں سمجھتی تھی کہ میری اُس روز کی خاموشی سے آپ سنبھل جائیں گے۔ مگر آج تو آپ نے ساری حدیں پار کر دیں۔'' میں ساکت اپنی جگہ پر تھا۔ گویا میری رگوں میں خون کے بجائے پانی دوڑنے لگا ہو۔ میرے کانوں میں اُس کے الفاظ گونج رہے

تھے۔ ''اب میں سمجھ گئی ہوں کہ سب مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کیا ہر جگہ میں اسی طرح ذلیل وخوار ہوتی رہوں گی؟ اپنے گھر میں اس سے پہلے والے گھر میں اور آج یہاں؟ کیا میں لوگوں کی نظر میں محض ایک عورت، ہوس کا مرکز، گوشت کا ایک لوتھڑا ہی رہوں گی؟''
کہتے کہتے وہ رُک گئی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک سیلاب اُمڈ آیا تھا۔

برجستہ دل میں خیال آیا کہ گھر سے بھاگ نکلوں۔ مگر میں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا اور شرم کی تاریک گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ زہر اُگلتی رہی میں بس سنتا رہا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں اب آپ وہ آدمی نہیں رہے جو شروع میں تھے۔ آپ کے اندر ہوس کی ''وائرس'' داخل ہوگئی ہے۔ آپ اور ایسی کمینی حرکت! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

ایسا لگا جیسے مجھے چپ چاپ پا کر وہ مزید طیش میں آرہی تھی اور مجھ پر حاوی ہونا چاہتی تھی۔ میری بے عزتی نے غصہ کی شکل اختیار کرلی۔ اپنے ہونٹ دباتے ہوئے میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ بستر پر پڑی کتاب جیسے مجھے چڑا رہی تھی۔ کتاب اُٹھائی اور ژاکلین کو دے ماری۔ ژاکلین نے فرش پر پڑی ہوئی کتاب کی طرف دیکھا، پھر میری طرف۔ اُس کے بعد بولی۔ ''ایسا تو مجھے کرنا چاہیے تھا۔۔۔۔'' اس کے چہرے پر طنز کا ایک ہلکا سا تبسم نمودار ہوگیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں لاچار و بے بس ہوگیا تھا۔ جیسے میرے بال اُس کے ہاتھ میں تھے اور وہ میری بے بسی کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہی تھی۔

پل بھر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔ ''میں آپ کا زیادہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی۔ مگر جانے سے پہلے ایک بات ضرور بتانا چاہتی ہوں کہ دُنیا کی سب سے خوبصورت عورت تمہیں کیا دے سکتی ہے جو تمہاری بیوی تمہیں نہیں دے پاتی اور جسے میں دیتی؟'' میں ژاکلین کے اس جملے سے بدحواس سا ہوگیا۔ میرے پاس کوئی جواب نہ تھا میں چپ چاپ رہا۔ کچھ لمحوں کے بعد میں نے ژاکلین کی طرف دیکھا وہ کمرے سے باہر جا چکی تھی۔ محض اس کمرے سے نہیں بلکہ اس گھر سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ پوری رات کروٹ بدلتے گزری۔ میں سچ مچ بیمار پڑ چکا

تھا۔ اگلے دن میں کام پر نہیں جا سکا۔ میری حالت دیکھ کر ریکھا بھی گھر پر رہنا چاہتی تھی۔ مگر ضد کر کے میں نے اُسے کام پر جانے کے لیے راضی کر ہی لیا۔ دراصل میں تنہائی چاہتا تھا۔

ریکھا کام پر چلی گئی تو میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ منّی بھی میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ میرے ارد گرد کھیلتی ہوئی ادھر اُدھر کے سوالات کر رہی تھی۔ میں اُس کی باتوں کا ہاں یا نا میں جواب دے رہا تھا۔

میز پر پڑی ہوئی کتاب اُٹھا کر میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ دو ایک سطور پر نظر دوڑائی مگر میں ذہن کو کتاب میں مرکوز نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نئی نوکرانی کے لیے فکر مند نہیں تھا۔ منّی کی بھی مجھے قطعی فکر نہیں تھی۔ رہ رہ کر ژاکلین کے الفاظ میرے کانوں میں باز گشت کر رہے تھے۔ ''آپ کے اندر ہوس کی 'وائرس' داخل ہو گئی ہے۔'' گدّے دار صوفہ مجھے سخت معلوم ہونے لگا تھا بلکہ مجھے چُبھنے بھی لگا تھا۔ میں نے کتاب بند کر دی اور دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔ میرے اندر طرح طرح کے خیالات لاوے کی مانند اُبل رہے تھے۔ انسان کتنی جدوجہد کے بعد معاشرے میں اپنا کوئی مقام بنا پاتا ہے۔ اپنی ایک پہچان بنا پاتا ہے مگر ذرا سی لاپرواہی پر اُس کی ساری امیج (Image) خراب ہو جاتی ہے۔ کہیں میرا بھی یہی حال تو نہیں ہوگا۔؟ آج لوگ میری عزت کرتے ہیں۔ کسی سے ہاتھ ملاتا ہوں تو اُس کی آنکھوں میں جو چمک ہوتی ہے وہ بھی میں دیکھ سکتا ہوں۔ لوگوں کو اگر میری اس حرکت کا علم ہو جائے تو میری کتنی بدنامی ہوگی۔ میرا گھر سے نکلنا محال ہو جائے گا۔ لوگ کیسے کیسے فقرے کسیں گے۔ میں پانی پانی ہوا اُٹھا اور خیال آیا کہ اس ایک لغزش سے معاشرے میں میری عزت خاک میں مل سکتی ہے۔ شام کو جب ریکھا کام سے واپس آئی تو گھر کی بدنظمی کو دیکھ کر چونک اٹھی ''آج ژاکلین کام پر نہیں آئی تھی کیا؟''

میں نے اپنے کو اس سوال کے لیے تیار رکھا تھا۔ بولا ''ریکھا! پتہ نہیں تم اس بات کو کیسے تسلیم کرو گی، مگر آج میں نے وہ کام کیا ہے جو مجھے بہت پہلے ہی کر دینا چاہیے تھا۔ تمہاری ایک ایک چیز کو اس قدر چھپا کر رکھنا کئی بار بُرا لگتا تھا۔ مگر تم وہی کرتی رہی ہو جو ایک ذمہ دار خاتون کو

کرنا چاہیے۔اس زمانے میں کسی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ژاکلین دیکھنے میں کتنی بھولی بھالی تھی مگر اندر سے کتنی شاطر اور چالو، اس بات کا علم مجھے آج ہوا۔آج تو اُس نے مَنّی کے سونے کی چین پر ہاتھ صاف کر ہی دیا تھا۔غنیمت جانو عین موقع پر میں نے اُس کی چوری پکڑ لی۔ پہلے تو ہاتھ جوڑنے لگی، معافی طلب کرنے لگی پھر صفائی پیش کرنے لگی۔مگر جب میں نے بہت ہی سخت لفظوں میں بتایا کہ چور چوری سے باز آ سکتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں تو اُس نے شکست خوردہ ہو کر اپنے حسن کا جھانسہ دیا۔لیکن میں اُس کی میٹھی میٹھی باتوں میں نہیں آیا۔''

میں جس مہارت کے ساتھ جھوٹ بولتا جا رہا تھا اُس پر مجھے خود حیرت ہو رہی تھی۔اپنے چہرے پر معصومانہ انداز اور کیفیت کو برقرار رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔''تم نے مجھے کبھی صاف لفظوں میں نہیں بتایا مگر مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ژاکلین کا یہاں آنا تمہیں شروع سے ہی پسند نہیں تھا۔اُس کی وجہ سے ہم دونوں میاں بیوی میں کوئی تناؤ پیدا ہو، میں گوارا نہیں کر سکتا تھا۔اسی لیے آج اس کی چوری کو لے کر میں نے اُسے کام سے ہٹا دیا۔بولو ریکھا! کیا ایسا کر کے میں نے کوئی غلطی کی؟''

ریکھا چُپ تھی۔اُس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔اُس کی نظروں میں اُس کے شوہر کا وقار بڑھ گیا تھا۔آج اس کے وجود کو ژاکلین نام کی شے سے کوئی خطرہ نہ تھا۔وہ بہت خوش ہوئی اور میرے بدن سے بیل کی مانند لپٹ گئی اور بولی ''رمیش تم کتنے سمجھدار اور اچھے ہو۔'' لیکن میں ساکت سا کھڑا رہا۔میں اپنی ہی نظروں میں گر چکا تھا اور اپنے آپ کو ادنیٰ اور ذلیل محسوس کر رہا تھا۔

افسانہ

سلیم زاہد صدیقی

کیڑے مکوڑے

لنچ آور میں سب ڈائنگ ٹیبل کے اطراف جمع تھے

آج اختر نظر نہیں آرہا۔ محسن نے کہا

ہاں وہ ہیڈ آفس گیا ہے۔ جمال نے جواب دیا۔

خیریت تو ہے نا؟۔

اس کیگھر ولادت متوقع ہے اسی کے لیے ہیڈ آفس سے ہسپتال کا لیٹر بنوانے گیا ہے۔ محسن نے اختر کی غیر حاضری کی وجہ بیان کردی۔ یار جمال پچھلے سال بھی تو اختر کے ہاں ولادت ہوئی تھی نا! بیٹا ہوا تھا نا !وحید نے پوچھا۔ ہاں یہ اس کے ہاں چھٹی ولادت ہوگی۔ محسن نے جواب دیا۔ کمال ہے یار بالکل ہی جاہل ہے۔ جاوید نے کہا۔ اس نے بیوی کو بھی انڈسٹری سمجھا ہوا ہے۔ کہ ہر سال منافع دے۔ لیکن منافع کے ساتھ نقصان بھی ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔۔۔ بلکہ اس کی تو ہوم انڈسٹری نقصان میں ہی جارہی ہے۔ کیوں جمال؟ وحید نے کہا نقصان میں کس طرح؟ جمال نے پوچھا بھئی! پہلے پانچ بچوں میں بیٹا ایک ہی ہے نا۔۔۔ باقی بیٹیاں ہیں شاید تمہارا مطلب ہے کہ بیٹا ہوم انڈسٹری کا منافع اور بیٹیاں نقصان ہیں۔ کیا غلط کہا میں نے؟ پتہ نہیں اس کا جواب تو ہمارا دانشور حسن ہی دے سکتا ہے۔ کیوں بھئی حسن کیا خیال ہے؟ جمال نے حسن کو متوجہ کیا۔ میرا خیال تو جو ہوگا وہ تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ کیوں؟

اس لیے کہ میں قطعی مختلف رائے رکھتا ہوں لیکن مجھے پہلے یہ اعتراض ہے کہ اختر کو جاہل کیوں کہا گیا؟ حسن نے سوال کیا۔ یار اس دور میں زیادہ بچے پیدا کرنا جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔ جاوید نے جواباً کہا۔ یار مجھے چپ ہی رہنے دو تم لوگ میری سچائی سن نہیں سکو گے حسن نے کہا۔

نہیں یار دانشور! تم کہو ہم سب دوست بیٹھے ہیں کوئی لڑائی تھوڑی لڑ رہے ہیں۔ جمال نے کہا۔ جمال! جاوید اختر کو اس لیے جاہل کہہ رہا ہے کہ اس کے پانچ بچے ہیں۔۔ پھر ان کا خیال ہے کہ اس دور میں زیادہ بچے ہونا برائی ہے۔ برائی کیوں ہے؟ اس کا جواب ان کے پاس شاید ہو۔ شاید نہ ہو میرے پاس جواب بہر حال ہے رہی بات بچے ہونے کی تو یہ اللہ کی دین ہے۔ میرا ایمان ہے بلکہ ہر مسلمان کا ایمان ہونا چاہیے کہ جس روح کو اس دنیا میں آنا ہے اسے ہم۔آپ نہیں روک سکتے۔

مگر حسن نے تو روکا ہوا ہے۔ جمال نے حسن کو تاؤ دلا دیا۔ ارے رہنے دیجئے روکا ہوا ہے۔ ان کی کیا طاقت کہ یہ روکیں۔ نہ روکنا ان کے بس میں ہے۔ نہ لانا۔ لیکن حسن! وہ یہ بات کر چکے ہیں۔۔۔ پچھلے بارہ سال سے ان کے گھر کوئی ولادت نہیں ہوئی ہے بس دو ہی بچے انہوں نے شادی کے بعد ایک سال کے فرق سے پیدا کیے اور پھر چھٹی۔ جی ہاں یہ اسی پر تو نازاں ہیں۔ مگر ان سے مجھے پوچھ کر بتا دیں کہ انہوں نے اس کو روکنے کے لیے کیا کیا اور کیوں کیا۔ اور یہ کہ اگر یہ چاہیں تو اب کسی کو لا سکتے ہیں۔ دیکھو حسن تم ٹریک سے ہٹ رہے ہو۔ کم بچے خوشحال گھرانہ۔ ہر روز اخبار، ریڈیو، ٹی وی یہ اعلان کرتا ہے۔ اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اتنی تیزی سے غذائی پیداوار نہیں ہو رہی ہے۔ اور اگر آبادی پر کوئی چیک نہ لگایا گیا تو غذائی بحران اتنا شدید ہو جائے گا کہ آدمی۔ آدمی کو کھانے لگے گا۔ لہٰذا بچوں کی بہتر نگہداشت اور غذائی کمی پر قابو پانے کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ ہم آبادی پر کنٹرول کریں اور وہ کم بچے پیدا کر کے ہی کی جا سکتی ہے۔ محسن نے ایک تقریر جھاڑ دی۔

مجھے جواب دینے کی اجازت ہے؟ حسن نے جمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ضرور ضرور جمال نے مزاحاً میز کو تھپتھپاتے ہوئے آڈر آڈر بھی کہا۔ حسن نے بھی مزاحاً مسکرا کر شکریہ کہا اور بولنے لگا۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ غذائی بحران پیدا ہو جائے گا۔ اگر پیدائش پر کنٹرول نہ کیا گیا۔ میرے دوستو! مسئلہ یہ ہے کہ یہ ایک سامراجی سازش ہے کہ آپ لوگوں کا ایمان اللہ کے

اس یقین دہانی پر سے اُٹھ گیا ہے کہ ''رزق اللہ دیتا ہے'' دنیا کی تمام مخلوق۔ اللہ کی ہے اور اللہ ان سب کے لیے رزق پیدا کرتا ہے۔ کیا آپ نے اخبارات میں نہیں پڑھا کہ کئی ملکوں میں قحط پڑا ہوا ہے جب کہ اس کے برعکس کئی ممالک ایسے بھی ہیں جو اپنا پرانا اناج اور مکھن کا ذخیرہ چوہوں کو کھلا رہے ہیں۔ سمندر کی نذر کر رہے ہیں کہ ان کے گودام نئے اور تازہ اناج کے لیے خالی کئے جا سکیں۔ اس سے ایک بات تو طے ہوئی کہ تمام دنیا میں پیدا ہونے والا غلہ اس دنیا کے تمام انسانوں کے لیے نہ صرف کافی ہے بلکہ شاید زیادہ بھی۔۔۔ اللہ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اب اگر لوگ قحط سے مر رہے ہیں تو یہ وہ انسانی ظلم ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی ہے اور جس کے لیے آخرت میں سزا بھی ہے۔ اب آیئے دوسری جانب وہ ہے موت اور پیدائش میں توازن تو میرے دوستو! قدرت یہ توازن خود برقرار رکھتی ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں فکر کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے حسن خاموش ہوا تو جمال پھر بول اٹھا۔

کہاں یار۔ اب یہی دیکھو کہ سائنس نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ پہلے کتنے ہی بچے پیدا ہونے کے فوراً بعد مر جایا کرتے تھے۔ جس کو ''چائلڈ مورٹالٹی'' کہتے ہیں۔ مگر اب چائلڈ مورٹالٹی کی شرح بہت کم ہوگئی ہے۔ اسی طرح بہت سی بیماریوں پر قابو پالیا گیا۔ اب ٹی بی، خسرہ، چیچک، اور بہت سی بیماریوں سے اتنی اموات نہیں ہوتی ہیں جتنی آج سے پچاس یا سو سال پہلے ہوا کرتی تھیں۔ لہٰذا توازن میں فرق تو پیدا ہوا ہے حسن نے مسکرا کر کہا۔ آپ کی اطلاعات بہت محدود اور یکطرفہ ہیں آپ کی نظر' مجھے معاف فرمایئے گا' بہت محدود ہے۔ آپ لوگ نہ پڑھتے ہیں نہ دیکھتے ہیں۔ اور نہ سوچتے ہیں۔ ورنہ ایسی سطحی بات نہ کرتے۔ سچ ہے چائلڈ مورٹالٹی کی شرح کم ہوئی ہے نت نئی دواؤں نے بہت سی بیماریوں پر کنٹرول کر لیا ہے مگر یہ بھی دیکھئے کہ کتنی نت نئی بیماریاں پیدا ہوگئی ہیں ۔ کینسر پر ابھی قابو نہیں پایا جاسکا کہ ''ایڈز'' شروع ہوگئی ابھی اور نہ جانے کتنی بیماریاں ایسی ہیں جن کی تشخیص ہی نہیں ہوسکی ہے۔ پھر دوسری جانب بڑھتے ہوئے ٹریفک کے عذاب نے کتنے قہر ڈھائے ہیں روز سو پچاس بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگ ہلاک ہو جاتے

ہیں۔ پیداوار کی جانب دیکھیں تو جس زمین سے سال میں بمشکل ایک فصل ہوتی تھی اب کئی فصلیں حاصل کی جاتی ہیں۔ فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ جہاں پہلے صرف بارش سے آبیاری ہوتی تھی وہیں اب نہر اور ٹیوب ویل سے پانی حاصل کر کے فصل اگائی جاتی ہے۔ یہ بھی سائنس کی دین ہے۔ اس طرح قدرت تو اپنا توازن باقی رکھتی ہے۔ دراصل آپ کو مالتھس کے نظریے نے اتنا متاثر کر دیا ہے اور سامراجیوں نے اس تھیوری کا اتنا پروپیگنڈہ کیا ہے کہ آپ کسی دوسری تھیوری دوسرے نظریے کو پڑھنا ہی نہیں چاہتے حالانکہ مالتھس کی اس تھیوری کا جواب کارل مارکس نے بہت مدت پہلے دیا ہے لیکن کارل مارکس پر ایک لادینی نظریہ کا حامل ہونے کا الزام لگا کر ہم مسلمانوں کو اس کے پڑھنے سے ہی روک دیا گیا۔ یہ ایک سازش رہی ہے جمال صاحب! یہ ایک ایسا سلو پوائزن تھا جو دھیرے دھیرے تمام مشرق اور مغرب میں سرایت کر گیا ہے۔ قرآن حکیم نے مصر کے قحط کا ذکر کیا ہے۔ جس کی اطلاع حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کے حوالے سے عزیز مصر کو دے دی گئی۔ کہ اس عرصہ کے بعد ایک دو سال نہیں سات طویل برسوں کے لیے قحط پڑے گا اور پڑا سات سال کا وقت بھی اللہ تعالیٰ نے دے دیا لیکن کسی جگہ قرآن حکیم نے یہ نہیں بتایا کہ حضرت یوسف یا عزیز مصر نے یہ اعلان کیا ہو کہ رعایا آئندہ چودہ سال تک شادی نہ کریں یا بچوں کی پیدائش پر قدغن لگائیں۔

یار اُس وقت آبادی اتنی تھوڑی تھی۔ جاوید نے کہا۔ اچھا اگر اس وقت آبادی اتنی نہیں تھی تو جب آدم اور حوا اس زمین پر آئے اور پیدائش کا سلسلہ شروع ہوا تو اس زمین پر غلہ کتنا تھا اور آبادی کی رفتار کیا تھی۔ کبھی سوچا ہے؟ مگر اس وقت تو جنت سے کھانا آتا تھا جاوید پھر بولا کب تک حسن نے برجستہ کہا۔ تو تمہارا خیال ہے کہ پیدائش پر کنٹرول نہیں ہونا چاہیے۔؟ میں تو اسی خیال کا حامی ہوں کہ پیدائش پر غیر فطری کنٹرول نہیں ہونا چاہیے۔ اچھا بھائی تم پیدا کیے جاؤ کیڑے مکوڑے۔ جاوید نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ جاوید میرے یہی کیڑے مکوڑے کل تمہارا سرمایہ ۔۔۔ تمہاری قوم کا۔ تمہارے ملک کا۔۔۔ اور تمہارے دین کا سرمایہ ہوں گے حسن نے کہا۔

کہانی

قیصر طارق۔امریکہ

درخت کی کیلیں

عرفان خیر سے اب بیس برس کے ہو گئے ہیں۔اس عمر تک پہنچتے پہنچتے ان کی شرارتیں اس طرح غائب ہوگئی ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔اس عمر میں انہوں نے ایک بے حد معتبر اور بردبار ہستی کا روپ دھار لیا ہے۔یہ اُن دنوں کی بات ہے، جب وہ چھوٹی عمر کے تھے مگر تھے چلتے پرزہ۔قدم قدم پر شرارتیں اور قدم قدم پر شیطانیاں۔۔۔بچپنے میں تو ایسا لگتا تھا جیسے شرارتیں ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں اور وہ شرارتیں کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔

ہر چند کہ وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنا چولا بدل لیا ہے، مگر ان کے بچپنے کی بہت سی شرارتیں مجھے یاد ہیں اور آج میں اُن کی شرارتوں کے حوالے سے ہی بات کروں گی۔اور بات اُس لطیفے سے شروع کروں گی جو ایک ایسے بچے کی ہے جو پیٹ بھر کے شریر تھا۔ہر وقت ہر ایک کا ناک میں دم کئے رکھتا تھا۔اُس کے ماں باپ نے اُس کی پیدائش کا قصہ سنایا کہ اس کے پیدا ہوتے ہی سب نے جو بات نوٹ کی وہ یہ تھی کہ بچے کے سیدھے ہاتھ کی مٹھی مسلسل بند رہتی تھی اور اس نے مٹھی اس قدر زور سے بند کر رکھی تھی کہ لاکھ زور لگانے کے باوجود بھی نہیں کھلتی تھی۔ ظاہر ہے پیدا ہوئے بچے کے ساتھ کون پنجہ آزمائی کر سکتا ہے۔مگر ایک دن سب کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا۔قدرے زور لگایا تو اس کی مٹھی کھل گئی اور اس میں اُس لیڈی ڈاکٹر کی انگوٹھی تھی، جس نے اُس کی پیدائش میں مدد کی تھی۔۔۔ظاہر ہے وہ پیدا ہوتے وقت بھی اپنی شرارتوں سے باز نہیں آیا اور موقع ملتے ہی لیڈی ڈاکٹر کی انگلی کی انگوٹھی اڑا لی

بہر حال یہ تو ایک لطیفہ تھا جس سے یہ باور کرانا مقصود تھا کہ اس لطیفے سے عرفان کی

شرارتوں پر بھی روشنی ڈالی جائے۔شاید روشنی کا لفظ میں نے یہاں غلط استعمال کرلیا۔مقصد یہ کہ ان کی شرارتوں کے بعد ان میں جو تغیر آیا وہ سمجھ سے باہر ہے۔تغیر کی بات بعد میں ہوگی وہ تو اس کہانی کا مقطع کا بند ہے۔مگر پہلے ان کی شرارتوں کی چند باتیں ہو جائیں۔

عرفان بچپنے سے ہی چلبلے تھے۔خود بھی ہر وقت مصروف رہتے تھے اور دوسروں کو بھی اپنے آگے پیچھے بھگائے رہتے۔ڈھولک بجانے کا ان کو بہت شوق تھا جو چیز بھی ہاتھ لگتی اس کو زور زور سے زمیں پر مار کر ڈھولک کی آواز پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔۔۔اور جب قدرے بڑے ہوئے تو شرارتیں بھی اسی حساب سے بڑی ہو گئیں۔۔وہ اب ڈھولک بجانے سے آگے نکل گئے تھے گو کہ گھر کے دیگر افراد کا ناک میں دم کیئے رکھتے مگر ان کا محبوب مشغلہ اپنی بڑی بہن کو تنگ کرنا تھا۔ان کو معلوم تھا کہ ان کی بڑی بہن چھپکلی سے بہت ڈرتی ہے اور وہ اس کو تنگ کرنے کے لیے یہی حربہ استعمال کرتے۔۔۔۔وہ اور بڑے ہوئے تو ان کی شراتیں اور بھی پروان چڑھ گئیں۔ اب انہوں نے گھر والوں کے ساتھ محلے والوں کو بھی لپیٹنا شروع کر دیا ان کو بھی نہیں بخشا۔۔۔محلے والوں کے ساتھ روز ایک نئی شرارت کرتے ،کبھی کسی کی مرغی غائب کر دیتے اور کبھی کسی کے کتے کا وہ حشر کرتے کہ عقل دنگ رہ جاتی۔۔اب چونکہ ان کی عمر اسکول جانے کی ہوگئی تھی تو ہم سب کو ڈر تھا کہ وہ اب اسکول کا ناطقہ بھی بند کر دیں گے۔ان کو لاکھ سمجھایا کہ۔۔۔بیٹا۔اب اپنی شرارتیں بند کرو۔یہ باتیں تم کو اب زیب نہیں دیتیں اور پھر یہ بھی ہے کہ تمہاری شرارتوں سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔''۔۔۔مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی بلکہ بات الٹ ہوگئی ان کی شرارتوں میں مزید ترقی ہوگئی۔۔۔۔۔

۔۔۔خیر سے وہ اب عمر کے اُس حصے میں پہنچ گئے تھے جہاں بچوں کو اچھے بُرے صحیح غلط کی تمیز شروع ہو جاتی ہے۔۔۔مگر ہوا وہی جس کا ڈر تھا۔۔۔عمر کے ساتھ ساتھ ان کی شرارتیں بھی اپنے عروج کو پہنچ گئیں۔۔کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا کہ ان کی شرارتوں کی زد میں کوئی گھر والا نہ آئے ،یا کوئی محلے دار آ کر ان کی شرارتوں کا دُکھڑا نہ روئے۔چونکہ وہ اب قدرے سمجھدار ہوگئے

تھے، اس لیے میں اور اُن کے ابو دونوں ہی ان کو پیار سے سمجھاتے کہ ان کی شرارتیں اب تکلیف دہ ہوگئی ہیں۔۔۔گھر والے تو ان سے تنگ ہیں ہی اب تو نوبت رشتے داروں اور محلے والوں تک پہنچ گئی ہے۔اور سب ہی ان سے تنگ ہیں۔محلے والے تو سب سے زیادہ تنگ ہیں۔

۔۔۔۔۔ایک دن ان کے ابو نے تنگ آ کر اُن کو پکڑ لیا اور سمجھانے کے انداز میں کہا۔۔۔دیکھو بیٹا۔۔۔تمہاری شرارتیں اب عروج پر پہنچ گئی ہیں۔اب تو ہم تمہاری شرارتوں کا حساب بھی نہیں رکھ سکتے۔مجھے اب ایک ترکیب سوجھی ہے۔اور وہ یہ کہ اب میں ایسا کرتا ہوں کہ گھر کے صحن میں جو درخت ہے، اس کو تمہاری شرارتوں کا گواہ بناتے ہیں اور کریں گے یہ کہ تم جب بھی کوئی ایسی شرارت کرو گے جس سے دوسروں کو تکلیف ہو تو تمہاری ہر شرارت پر ہم درخت کے تنے پر ایک کیل ٹھونک دیں گے تاکہ تم کو اندازہ ہوتا رہے کہ تمہاری کس قدر شرارتیں دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث ہیں۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ہم دونوں نے یہی کیا کہ ان کی ہر شرارت پر درخت کے تنے پر ایک کیل ٹھونک دیتے۔تاکہ وہ کیلوں کی تعداد سے اپنی شرارتوں کا حساب لگا سکیں۔اور شاید ان کو اپنی شرارتوں کی تعداد کا اندازہ ہو جائے۔مگر یہ حربہ بھی کام نہ آیا۔ان کو اس کی کوئی پروا نہ تھی کہ ان کی شرارتوں کی وجہ سے درخت کا پورے کا پورا تنا کیلوں سے بھر گیا ہے۔ہم دونوں نے بارہا ان کو یہ احساس دلایا کہ اب ان کو اپنی شرارتوں کی تعداد نظر آنی چاہیے مگر عرفان کو اپنی شرارتیں نہ روکنی تھیں، نہ رکیں۔۔ان کو اپنی شرارتیں بالکل نظر نہ آئیں ایک دن ہم نے ان سے یقینی لہجے میں بات کی کہ اب کچھ نہ کچھ تو کر کے ہی چھوڑیں گے جب درخت کا تنا کیلوں سے بھر گیا تو ہم دونوں ان کو ایک دن پھر گھیر گھار کر بیٹھ گئے، اور بے حد پیار سے ان سے کہا۔۔۔دیکھو بیٹا۔۔۔اس درخت کو غور سے دیکھو۔۔۔یہ تو سینکڑوں کیلوں سے لد گیا ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم نے اس قدر شرارتیں کی ہیں کہ ان کا نہ حد ہے نہ حساب۔تمہاری شرارتیں ہیں کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔۔چلو اب ایک اور بات کرتے ہیں۔ایسا کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طریقے سے کیلوں کو

نکال دیں۔ مگر اس بار طریقہ الٹا ہوگا وہ یہ کہ تم جب جب شرارت نہیں کروگے اور اس کے بجائے کوئی اچھا کام کروگے تو اُس اچھے کام کی وجہ سے ہم درخت سے ایک کیل نکال لایا کریں گے۔ ۔۔بولو۔۔۔تمہیں منظور ہے۔۔۔''

انہوں نے یہ تونہیں کہا کہ ہاں منظور ہے ایک معجزہ ہوگیا۔ہم نے دیکھا کہ ان کی شرارتیں کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگئیں۔اور انہوں نے اپنا رخ اچھے کاموں کی طرف موڑ لیا۔ہم دونوں بھی حسبِ وعدہ ان کے ہر اچھے کام کے بعد درخت سے ایک کیل نکال دیتے۔اور پھر خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ ان کی شرارتیں کچھ اس طرح بند ہوئیں جیسے کبھی ان کا وجود تھا ہی نہیں۔۔اور اس طرح ان کے اچھے کاموں کی بدولت درخت کی تمام کیلیں ایک کے بعد ایک نکال دی گئیں۔جس دن درخت کی آخری کیل نکالی وہ دن ہم دونوں کی خوشیوں کی معراج کا دن تھا۔ہم دونوں بے حد خوش تھے اور اسی خوشی کے دوران ہم دونوں نے عرفان کو بلایا۔۔ان کو شاباش دی۔ پیار کیا اور ان کی کمر تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔۔''شاباش۔۔۔بیٹے شاباش۔ زندہ باد۔۔تم نے ہمارا دل خوش کر دیا۔تم واقعی اب بہت اچھے بیٹے بن گئے ہو۔شرارتیں تو تمہارے پاس اب نام کو بھی نہیں ہیں۔۔دیکھو اب درخت میں ایک بھی کیل نہیں ہے۔۔تم تو درحقیقت ایک انتہائی اچھے بیٹے بن گئے ہو۔۔۔''

انہوں نے بے حد سنجیدہ ہوکر میری اور اپنے ابو کی یہ بات سنی اور اس سے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ جو بات انہوں نے کہی وہ آج تک ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے۔انہوں نے رُندھی رُندھی آواز میں کہا۔۔''آپ دونوں ٹھیک کہتے ہیں۔۔بے شک میں نے شرارتیں بند کر دی ہیں۔۔پہلے آپ دونوں میری ہر شرارت پر درخت پر ایک ایک کیل ٹھونک دیا کرتے تھے۔۔اب چونکہ میں نے شرارتوں سے توبہ کرلی ہے تو آپ نے رفتہ رفتہ میری ہر اچھی بات پر ان تمام کیلوں کو ایک ایک کر کے درخت کے تنے سے نکال دیا ہے۔اب درخت میں ایک کیل بھی باقی نہیں ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے شرارتیں کرنا اب واقعی ختم کر دی ہیں۔۔۔''

ان کے یہاں تک پہنچتے پہنچتے میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے انکو بیچ میں ہی ٹوک دیا اور کہا۔۔۔ ارے بیٹا۔۔ اصل بات تو بتاؤ کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ خواہ مخواہ کی لن ترانی کار ہے ہو۔۔۔"

عرفان اب قدرے آب دیدہ ہو گئے۔ اور جو بات انہوں نے کہی اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ آج

تک ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے۔ انہوں نے کہا۔۔۔ بے شک میری شرارتوں کی تمام کیلیں درخت سے نکل چکی ہیں۔۔۔۔ وہاں اب کیل بھی باقی نہیں ہے۔ مگر ذرا غور سے درخت کے تنے کو دیکھئے تو سہی۔۔۔ اس پر کیلوں کے نشان ابھی تک موجود ہیں۔۔۔۔"

کہانی

فرزانہ اعجاز۔ شکاگو (امریکہ)

ابو کا طوطا

'لپ چھپ۔لب چھپ۔۔۔ ہمیشہ کی طرح وہ دوڑتی بھاگتی ہوئی اپنے ابو کے گھر گئی اور زوردار آواز کے ساتھ داخلی دروازہ کھولتی ہوئی امی۔ابو کو پکارتی گھر میں گھسی ہی تھی کہ داہنی طرف کے دالان سے ایک آواز آنے لگی۔۔۔ یہ کون آیا۔۔۔ یہ کون آیا بے اختیار وہ اُدھر دیکھنے لگی اور سوچنے لگی کہ یہ کس کی مجال ہے کہ وہ اپنے ابو کے گھر یعنی اس کے 'میکے' میں اس سے پوچھے کہ یہ کون آیا؟ ارے کون کون؟ گھر کی مالکن آئی ہے،،،، اسکا جی چاہا کہ وہ پوچھنے والے سے خود پوچھے کہ بھائی تم کون ہو؟ مگر آواز انسانوں والی ہوتی تو وہ ضرور پوچھتی وہ تو خلاف توقع ایک زنگ آلود۔لوہے کے پنجرے میں ایک ہرا۔ہرا، من بھرا بلکہ، غصہ بھرا، طوطا تھا اور غصے بھری آنکھوں سے سخت ناگواری سے اسے گھور رہا اور پر پھڑ پھڑا رہا تھا وہ مسکرائی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ ضرور اس کے ابو نے اپنے دلارے پوتے کی محبت میں یہ طوطا پالا ہوگا۔ وہ حیرانی اور دلچسپی سے طوطے صاحب کو دیکھنے لگی۔ جتنی دیر وہ گھر والوں میں گھری، انکی محبتیں سمیٹتی رہیں اتنی دیر طوطے میاں اسے اجنبی اور غصیلی نظروں سے گھورتے رہے، یہاں تک کہ خلاف توقع اس کے ابو نے اپنے ہاتھوں سے طوطے صاحب کو 'کریک جیک' بسکٹ کھلانا چاہا تو بڑے ناز و ادا سے طوطے صاحب نے منھ پھیر لیا۔ ابو مسکرا مسکرا کر بسکٹ کھلانے کی کوشش کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔۔۔ ارے بھئی خفا مت ہو۔۔۔ ہماری پیاری بیٹی ہے یہ۔ یعنی طوطے کا یہ مرتبہ کہ ابو ان کی مرضی کے بغیر اپنے کسی بچے کو بھی گلے نہیں لگا سکتے

ایک تو اس کے گھر میں طوطا، بلی یا کوئی دوسرا جانور کبھی پالا نہیں گیا، بس ایک بار ایک بلی کا بچہ خود بخود پل گیا تھا۔ اور اب یہ طوطے صاحب۔ جو ایک ایسے خستہ حال پنجرے میں قید تھے کہ

جس کا تالا تھا ہی نہیں، زمین ہی زمین تھی، بس ایک کٹوری میں پانی اور دوسری کٹوری میں کھانے کا ذرا سا سامان سامنے رکھے بیٹھے تھے۔ اس گھر میں کبھی کوئی شور شغف ہوتا ہی نہ تھا، گھر میں لوگ ایسی دھیمی آواز میں بولتے اتنے آہستہ چلتے کہ خاموشی کا حصار برقرار رہتا، اسے یاد آیا کہ اسی خاموشی کے حصار کو توڑنے کے لیے ایک بار اس نے دادی سے ضد کر کے 'چھن چھن' بجتی چاندی کی پائل اپنے لیے خریدوائی تھی ابو کے آفس جانے کے بعد وہ پائل پہن کر سارے گھر میں گھوما کرتی تھی۔۔۔اب جب کوئی دروازے پر اطلاعی گھنٹی بجاتا یا کھٹکھٹاتا تو یہ طوطے میاں ضرور پوچھتے۔یہ کون آیا۔۔۔یہ کون آیا؟۔۔اور وہ تو آئی بھی آندھی طوفان کی طرح تھی ہلڑ مچاتی، دوڑتی بھاگتی جیسے کسی قید خانے سے چھوٹ کر آئی ہو دراصل وہ ایسی ہی تھی اور پھر ہر سال وہ جو کئی کئی مہینے اپنے لوگوں سے دور رہی تھی تو چاہتی تھی کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرے اور دوڑ کر امی ابو سے لپٹ جائے اور ان کی محبت کی وہ تمام کی تمام گرمی اپنے اندر جذب کر لے جس کو وہ مہینوں اپنے اطراف ڈھونڈھا کرتی اور امی ابو کی جانی پہچانی خوشبو سونگھنے کو ترسا کرتی تھی۔۔اب اس کا پرس کہیں پڑا تھا، چپل کہیں اور وہ آرام سے آرام کرسی پر پیر چڑھائے بیٹھی بس برابر بولے جا رہی تھی، اور پریشر ککر کی طرح اپنے اندر بھرے تمام احساسات اور خیالات کی گیس ایک طویل سیٹی میں نکال دینا چاہتی تھی، ابو امی سامنے بیٹھے اس کی لن ترانی سن رہے تھے سنو ذرا وہ رکی تو ابو نے امی سے مسکرا کر پوچھا۔۔کیا یہ وہی لڑکی ہے جو صرف کام کرنا اور مسکرانا جانتی تھی؟۔۔۔وہ چونکی اور اس کا دھیان پھڑ پھڑاتے پرندے کی پھڑ پھڑاہٹ کی طرف گیا اور وہ گردن گھما کر زنگ لگے پنجرے کی طرف دیکھنے لگی۔۔ابو جو مسکرا مسکرا کر اس کی تقریر سن رہے تھے موقع ملتے ہی گویا ہوئے۔یہ مٹھو میاں ہیں۔آپ کے بھتیجے کی خواہش سے لائے گئے ہیں اور اب خوشی خوشی قید ہیں کسی سے بات نہیں کرتے بس مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میرے ہاتھ سے کریک جیک بسکٹ کھاتے ہیں۔گھر میں خاموشی پسند فرماتے ہیں اور بے وقت کسی کی بے جا مداخلت برداشت نہیں کرتے شام کو ذرا دیر پنجرے سے باہر نکل کر چہل قدمی کرتے اور پھر مقید ہو جاتے ہیں، ہم ان کو نظر انداز کر کے ان کے

سامنے کسی سے بات بھی نہیں کر سکتے آپ سے بھی نہیں آپ کی والدہ سے بھی نہیں۔۔ابو مسکرا رہے تھے اور وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔اسے علم تھا کہ ابو کسی بھی جانور کو قید کرنا پسند نہیں کرتے گھر کے تمام لوگ ابو کے نظام الاوقات کے مطابق خود کو ڈھال چکے تھے۔ابو کو پڑھنے لکھنے اور نماز کو آنے جانے اور زیر لب وظیفہ پڑھنے ہی سے کب فرصت تھی جو وہ آزاد رہنے والوں کو قیدی بنانے میں تضیع الاوقات کرتے جب ابو گھر میں ہوتے تو گھر پر پُر سکون سناٹا چھایا رہتا۔تا کہ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی ابو محترم طوطے صاحب کی ناز برداریاں کریں اور ابو کے ہاتھ سے کریک جیک بسکٹ کھائیں اور اگر ابو کسی اور طرف متوجہ ہوں تو طوطے صاحب اپنے پنجرے میں الٹے لٹکے نظر آئیں۔

بے زبان جانور یا زبان دراز انسان،۔۔۔محبت کی نظر اور انسیت کی للک سے متاثر ضرور ہوتا ہے، طوطے صاحب پالے تو ضرور ابو کے پوتے کے لیے گئے تھے مگر بچہ تو پھر بچہ وہ بھی دادا میاں کا دلارا۔اس نے جو چند دنوں میں یہاں یہ احوال دیکھے کہ دادا میاں پوتے سے زیادہ طوطے سے مخاطب ہو رہے ہیں تو پوتے میاں طوطے میاں سے ناراض ہو گئے۔دادا میاں نے پوتے میاں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ طوطا ان کو محض اس لیے عزیز ہے کہ پوتے میاں کا دل بہلاتا ہے اور لیلیٰ کے کتے کا مقام رکھتا ہے۔مگر ننھا بچہ عشق و محبت کے ہر فلسفے سے نابلد تھا، سو وہ طوطے صاحب سے لاتعلق ہو گیا، اب آئی گئی دادا میاں یعنی ابو کے سر ہو گی چونکہ ابو ہی نے انہیں اسیر کیا تھا سو طوطے صاحب کے قیام و طعام کا انتظام ابو کے سر آ پڑا گھر میں ویسے ہی گنتی کے لوگ رہ گئے تھے جو منہ پر ٹیپ چپکائے اپنے اپنے کاموں میں مگن رہتے تھے کسی کو طوطے سے دلچسپی تھی نہ اس کے قیام و طعام سے۔اب ابو ہی طوطے کے واحد کفیل تھے اور ابو کے آنے جانے کا حساب رکھنے والا طوطا۔اور ابو کے قیمتی وقت میں سے اپنے لیے لمحات چرانے والا طوطا۔۔۔عصر کی نماز کے بعد ابو اکثر پنجرے کا زنگ آلود اوپری جال اٹھا دیتے اور طوطے میاں بڑی شاہانہ چال سے ٹھنکتے ہوئے سارے آنگن میں ٹہلا کرتے جیسے فلم مغل اعظم میں بادشاہ اکبر اعظم ٹہلا کرتے تھے۔ابو سامنے کرسی یا تخت پر بیٹھے رہتے۔

اس نے ابو سے کہا بھی کہ یہ عجیب طوطا ہے ٹہلا کرتا ہے، اڑتا کیوں نہیں ابو ہنسے اور کہا۔۔۔
محبت اور خلوص کی گرفت ہی ایسی ہوتی ہے کہ آزاد ہوتے ہوئے بھی آزاد ہونے کو جی نہیں چاہا اور پر ہوتے ہوئے بھی پرواز کر جانے کو دل نہیں مانتا۔۔۔ اور ذرا دیر بعد ابو نے طوطے میاں سے کہا ۔۔ چلئے اب پنجرے میں بند ہو جایئے۔ آج بہت چہل قدمی ہوگئی اور طوطے میاں پنجرے کی جانب روانہ ہو گئے۔

امی اچانک افق کے اس پار چلی گئیں، ابو زندگی سے بیگانے ہو گئے اب ابو تھے اور یاد ماضی یا نماز وظائف ہم سب بھی دہل کر رہ گئے کون یقین کر سکتا تھا کہ یہی وہ گھر تھا جو جنت نظیر تھا اور جس پر امی کی حکمرانی تھی ابو کی بھرپور حمایت سے وہ نظام خانہ داری چلا رہی تھیں وہ گھر جو ایک پرسکون گوشہ عافیت تھا جس کے مکینوں کا خمیر خلوص اور مروت سے گندھا تھا، اچانک اپنی تصویر بدل ڈالے گا، امی کے بغیر خالی خالی لگے گا ابو تیسری منزل پر بنی اپنی لائبریری تک محدود ہو گئے اذان کی آواز آئی تو دھیرے دھیرے زینہ اترتے، اتنی دیر میں طوطے میاں چیخنا چلانا شروع کر دیتے پھر ابو کی کمزور سی آواز آتی۔۔۔ آرہا ہوں بھئی ابو پر نظر پڑتے ہی طوطے میاں خاموش ہو جاتے اور گردن جھکا کر بیٹھ جاتے، جیسے اگر ابو نماز کو نہ گئے تو تمام عذاب ثواب محترم طوطے صاحب کی گردن پر آجائے گا۔

ابو واپس آتے جیب سے کریک جیک بسکٹ کا پیکٹ لیے اور طوطے میاں کو کھلاتے جاتے اور انہیں سمجھاتے جاتے کہ بھئی چیخامت کرو اب میں اوپر ہی نماز پڑھ لیتا ہوں بار بار زینہ نہیں اتر چڑھ سکتا ہاں تمہیں بسکٹ تو کوئی بھی کھلا سکتا ہے یہ سنتے ہی طوطے میاں اپنی چونچ میں دبا بسکٹ تھوک دیتے اور ابو سے خفا ہو کر بے تالے کے پنجرے میں الٹے لٹک جاتے۔ اللہ اللہ، ایسی ناز برداریاں، اسے یاد تھا کہ اسے خود ریڈیو پر گانے سننا کتنا پسند تھا، پسندیدہ گانے کی آواز ذرا سی بھی تیز کرتی تو امی کہتیں۔۔ اوپر کمرے میں تمہارے باپ موجود ہیں، آواز سنیں گے تو خفا ہوں گے، بند کر دو یا دھیرا کرو۔ اتنے دھیرے کہ کان ریڈیو میں لگا دیتی تب بھی اسے سنائی نہ دیتا۔

ایک روز ابو کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی، جس نے سنا، دوڑا چلا آیا اچانک اتنا مجمع دیکھ کر اور ابو کو غیر موجود پا کر طوطے میاں ہراساں ہوگئے اور بے تحاشا چیخنے لگے جیسے ابو کو اپنی مدد کے لیے پکار رہے ہوں، کھانے کی کٹوری الٹ دی، پانی کی پیالی لڑھکا دی اور پنجرے کی تیلیاں چبانے لگے۔ اذان کے بعد اذانیں ہوتی رہیں ابو اوپر سے اتر کر نہیں آئے اور جب آئے تو دوسروں کے کاندھوں پر۔۔۔ طوطے میاں بلبلا بلبلا کر چیختے رہے اور ابو کی روح قفس عنصری کو توڑ کر پرواز کر گئی ایک قیامت تھی جو برپا تھی، اوپر سے طوطے میاں کا بین۔۔۔ ابو تو چلے گئے، بہت دور کہ نہ وہاں طوطے میاں کی آواز پہنچ سکتی تھی نہ ہم سب کی آہ و بکا۔ لیکن وہ دن اور اس کے بعد طوطے میاں نے نہ کریک جیک کھایا اور نہ ایک لفظ منھ سے بولے۔ ایسا لگا جیسے یہ ناسمجھ جانور سب کچھ سمجھ رہا ہو اور یہ بھی کہ اس کا کیا گم ہوگیا ہے اور ہم سب کی تو جیسے ریڑھ کی ہڈی ہی ٹوٹ گئی ہماری دنیا اندھیری ہوگئی وہ روشنی ہی چلی گئی جس کی ضیا سے ہم سب چمکا کرتے تھے ہفتوں گزر گئے لیکن کسی نے بھی طوطے میاں کی آواز سنی اور نہ ان کے ناز نخرے دیکھے۔ اب جو کوئی ان کو کچھ بھی دیتا کھا لیتے اور پنجرے میں الٹے لٹکے رہتے ہم میں سے کوئی ان کے پاس جاتا تو اجنبی نظروں سے دیکھتے اور منھ موڑ لیتے۔

ایک صبح جب وہ سو کر اٹھی تو سوچا کہ وہ خود جا کر طوطے میاں کو کھانا دے آئے، مضمحل قدموں سے پنجرے کے پاس گئی لیکن پنجرہ تو الٹا پڑا تھا اور خالی بھی۔ آنگن خالی تھا مگر دالان کے ایک کونے میں طوطے میاں کے بچے کھچے پر پڑے تھے، اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے ہوا یہ کہ بے دھیانی میں کسی نے بیرونی دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور موقع پا کر ایک بلی اندر آگئی طوطے میاں کا پنجرہ تو ویسے ہی بے تالے کا تھا اور اب ابو بھی نہیں تھے جو خیال رکھتے کہ باہر کا دروازہ بند رہے اور دھیان رکھا جائے کہ رات کو کوئی بلی گھر کے اندر نہ رہ جائے۔

وہ زار و قطار رونے لگی اسے لگا کہ جیسے وہ بھی طوطے میاں کی طرح 'زندگی کے زنگ آلود پنجرے میں غیر محفوظ ہے، ایسا پنجرہ کہ جس کا تالا بھی نہیں اور اسے ناگہانی اور مصیبت سے بچانے والے ابو بھی نہیں۔۔۔

ہاں۔۔۔ سچ ہی تو ہے۔۔۔ زندگی خود ایک زنگ آلود کمزور سا پنجرہ ہی تو ہے۔

افسانہ

شمع سیّد

انہونی

کہتے ہیں انہونی ہو کر ہی رہتی ہے۔ اب خُدا جانے ہاسپٹل کے اس کمرے میں جو لڑکیاں پریشانی کے عالم میں رات سے بیٹھے بیٹھے تھکنے لگی تھیں یہ انہونی بات تھی یا ان کے سامنے بیڈ پر دراز عورت جس کے بارے میں یہ کہنا مشکل تھا کہ اُس کی کتنی سانسیں باقی تھیں۔ گزشتہ چھ ماہ کے طویل عرصے سے ریشم اور موت کے درمیان جنگ جاری تھی ابتدائی کچھ عرصہ تو ریشم نے موت کو شکست دینے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی کوشش کے نتیجے میں وہ کبھی ہاسپٹل تو کبھی گھر کے درمیان اُلجھی رہی اب شائد اُسے یقین ہو چلا تھا کہ ہار ہی اُس کا نصیب ہے یا پھر اُس کے ڈھانچے سے وجود میں زندگی کی حرارت دم توڑنے کو پھڑ پھڑا رہی تھی۔

بائیس سال پہلے یوں ہی اچانک وہ عذیر سے ٹکرا گئی تھی۔ اُس کا بھائی واپڈا آفس میں ملازم تھا ایک روز کسی کام سے وہ آفس آئی تو وہاں بھائی موجود نہ تھا۔ عذیر نے آگے بڑھ کر اُسے بتایا کہ وہ اُس کے بھائی کا دوست ہے کچھ ضروری کام ہے تو وہ اُسے بتا سکتی ہے۔ ریشم تذبذب کا شکار ہوئی کہ اُسے بتانا چاہیے یا نہیں۔۔۔ معاملہ ایسا تھا کہ وہ بتائے بغیر رہ بھی نہیں پائی۔ اُس کی ماں اور باپ میں علیحدگی ہو چکی تھی۔ ریشم اور نبیل دو ہی بہن بھائی تھے۔ ماں کو سانس کی شدید تکلیف تھی۔ آج بھی طبیعت بگڑنے پر وہ ہاسپٹل تو لے آئی تھی مگر اُس کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ وہ ڈاکٹر کے دیئے گئے نسخے کے مطابق دوا خرید سکے یہی وجہ تھی کہ اُس نے بھائی کے گھر لوٹنے کا بھی انتظار نہیں کیا اور خود چلی آئی۔ اپنی ماں کے معاملے میں دونوں بہن بھائی حد درجہ حساس تھے۔ وہ ہی اُن کا کُل اثاثہ تھی۔ عذیر نبیل کے حالات اور جذبات پہلے سے جانتا تھا۔ اُس کا دوست تھا مگر عجیب

بات تھی کہ اپنی چار سالہ دوستی میں آج تک انہوں نے ایک دوسرے کی ذاتی زندگی کے حوالے سے بہت کم بات کی تھی خاص طور پر اپنے خاندان کے دیگر افراد کے بارے میں۔ عذیر نبیل سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں بہت زیادہ بے تکلف نہ تھے۔ آج ریشم سے یوں اچانک ملاقات اور اس کی پریشانی اور بوکھلاہٹ کو دیکھتے ہوئے وہ فوراً اُس کی مدد پر آمادہ ہوگیا۔

اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ نبیل جانے کب آئے میں ماں جی کو دیکھ لیتا ہوں آیئے! اللہ پاک انہیں صحت عطا کرے آپ پریشان نہ ہوں عذیر کی تسلی پر جانے کیوں ریشم کی آنکھیں بھر آئیں عذیر کا دل اُس کے دُکھ پر تڑپا۔۔ بس آپ چلیئے۔۔۔ اور بالکل بھی پریشان مت ہوں۔ میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں۔ اُسے مزید کچھ کہنے کا موقعہ دیئے بغیر عذیر نے اپنی جیب کی چابی اُٹھا کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ریشم نے اپنے وجود کو گھسیٹا اور حوصلے کو اکٹھا کرتے ہوئے اُس کی تقلید میں باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

اس طرح کچھ ہی عرصے میں ان کے درمیان اجنبیت کی دیوار گرنے لگی ماں جی گھنٹوں عذیر کے ساتھ اپنے بچوں کے مستقبل کی باتیں کیا کرتیں خاص طور پر اپنی بیٹی کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھیں اُس کی ضد تھی کہ وہ شادی نہیں کرے گی اور اگر کرے گی تو اُس انسان سے جو گھر داماد بن کر رہے کیونکہ وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ اس معاملے پر عذیر نے ریشم کو سمجھانے کی کوشش کی وہ اپنی ماں کے دکھ کو نہ بڑھائے اور شادی کر کے اپنے گھر چلی جائے۔ ماں جی کا کہنا ٹھیک ہے کہ نبیل کی شادی کرنے کے بعد بہو آجائے گی اُنہیں سنبھالنے اور اُن کا خیال رکھنے کے لیے۔ مگر ریشم کسی بھی صورت میں اُن سے الگ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ عذیر کی کوشش بھی رائیگاں ہی گئیں وقت کچھ اور آگے سرکا تو عذیر نے ریشم میں دلچسپی لینا شروع کر دی گاہے گاہے اُس کی آمد ورفت کا سلسلہ چل نکلا۔ اور پھر جیسے انہونی کی چاپ سُنائی دینے لگی۔

اپنے دل کی کیفیت کو لے کر وہ انتہائی مشکل میں تھا کہ کس سے اپنے جذبات کا اظہار کرے کون ہے جو اس کی بات کو سمجھے گا کون قبول کرے گا۔ اور وہ اپنی لڑائی کیسے لڑے گا۔ اُس کے

سامنے بے شمار محاذ تھے اور وہ اکیلا سب سے لڑنے کی تیاری کرنے لگا۔ ان حالات میں امید کی ایک کرن تھی اور وہ تھیں ماں جی۔۔۔ ماں جی کے بارے میں سوچتے ہوئے اُسے ایک مقام پر آ کر اپنی خود غرضی کا احساس بھی ہوا۔ کہ کہیں وہ ایک مجبور ماں کے جذبات کا فائدہ اٹھانے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔۔۔؟ کافی دنوں تک وہ اس احساس کے زیر اثر رہا۔ رفتہ رفتہ ادراک کے در کھلتے چلے گئے اور اُسے کامل یقین ہونے لگا کہ وہ ریشم سے محبت کرتا ہے اور بے پناہ محبت کرتا ہے۔

وہ شادی شدہ مرد تھا اور دو بیٹیوں کا باپ تھا۔ قد کاٹھ میں اللہ پاک نے ایسے درازی عطا کی تھی۔ خدوخال بھی مناسب تھے۔ ڈیل ڈول سے نوجوانوں کی طرح پُرکشش تھا۔ مگر رنگ کچھ گہرا تھا جب کہ ریشم بے حد خوبصورت گوری چٹی مناسب قد کی لڑکی تھی۔ سب سے بڑھ کر اُس کی دلکش کٹوراسی آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں عذیر کی کمزوری تھیں چھ سال پہلے زبردستی اُسے چچا زاد سے بیاہ دیا گیا تھا ماں کی وہ ہی روایتی منت سماجت اور واسطے نسیم بی بی اُسے قطعی ناپسند تھیں۔ چونکہ وہ کافی حد تک نرم دل اور فطرتاً صلح جُو تھا سو نباہ کر رہا تھا۔ ان چھ سالوں میں وہ بہت اچھا نہیں تو بہت بُرا شوہر بھی ثابت نہیں ہُوا تھا۔ نسیم کا کوئی بھائی نہیں تھا وہ چھ بہنیں تھیں خاندان بھر میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ تمام بہنیں بیٹیاں ہی پیدا کرتی ہیں اپنی ماں کی طرح جانے خُدا کی کیا حکمت تھی کہ خلقِ خدا کے منہ سے نکلی ہوئی یہ بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔

ریشم کی صُورت عذیر کے گُھٹن زدہ دل پر اچانک اور غیر متوقع طور پر تازہ ہوا نے دستک دی۔ دل تو اپنے حواس کھونے لگا تھا۔ اور دماغ اُس پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی عقل یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ اُس کا اور ریشم کا سنجوگ ہو سکتا ہے۔ جتنی شدت سے دماغ اُسے پسپا کرنے پر تلا تھا دل اُس سے دُگنی شدت کے ساتھ مچل رہا تھا۔ آخر جیت دل کی ہوئی اور اُس نے ماں جی کے ساتھ اپنے جذبات بانٹنے کا فیصلہ کیا۔ ریشم اُس کی ان تمام تر کیفیات سے قطعی انجان تھی۔

ماں جی میں ریشم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔۔ عذیر نے اپنی بات ایسے جلدی جلدی ماں جی کے سامنے رکھی کہ مُبادا ٹھہر ٹھہر کر بولنے سے اس کے حرف دم نہ توڑ

دیں۔ وہ اپنی جرأت پر حیران بھی تھا اور کسی قدر مطمئن بھی ریشم کی ماں نے بے یقینی سے عذیر کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا۔ اور کچھ دیر سوچنے کے بعد ریشم کی شرط کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ وہ کسی طور ماں کو چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہ تھی۔ اور گھر داماد بھلا کون رہتا۔ لوہا گرم دیکھ کر عذیر نے دوبارہ چوٹ کی ماں جی آپ فکر مند نہ ہوں میں گھر داماد رہنے پر تیار ہوں جب تک ریشم اپنے نئے رشتے اور زندگی میں آنے والی نئی ذمہ داریوں کو دل سے قبول نہ کرے گی میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ آپ بے فکر رہیں، بہت جلد وہ حقیقت کو تسلیم کرلے گی پھر نبیل کی شادی کے بعد جب وہ آپ کی طرف سے مطمئن ہو جائے گی تو یقیناً اپنی گرہستی بسانے میں اُسے دِقت نہیں ہوگی۔

'ہوں'۔۔ماں جی نے طویل سانس لیتے ہوئے اپنے دل کے بوجھ میں کچھ کمی محسوس کی اور اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے گویا رضامندی دے دی۔ نبیل نے بھی کچھ زیادہ ردِعمل نہیں دکھایا۔ وہ صرف اپنی ماں کو تمام فکروں سے آزاد خوش وخُرم دیکھنا چاہتا تھا۔ آگے کے مراحل عذیر کے لئے زیادہ پریشان کُن نہ تھے۔ اُس نے اپنے چند پرانے دوستوں کو راز بتایا اور اُن سے ہی براتی لانے کا کہا جس میں ماں باپ سے لے کر بہن بھائی تک شامل تھے۔ جب کہ حقیقت میں اُس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس سب بھاگ دوڑ میں اکثر اُس کا ضمیر اس بات پر ملامت بھی کرتا کہ اُسے جھوٹ نہیں بولنا چاہئے تھا وہ ریشم نبیل اور اماں جی تینوں کو دھوکا دے رہا تھا۔ مگر پھر اُسے خود کو مطمئن کرنے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔

وہ یہ سب ریشم کی محبت میں کر رہا تھا۔ اُسے یقین تھا وہ جلد ہی تمام معاملات کو سُلجھا لے گا اور پھر اپنے گھر میں اور ریشم کو سب حقیقت بتا دے گا۔ وہ اُسے اتنا چاہے گا کہ وہ اس کے بغیر رہ ہی نہیں پائے گی نکاح کے بعد اس نے اپنا پیٹرولیم کا کاروبار شروع کرلیا اور گھر والوں سے کہہ دیا کہ وہ دو سال کے لیے دوبئ جا رہا ہے۔ اپنی پہلی بیوی اور گھر والوں کو خرچہ وہ اپنے دوبئ میں رہائش پذیر دوست کے توسط سے بھیجتا رہا۔

ریشم عذیر کو پا کر بے حد خوش تھی ماں جی اور نبیل بھی مطمئن تھے وہ ایک اچھا شوہر اور داماد

ثابت ہوا تھا۔ دو سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا اس دوران وہ مزید ایک بیٹی کا باپ بن گیا تھا۔ ریشم اور اُس کی بیٹی کائنات۔ اب عذیر نے اپنی ماں اور بہن کو سچ بتانے کا فیصلہ کیا۔ سچ کیا تھا گویا ایٹم بم تھا۔ خیر وہ یہی روایتی احتجاج رُوٹھنا منانا۔ ریشم اور اُس کی ماں پر جو پہاڑ ٹوٹا سو الگ۔ ان حالات نے عذیر کو ریشم کے اور قریب کر دیا تھا وہ دن رات اُس سے معافی بھی مانگتا اور اُسے اپنی بے تحاشا محبت کا یقین بھی دلاتا۔ آخر وہ بھی بے بس ہو گئی۔ وہ خود بچپن میں اپنے باپ کو کھو چکی تھی۔ اُدھر دوسری بیوی پر بھی بیٹا پیدا نہ کرنے کا الزام ثابت ہو گیا جب اُس نے تیسری بیٹی کو جنم دیا اور ریشم نے ایک خوبصورت بیٹے کو، اب دونوں بیویاں آمنے سامنے الگ الگ گھروں میں رہنے لگیں دونوں کے حصے میں عذیر کے مختلف کام آ گئے۔ ماہ وسال گزرتے رہے بیتے وقت نے ریشم کی جھولی میں مزید دو بیٹے ڈال دیئے۔

انہونی نے ایک بار پھر کروٹ لی۔ اُس کا ہدف اس بار ریشم کی ذات ہی تھی۔ اُس کا سب سے چھوٹا بیٹا باسط جو تین سال کا ہو چلا تھا مگر اب تک نہ چلتا تھا نہ بولتا تھا مختلف ڈاکٹرز کے پاس لیجانے کے باوجود کوئی حوصلہ افزا نتیجہ نہ نکلا تھا۔ ریشم رفتہ رفتہ کملانے لگی۔ اُس کا حُسن ماند پڑنے لگا۔ وہ دن رات بیٹے کے دُکھ میں گھلتی جا رہی تھی۔ نہ اُس کا دکھ کسی مقام پر تھما نہ ہی وقت کی رفتار رُکی۔ باسط اب آٹھ سال کا بچہ تھا اُس کا نچلا دھڑ اب بھی مفلوج تھا۔ اور خود بھی ڈیڑھ سال کی عمر سے آگے نہ بڑھ پایا تھا۔ بظاہر وہ ایک بے حد خوبصورت اور چمکتے چہرے والا معصوم سا بچہ تھا۔ عذیر جب بھی گھر آتا ریشم باسط میں الجھی رہتی۔ اب دونوں میاں بیوی کے درمیان ایک دیوار آن کھڑی ہوئی تھی جو ان کی اپنی اولاد تھی۔

ریشم کی اصل طاقت عذیر کی محبت تھی وہ ہمیشہ سے اُس کی موجودگی میں خود کو محفوظ تصور کرتی تھی۔ اب اُسے اپنا اکیلا پن بے چین رکھتا وہ اندر سے کھوکھلی ہوتی جا رہی تھی کائنات اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی وہ ماں کو سنبھالنے کی پوری کوشش کرتی حتی المقدور باپ کو بھی سمجھاتی مگر وقت ہتھیلی میں بند ریت کی طرح پھسلتا چلا جا رہا تھا۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ ریشم کو معدے کا السر

ہے۔ساتھ ہی شوگر اور بلڈ پریشر کا مرض ہے۔ دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی ڈھلتی جا رہی تھی۔ چند ہی مہینوں میں ڈھانچے کی طرح ہو گئی تھی۔ بیماریوں سے تو شاید لڑ لیتی مگر اجنبیت کی جو دیوار عذیر اور اُس کے درمیان حائل تھی اُسے گرانا اب اُس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ اکیلے پن کا یہ عفریت اُس کے لہو کا ایک ایک قطرہ چاٹ رہا تھا اُس کی سوتن کے بھاگ جاگ گئے تھے وہ تین بیٹیوں کی ماں ہونے کے باوجود شان اور تمکنت سے اپنے عہدے پر براجمان تھی اور وہ تین بیٹوں کو جنم دے کر بھی اپنا وجود اپنے ہونے کا یقین کھو رہی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اُس کی سوتن کی دخل اندازی اُس کی گرہستی اور اُس کی اولاد کے معاملات میں بڑھتی جا رہی تھی۔ بالآخر اُسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروا دیا گیا۔ کائنات اور سعدیہ (اس کی سوتیلی بیٹی) اُس کی تیمارداری پر مامور تھیں۔ اور یہ بھی انہونی ہی تھی کہ بچپن سے جوانی تک کائنات اور سعدیہ آپس میں اُلجھتی آئی تھیں اور اب دونوں بہنیں تمام تلخیوں کو بھلا کر بہت فکر مند تھیں اور دن رات ریشم کی سلامتی کی دُعائیں مانگ رہی تھیں اُس کے سرہانے کھڑے ہو کر قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر اُس پر پھونک رہی تھیں وہ سُوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی اس کی بیماری شدید سے شدید ہوتی جا رہی تھی۔ اور اب وہ لہو اُگلنے لگی تھی بار بار راتوں میں شدتِ درد سے بلبلا اُٹھتی۔ ایسے میں جب عذیر اُس کے پاس آ کر کھڑا ہوتا تو وہ اپنا آکسیجن ماسک اُتار کر کُھلی ہُوا میں سانس لینے لگتی۔ اس کا بے جان وجود حرکت کرنے لگتا۔ اور یہ سب کو عجیب لگتا۔

گزشتہ تین راتوں سے جب بھی عذیر آتا وہ ایک ہی جملہ دہراتی۔۔ عذیر مجھے آزاد کر دو نا۔ عذیر خُدا کے واسطے کہہ دو کہ میں نے تمھیں آزاد کیا۔۔۔ عذیر تمھیں تمھارے بچوں کا واسطہ تمھیں تمھاری محبت کا واسطہ مجھے آزاد کر دو۔۔ میری سانس تُم سے بندھی ہے۔ مجھے آزاد کر دو۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک ہی بات کہتی اور عذیر کمرے سے باہر نکل جاتا۔ اب ریشم آکسیجن کے بغیر سانس نہیں لے پاتی تھی۔ ڈاکٹرز نے کہہ دیا تھا کہ اُس کی سانسوں کی ڈور کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی ہے کائنات پچھلے دو تین دن سے اپنے باپ کی منت کر رہی تھی کہ وہ کسی بھی صورت میں اُس

کی ماں کو آزاد نہ کرے۔ اگر وہ یونہی زندہ ہے تو یونہی سہی۔۔۔

کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ ریشم اب بیماری سے لڑتے لڑتے تھک گئی ہے وہ کسی بھی وقت زندگی کی جنگ ہار جائے گی۔ کائنات نے بھی عذیر کو بتایا کہ رات بھر ریشم درد سے تڑپتی رہی ہے۔ ایسے میں اُس کی گھٹی گھٹی چیخیں بھی محسوس کیں اُس نے۔ عذیر نے ریشم کے نیم مُردہ ہاتھوں کو چھوا تو اُن میں ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی اُس نے آگے بڑھ کر آکسیجن ماسک اُتارا اور ریشم کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ ساتھ ہی اُس کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔ کائنات نے اپنی ماں کے چہرے پر ہلکا سا تبسم اور خوشی کی جھلک محسوس کی جو دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گئی۔ اُس نے بے یقینی سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ بیٹی کی آنکھوں میں اُبھرنے والے سوال کا جواب دینے کا حوصلہ اُس میں نہ تھا۔ وہ نظریں چُراتا تیز تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ کائنات نے گھبرا کر ماں کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر اب سکون ٹھہر گیا تھا اور جیسے گُلال گُھل گیا تھا۔ انہونی آج بے حد خوش تھی۔۔۔۔

*****

سرور عالم راز سرور۔ کیرلٹن۔ ٹیکساس (امریکہ)

سالنامہ ''الاقربا'' ۲۰۱۴ء پر ایک طائرانہ نظر

فی زمانہ جب کہ اُردو زبان پر ایک عمومی اضمحلال اور جمود کی کیفیت طاری ہے اور شعر و ادب کا معیار مائل بہ تنزل نظر آتا ہے اسلام آباد سے شائع ہونے والا ادبی و تخلیقی مجلّہ ''الاقربا'' اپنی روایتی آب و تاب قائم رکھتے ہوئے پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ سال رواں ۲۰۱۴ء کا سالنامہ حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے اور شائقین ادب کو دعوت فکر و نظر دے رہا ہے۔ تقریباً تین سو صفحات کے اس ضخیم سالنامہ میں رسالہ کی مجلس ادارت و مشاورت نے مدیر اعلیٰ سید منصور عاقل صاحب کی ماہرانہ رہنمائی اور قیادت میں شعر و ادب کا ایک قابل رشک ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ اس دور میں اتنی بڑی تعداد میں اچھے اور معتبر اصحاب قلم سے اس قدر متنوع اور دلچسپ موضوعات پر علم افروز مواد حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ زیر نظر سالنامہ کے مندرجات میں اُردو رسالوں کے جانے پہچانے روایتی عنوانات مثلاً حمد و نعت، غزل، نظم، رباعی، افسانہ تو نظر آتے ہی ہیں، ساتھ ہی عالمی ادب، اقبالیات، متفرقات اور یاد رفتگاں کے تحت گراں قدر مضامین و مقالات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ ادب کا ہر سنجیدہ قاری بیک نظر دیکھ سکتا ہے کہ رسالہ کے کم و بیش تمام حصوں پر منصور عاقل صاحب نے اپنے حسن انتخاب کی مہر ثبت کر رکھی ہے۔ ادب و شعر ہی پر کیا موقوف ہے زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس میں باوجود بہترین انسانی کوشش اور محنت کے کوئی جھول مطلق نظر ہی نہ آئے۔ الاقرباء اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے لیکن یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ نیک نیتی، دلسوزی اور بے لوث محنت و محبت سے مرتب کیا ہوا یہ شمارہ ایسا مرقع ہے جو صوری اور معنوی دونوں سطحوں پر اپنا جواب آپ کہے جانے کا مستحق ہے۔

زیرِ نظر شمارہ کا اداریہ حسبِ روایت و معمول بامقصد اور خیال آفریں ہے۔ یہ امر باعث حیرت و افسوس ہے کہ قیامِ پاکستان کے ساٹھ سال بعد بھی یہاں قومی زبان اور علاقائی زبانوں پر بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے جب کہ ہندوستان نے آزادی کے فوراً بعد ہی نہ صرف اس ضمن میں تمام بنیادی فیصلے کر لیے تھے بلکہ آنے والی دہائیوں میں ان پر کامیابی سے عمل بھی کیا تھا اور یہ سلسلہ وہاں برابر جاری ہے۔ قومی اور سرکاری زبان کا تنازعہ ایک مضحکہ خیز تنازعہ ہے۔ عقل یہ دیکھنے سے قاصر ہے کہ کسی ملک کی قومی اور سرکاری زبانیں الگ الگ کیسے ہو سکتی ہیں۔ پاکستان کے اربابِ حل و عقد کو بلند نظری اور وسیع القلبی سے کام لے کر ملک و قوم کے مفاد کے مدِّ نظر اُردو کو قومی اور سرکاری زبان حتمی طور پر مان لینا چاہیئے اور ملک کے ہر شعبہ میں اس کے عام اور حسبِ مقدور مکمل نفاذ کی فکر کرنی چاہیے۔ ساتھ ہی علاقائی زبانوں کی ترقی اور اپنے اپنے علاقوں میں استعمال کے لیے مناسب قدم اٹھانا دانشمندی کی دلیل ہے۔ اداریہ میں اس حوالے سے کئی قابلِ عمل اور ضروری تجاویز موجود ہیں۔ ضرورت ٹھنڈے دل و دماغ سے وقت کے تقاضوں کو پہچاننے اور قوم و ملک کی فلاح کے لیے محنت، خلوص اور لگن سے کام کرنے کی ہے۔

اس سالنامہ کے مندرجات مختلف ابواب میں منقسم ہیں۔ ان مندرجات سے رسالہ کی وقعت اور ادارہ کی محنت ظاہر ہے۔ اُردو رسالوں کے پہلے چند صفحات عام طور سے حمدِ الٰہی اور نعتِ رسولؐ کے لیے مختص ہوتے ہیں۔ الاقربا سالنامہ میں اس روایت سے گریز کیا گیا ہے جس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادرہ کو اس بار کافی تعداد میں حمدیہ اور نعتیہ کلام بھیجا گیا ہے چنانچہ رسالہ میں چودہ (۱۴) حمدیں اور نعتیں شامل کی گئی ہیں۔ حمد اور نعت لکھنا کافی مشکل کام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و ثنا کے لیے الفاظ اور خیالات کا صحیح انتخاب اور ان کی مناسب پیشکش شعر گوئی میں کمال چاہتے ہیں۔ رسالہ کی ساری حمدیہ اور نعتیہ تخلیقات اچھی ہیں۔ اگر ان میں سے چند آئندہ شماروں کے لیے روک لی جاتیں تو کوئی نقصان نہیں تھا لیکن بہر حال یہ ادارہ کا اختیار اور فیصلہ ہے جس سے اتفاق ضروری ہے۔

اس شمارے میں 'عالمی ادب' کے تحت دو اعلیٰ پایہ کے مضامین نظر آتے ہیں یعنی اویس جعفری کا ''یونس امرے: عظیم ترک صوفی شاعر'' اور فرانسس ڈبلیو پریشٹ کا مضمون ''رالف رَسل کا مطالعہء غزل'' جس کے انگریزی سے اُردو میں کامیاب ترجمہ کا سہرا محمد طارق علی کے سر ہے۔ ولی عالم شاہینؔ کے مضمون ''کینیڈا میں اُردو'' کو معلوم نہیں کیوں عالمی ادب کے گوشوارے میں ڈال دیا گیا ہے۔ یہ مضمون کینیڈا میں اردو کی تدریجی ترقی اور پیش رفت پر ایک بیانیہ کوشش ہے اور عالمی ادب سے اس کا تعلق اگر معدوم نہیں تو مشکوک تو ضرور ہے۔ اس مضمون میں کوئی بات قابلِ ذکر نہیں ہے۔ شاکر کنڈان کا مضمون ''رائدِ سیف وقلم۔ نطشے'' جرمن فلسفی نطشے کی زندگی اور فکر پر ایک محدود اور مختصر تحریر ہے۔ یہ مضمون کافی الجھا ہوا ہے اور قاری کو مصنف کا موقف سمجھنے میں جا بجا دقت محسوس ہوتی ہے۔ ویسے بھی اُردو کے عام قاری کو نطشے یا کسی اور مغربی فلسفی کے بجائے دنیائے اسلام کے فلاسفہ کو پڑھنے اور سمجھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مغربی فلسفیوں کا مطالعہ کیا ہی نہ جائے۔ مقصود یہ ہے کہ پہلے اپنے گھر کا جائزہ لے لیا جائے تو بہتر ہے۔ نطشے کے نام سے ہی اردو کے قاری عام طور سے ناواقف ہیں اور یوں بھی اُس کو اردو میں اس سے قبل کچھ زیادہ ہی خراجِ عقیدت پیش کیا جا چکا ہے۔

اویس جعفری نے ترک صحافی شاعر یونس امرے پر بہت محنت اور محبت سے تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ ان کی تحریر علم افروز اور شگفتہ ہے اور یونس امرے کے شاعر ہونے کی مناسبت سے اس کا رنگ اور لب ولہجہ بھی شاعرانہ ہے۔ جا بجا ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اویس جعفری نے یونس امرے کی شخصیت اور شاعرانہ طبیعت سے متاثر ہو کر اس کے طرزِ سخن کو اپنا لیا ہے۔ یہ کیفیت اس وقت بہت نمایاں نظر آتی ہے جب وہ یونس امرے کی شاعری کا ترجمہ اُردو میں کرتے ہیں۔ یونس امرے کے اشعار ترجمہ میں ڈھل کر اُردو غزل کے سادہ مگر دل میں اتر جانے والے اشعار میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے:

میں آیا ہوں یہاں جانے کی خاطر نہیں رہنا مجھے اس جا کسی طور

کل میں تجھ سے کیوں بچھڑا تھا　　درد یہی ہے، یہی تڑپ ہے

قلزم میری ذات میں پنہاں　　میں قطرہ ہوں، میں قلزم ہوں

اپنے مضمون میں انہوں نے یونس امرے کی شخصیت اور شاعری دونوں کا نقشہ نہایت کامیابی سے کھینچ دیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ یونس امرے پر اپنی تحقیق کو چند قدم آگے اور بڑھائیں اور اس سلسلہ کا دوسرا مضمون بھی عنایت کریں۔

اُردو کی امریکن نژاد ادیبہ ونقاد فرانسس پریشٹ کے انگریزی مقالہ کا اردو ترجمہ (مترجم: محمد علی طارق) بعنوان ''رالف رسل کا مطالعہ غزل'' کئی پہلوؤں سے توجہ کا مستحق ہے۔ کسی ادب پارے کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا نہایت مشکل اور دیدہ ریزی کا کام ہے۔ مترجم کے لیے نہ صرف یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ دونوں زبانوں پر قدرت رکھتا ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جس صنف ادب کا ترجمہ کر رہا ہے اُس کے رموز و نکات سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ محمد طارق علی کا ترجمہ تکنیکی اعتبار سے اچھا ہے البتہ وہ کہیں کہیں الجھ گیا اور مصنفہ کے خیالات کی ترجمانی پوری طرح نہیں کر سکا ہے۔ اس سے فاضل مترجم کی تنقیص ہرگز مقصود نہیں ہے بلکہ یہ کہنا منظور ہے کہ ترجمہ کے لیے صاف ستھرا اور واضح ہونا ضروری ہے۔ یہ مضمون ایک اور وجہ سے نہایت اہم ہے۔ اردو میں تنقید کو اکثر محض تحسین وستائش کا ایک طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ اہل اردو عموماً خود اعتمادی اور تحمل سے متصف نہیں ہوتے ہیں اور اپنی ادبی و شعری تخلیقات پر تنقید کو شخصی حملہ کے مترادف فرض کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ سراسیمگی، عناد و فساد کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس مضمون میں فرانسس پریشٹ نے غزل کے حوالے سے رالف رسل کے نقطۂ نظر پر سخت تنقید کی ہے اور ان کے موقف کی کمزوریاں بڑی بیباکی سے واضح کی ہیں۔ یقیناً رالف رسل نے اس مضمون کا مطلق برا نہیں مانا ہوگا بلکہ اس کو ادبی تبادلہ خیال کے کھاتے میں ڈالا ہوگا۔ کیا عجب کہ انہوں نے فرانسس پریشٹ کے دلائل سے جزوی یا کلی اتفاق بھی کیا ہو یا بصورت دیگر اپنے موقف

کا دفاع کیا ہو۔ مغرب میں نقد و نظر کا جو اعلیٰ اور مہذب معیار ہے اس کی بنا پر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''اردو کو ابھی انگریزی سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔''

علامہ اقبال نے اُردو ادب و شعر کو جس طرح متاثر کیا ہے اور اس پر جو نئے دروازے کھولے ہیں اس کا اعتراف رسالے اکثر اقبال نمبر کی صورت میں کرتے رہتے ہیں۔ اسی حوالے سے ''اقبالیات'' کے تحت الاقربا نے بھی زیرِ نظر شمارے میں دو مضامین شائع کئے ہیں۔ پہلا مضمون بعنوان ''اقبال کے بعد طویل نظم: ایک جائزہ'' ڈاکٹر مظہر حامد کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ طویل نظموں کے حوالے سے علامہ اقبال کی شناخت اور مقام سے کون واقف نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے پیام کا ابلاغ اپنی نظموں میں بہت خوبی سے کیا ہے۔ مظہر حامد کے مبینہ مضمون نے علامہ مرحوم کے اس قرض کے اعتراف میں ان کے بعد آنے والے چھ شاعروں (جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، جعفر طاہر، علی سردار جعفری، حمایت علی شاعر) کا ذکر اجمالی طور پر کیا ہے لیکن مظہر حامد کے ذمہ یہ سوال اس مضمون کے بعد بھی جواب طلب رہ جاتا ہے کہ علامہ اقبال کی طویل نظموں کی وہ کون سی خصوصیات ہیں جو مذکورہ شاعروں کے نظمیہ کلام میں نظر آتی ہیں اور جن کی وجہ سے انہیں علامہ کے جانشین کہا جا سکتا ہے۔ علی سردار جعفری اور حفیظ جالندھری کے نظمیہ کلام میں تو کھینچ تان کر اقبال کا آہنگ اور ہیئت کے تجربے دیکھے جا سکتے ہیں ہر چند کہ یہ شناخت بہت سطحی اور کم اعتبار ہے۔ معلوم نہیں کہ باقی چار شاعروں کو مصنف نے طویل نظموں میں علامہ اقبال کا جانشین کیسے قرار دیا ہے۔ ساغر نظامی اور جوش ملیح آبادی ویسے چاہے جو کچھ ہوں، وہ اقبال کے پیام، آہنگ، جذبہ اور بیان کے معلن ہرگز نہیں ہیں۔ یہی صورت حمایت علی شاعر اور جعفر طاہر کی بھی ہے۔ صرف طویل نظم لکھ دینا کسی شاعر کو اقبال کی صف میں کیسے کھڑا کر سکتا ہے۔؟

سیّدہ نغمہ زیدی نے اپنے مضمون ''اقبال اور اتحاد بین المسلمین'' میں اُن تاریخی واقعات و حادثات اور محرکات کی نشاندہی کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جن سے متاثر ہو کر علامہ اقبال کے خیالات و جذبات اور شاعری نے ملت اسلامیہ اور اس کی خیر خواہی کی جانب فیصلہ کن صورت میں

رُخ بدلا اور وہ اپنی پوری قوت کو بروئے کار لا کر مغربی نظریۂ وطنیت کے زہریلے اثرات کا ازالہ کرنے اور نظریۂ توحید و وحدت ملت کے ابلاغ میں مصروف جہاد ہو گئے۔ نغمہ زیدی نے اپنے مضمون کے موقف کو سادہ الفاظ اور سیدھے لیکن موثر بیان میں ہی نہیں پیش کیا ہے بلکہ جا بجا علامہ مرحوم کے اشعار سے اس موقف کو ثابت و قائم کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور اس طرح ایک مشکل کام کو انہوں نے اپنے اور دوسروں کے لیے نسبتاً آسان بنا دیا ہے۔ اس موقف کا حرف آخر علامہ ہی کا یہ شعر ہے، جس کو مضمون کے اختتام پر غالباً اسی نکتہ کو دُہرانے کی خاطر لکھا گیا ہے:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں   موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اگر نغمہ زیدی اس سوال پر بھی کچھ روشنی ڈالتیں کہ جس ملت کی بنیاد ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب یعنی مکمل اور بے لاگ وحدانیت پر قائم کی گئی تھی وہ آج کل اتنے انتشار و خلفشار اور خانہ جنگی کا شکار اور زمانہ بھر میں خوار کیوں ہے؟ ساتھ ہی علامہ مرحوم کے کلام کی روشنی میں وہ کچھ ٹھوس اور قابلِ عمل تجاویز بھی اس صورت حال کی اصلاح کے لیے پیش کر دیتیں تو بڑا اچھا ہوتا۔

الاقرباء کے زیر نظر شمارے میں ''متفرقات'' کے عنوان سے تین مقالات پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر مضمون اپنی اہمیت الگ رکھتا ہے اور رسالہ کی مجموعی قدر و قیمت میں اضافہ کا باعث ہے۔ ''حیاتِ فیض، جہاتِ فیض'' کے عنوان سے مسلم شمیم نے فیض صاحب کے کوائف کو مناسب ترتیب اور تفصیل سے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ جہاں تک اُن کی شاعری یا نثر نگاری کے حسن و قبح کا سوال ہے مسلم شمیم نے اس موضوع کو مطلق نہیں چھیڑا ہے۔ مضمون کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ وہ فیض صاحب کی حیات کی مختلف جہات پر نگاہ تحقیق ڈالنا چاہتے ہیں اور یہ کام انہوں نے بہت خوبی سے انجام دیا ہے۔ صاحب موصوف کی تاریخ ولادت، خاندانی معلومات، اُن کی تعلیم کے سارے مراحل، اُن کی ملازمتیں اور دیگر معاشی سرگرمیاں، انجمن ترقی پسند مصنفین میں ان کی شرکت کے مختلف ادوار اور اُن کی مناسب تفصیلات، سیاست سے ان کی ٹکر اور اس کے نتائج، اُن کے دوست اور احباب نیز انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیمی و عملی تحریک میں ان سب کا

حصہ، فیض کی مختلف تصنیفات، غیر ممالک، خصوصاً مرحوم کی سوویت روس میں پذیرائی اور انعامات واکرامات وغیرہ سب کچھ ہی اس مقالہ میں چابکدستی سے سنوار دیا گیا ہے۔ فیض پر لکھنے والوں کے لیے یہ مواد بہت مفید ثابت ہوگا۔ ہر چند کہ فیض صاحب کی ادبی خدمات اور ان کے کلام پر مضمون میں کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے لیکن بین السطور کافی سے زیادہ اس ضمن میں اشارے موجود ہیں جو اہل نظر کو دعوت فکر دیتے ہیں۔

سرور عالم راز سرور نے اپنے مضمون ''اردو زبان کے تابعات'' میں ایک ایسے منفرد اور بے حد دلچسپ موضوع پر قلم اٹھایا ہے جس پر اردو میں اب تک بہت کم لکھا گیا ہے۔ تابعات اردو زبان و بیان کے ساتھ مخصوص ہیں اور ہر چند کہ اُردو کا خمیر فارسی سے اٹھا ہے، فارسی نیز عربی میں تابعات کا مطلق وجود نہیں ہے۔ آپ کی بول چال، افسانوں اور مضامین میں ہمارے یہاں تابعات کا استعمال بہت عام ہے اور ہر شخص عادتاً انہیں بغیر کسی ارادہ یا شعوری فیصلہ کے بے تکان استعمال کرتا ہے لیکن جہاں تک اس لطیف اور دلچسپ ''ٹوٹکے'' کے تجزیہ، ہیئت اور محلِ استعمال کا سوال ہے بہت کم لوگوں نے ان پر اظہار خیال کی زحمت کی ہے۔ سرور عالم راز کا مضمون دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ انہوں نے قاری کو تابعات کی تعریف پیش کی ہے اردو میں تابعات بنانے کے قاعدوں کی حد بندی کی ہے، قاری کو ان کے امکانات سے روشناس کرایا ہے، تابعات کی اقسام کی شناخت قائم کی ہے اور کثیر تعداد میں مثالیں فراہم کر کے مضمون کی قیمت میں اضافہ کیا ہے۔ مضمون میں مصنف نے جا بجا مناسب اشعار شائع کر کے نہ صرف متعلقہ تابعات کا استعمال ظاہر و واضح کیا ہے بلکہ ان اشعار سے مضمون میں شگفتگی اور روشنی بھی پیدا کی ہے۔ اُمید ہے کہ ایسی ہی دوسری لسانی جدتوں اور عوامی استعمال کی جانب یہ مضمون ہماری توجہ کو انگیز کرے گا اور اس طرح ہماری زبان کے استعمال کے ایسے نت نئے زاویے، پہلو اور اسلوب سامنے آئیں گے جو قاری کی نگاہوں سے چھپے ہوئے ہیں۔

اس حصہ کا تیسرا مضمون سید انتخاب علی کمال کا ''ترجمہ رموزِ بیخودی'' ہے۔ علامہ اقبال نے

''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بیخودی'' کے نام سے دو فارسی مثنویاں تخلیق کی تھیں۔ بقول مصنف مضمون ''رموزِ بیخودی'' میں پیش کیے ہوئے فلسفہ کا لب لباب یہ ہے کہ ''دین اسلام کسی ایک شخص کا دین نہیں ہے۔۔۔ بلکہ حیاتِ انسانی کی ایک مخصوص مجموعی شکل کا نام دین اسلام ہے اور اس کا دستور العمل ایک ایسا قانون ہے کہ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو ملت اسلامیہ کا فرد نہیں کہلا سکتا اور نہ اپنی خودی کو معراجِ کمال تک پہنچا سکتا ہے''۔ فاضل مصنف نے مذکورہ مثنوی پر مختصر اظہار خیال کیا ہے اور اس کے چند اُردو تراجموں کا ذکر بھی کیا ہے۔ آخر میں انہوں نے اپنے والد گرامی سید خورشید علی مہر تقوی جے پوری کے کیے ہوئے ''رموزِ بیخودی'' کے ترجمے کا مفصل ذکر کیا ہے اور اس کا تقابلہ علامہ اقبال کے متعدد فارسی اشعار سے کر کے مہر تقوی مرحوم کے ترجمہ کی فصاحت و بلاغت کی نشاندہی کی ہے۔ افسوس کہ فی زمانہ فارسی کی تعلیم مدرسوں میں نصاب کا حصہ نہیں ہے۔ جن لوگوں کو فارسی شاعری سے شغف ہے وہ اس مضمون سے زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ اگر فارسی کا کوئی طالب علم مہر تقوی صاحب پر ڈاکٹریٹ کی ریسرچ کرنا چاہے تو اس مضمون سے اسے مدد مل سکتی ہے۔

باب ''یادِ رفتگاں'' میں تین مضامین شامل کیے گئے ہیں یعنی ''یگانہ سے متعلق چند یادیں'' (محمد رضا انصاری) ''شاعر شباب الطاف مشہدی'' (شاکر کنڈان) اور ''علی احمد رفعت کی غزل میں سیاسی عنصر'' (قدرت اللہ شہزاد)۔ رضا انصاری اپنے خلوص اور یگانہ مرحوم سے قریبی تعلق خاطر کے باجود اپنے ہلکے پھلکے مختصر مضمون میں مرحوم کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے ہیں۔ ان کی یہ یادیں اور مرحوم کی یادداشتیں دلچسپ تو ضرور ہیں لیکن موصوف کی پیچیدہ اور منفرد شخصیت یا ان کے فن شعر کو پرکھنے اور سمجھنے میں بہت ہی کم معاون ہیں۔ مضمون میں کوئی ایسی خاص بات نظر نہیں آتی ہے جو اس سے پہلے منظر عام پر نہیں آچکی ہے سوائے ان چند باتوں کے جو مصنف اور یگانہ مرحوم کے درمیان چند موقعوں پر ہوئیں اور تاریخ ادب اُردو میں جن کی اہمیت مشکوک ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر مصنف یگانہ مرحوم سے متعلق اپنی اُن یادوں کو بھی احاطۂ تحریر میں لے آتے جن سے مرحوم کو

مختلف سطحوں پر سمجھنے میں آسانی ہوتی۔

الطاف مشہدی پر مضمون محنت اور دلسوزی کے ساتھ لکھا گیا ہے البتہ فاضل مصنف اپنے موضوع سے کہیں کہیں بھٹک گئے ہیں اور اس کے نتیجہ میں وہ اس کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کر سکے ہیں۔ انہوں نے الطاف مشہدی کو بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اپنے موقف کی تائید میں انہوں نے شاعر موصوف کے کلام سے جو اشعار پیش کیے ہیں وہ چار غزلیہ اشعار کے سوا سب کے سب ان کی نظموں سے لیے گئے ہیں۔ کاش وہ موصوف کی غزل کا بھی اسی طرح تجزیہ کرتے جیسا انہوں نے نظموں کا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف چار غزلیہ اشعار کی بنا پر کسی بھی شاعر کا مقام پرکھا نہیں جا سکتا ہے۔ موصوف کے شعری مقام کا اندازہ اردو کے دیگر مشاہیر (عندلیب شادانی، عبدالمجید سالک، پنڈت دتا تریہ کیفیؔ، محی الدین قادری زور، تاجور نجیب آبادی، نیاز فتح پوری) کی رائے سے لگایا جا سکتا ہے جو مختصراً مضمون میں دی گئی ہیں۔ معلوم نہیں کیوں اس سلسلہ میں کرشن چندر کی رائے بھی شامل کر لی گئی ہے جب کہ وہ شاعر نہیں بلکہ افسانہ نویس تھے۔ اوپر شاکر کنڈان کے موضوع سے بھٹکنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاکر صاحب نے مضمون میں الطاف مشہدی کی متعدد شادیوں کا بیان تفصیل سے لکھا ہے جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس پر مستزاد انہوں نے موصوف کے بے شمار معاشقوں کے قصے لکھے ہیں یا پھر ان کی بے پناہ شراب نوشی کا ذکر مزے لے لے کر کیا ہے۔ اگر فاضل مصنف شاعر موصوف کے کلام پر علمی اور فنی نقطۂ نظر سے بحث کرتے اس کا تجزیہ اور محاسبہ کرتے، اس کے حسن و قبح پر گفتگو کرتے اور ضمناً اُن کے طریق زندگی اور شخصیت پر بھی روشنی ڈالتے تو وہ اپنے موضوع کے وفادار رہ سکتے تھے۔ موجودہ شکل میں یہ مضمون دلچسپ تو ضرور ہے لیکن اس کی ادبی حیثیت وہ نہیں رہ گئی ہے جو ذرا سی کوشش اور دوراندیشی سے بن سکتی تھی۔

''علی احمد رفعت کی غزل میں سیاسی عنصر'' میں قدرت اللہ شہزاد نے شاعر موصوف کی غزل میں تقسیم ہند کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حالات اور سیاسیات کی نشاندہی کی ایک اجمالی کوشش

کی ہے یہ مضمون اس قدر مختصر ہے کہ شہزاد کسی سطح پر بھی رفعت مرحوم کی غزل کے سیاسی رنگ اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کا حق ادا نہیں کر سکے ہیں۔ ضرورت تو یہ تھی کہ شاعر موصوف کا مختصر تعارف کرایا جاتا، اُن کی غزلیہ شاعری کے محرکات پر سیر حاصل بحث کی جاتی اس وقت کے سیاسی پس منظر پر روشنی ڈالی جاتی تقسیم ملک سے پیدا ہونے والے ہنگامی سماجی اور سیاسی حالات سے شاعر موصوف کی غزل پر مرتب ہونیوالے اثرات کا احاطہ کیا جاتا اور پھر رفعت مرحوم نے اپنی غزل میں جس طرح سیاسی عنصر سمو کر لوگوں کو آواز دی اور اس للکار نے اپنے اطراف و جوانب پر جو اثرات چھوڑے ان کا جائزہ لیا جاتا۔ مگر مضمون کا اختصار اس کام میں حائل ہے اور قاری کو کہیں اس قسم کی تحقیق و تنقیح نظر نہیں آتی ہے چنانچہ وہ مضمون کے مطالعہ سے فارغ ہو کر بھی خود کو تشنہ پاتا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر رفعت مرحوم کو اردو دنیا سے ایک مرتبہ پھر اچھی طرح روشناس کرایا جا سکتا تھا۔ اُمید ہے کہ مستقبل میں ہم اس سلسلہ میں بہتر کوشش دیکھ سکیں گے۔

افسانوں کا باب اس شمارہ کا سب کمزور حصہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل اردو افسانہ نگاری کچھ زیادہ ہی اضمحلال کا شکار ہے۔ افسانہ نویسی کا سنہرا دور گزرے دیر ہوئی اور اب شاذ و نادر ہی کوئی اچھا افسانہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ زیر نظر شمارہ میں صرف ایک افسانہ (سلیم زاہد صدیقی کا "سفارش" شریک اشاعت ہے۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ سے لے کر کردار نگاری اور اختتامیہ تک سپاٹ اور مختلف کمزوریوں کا شکار چنانچہ اس کا مطالعہ قاری پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑتا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ اگر یہ افسانہ شامل اشاعت نہ کیا جاتا تو رسالہ کی قدر و قیمت پر کوئی منفی اثر نہ پڑتا۔ امید ہے کہ مستقبل میں ادارۂ الاقرباء کوشش و توجہ سے بہتر افسانے پیش کر سکے گا۔

رسالہ کے باب غزل میں کئی اچھی غزلیں شامل ہیں۔ غزل کہنا لوگوں نے آسان سمجھ رکھا ہے جب کہ فی الواقعہ یہ ایک مشکل فن ہے۔ اچھی غزل کہنا ہر ایک شاعر کے بس کی بات نہیں ہے اور عظیم غزل کہنا تو معدودے چند شاعروں کو ہی نصیب ہو سکا ہے۔ یہ سالنامہ اردو غزل کے متعدد معتبر ناموں سے مزین ہے۔ مضطر اکبر آبادی، پرتو روہیلہ، مشکور حسین یاد۔ محشر زیدی، ضامن

جعفری کے علاوہ بھی کئی نام قابل ذکر ہیں۔ وہ دوسری اصناف سخن کی طرح غزل بھی فی زمانہ کمزوری کا شکار ہے۔ یقیناً اس صورت حال کے متعدد اسباب ہیں۔ ان اسباب میں ہمارے پرانے لیکن آزمودہ استادی: شاگردی کے نظام کے زوال کا ذکر ضروری ہے۔ یہ نظام اپنی متعدد خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود بڑی حد تک اس بات کا ضامن تھا کہ جو غزل کسی استاد فن کی نگاہوں سے گزر کر منظر عام پر آئے گی وہ عام غزلوں سے فنی اور تکنیکی سطح پر بہتر ہوگی۔ رہ گیا تغزل، شعریت اثر پذیری اور دوسری خصوصیات کا معاملہ تو وہ شاعر کی اپنی استعداد، ذوق شعر گوئی اور فطری صلاحیت پر مبنی ہوگا۔ اب یہ نظام کم وبیش ختم ہو چکا ہے اور غزل کا سوائے خود شاعر کے کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے شاید اتنا مزید کہنے میں ہرج نہیں ہے کہ اگر شعرا کسی دوسرے کو کلام نہیں دکھانا چاہتے ہیں تو خود احتسابی کو سختی سے اپنا کر اپنی غزلوں میں بہتری پیدا کر سکتے ہیں۔

ازراہ تفنن طبع یہاں الاقربا کی غزلوں سے چند اشعار لکھنا نامناسب نہیں ہوگا۔

اپنی تباہیوں کے بعد ہم پہ ہوا یہ انکشاف — دوسر کوئی بھی نہ تھا ہم تھے خود اپنی گھات میں
(مضطر اکبرآبادی)

محبتوں کی وہی طلب ہے وفا شعاری وہی ہے صفدر — وہی ہے قربان گاہِ ہستی، یہ آزمانا نیا نہیں ہے
(صفدر حسین جعفری)

دیکھتے ہی اسے جانے ہمیں ہو جاتا ہے کیا — جان کر بھی جسے جانا نہیں جاتا ہم سے
کس کو اس دہر میں سمجھا نہیں ہم نے مشکور — بس وہی ہے جسے سمجھا نہیں جاتا ہم سے
مشکور حسین یاد)

خفا نہ ہوں تو میں یارانِ شہر سے پوچھوں — کہ اس دیار میں رسم و رہِ وفا بھی ہے؟
(محشر زیدی)

غزلوں کے مقابلہ میں رسالہ کا باب نظم دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے۔ پابند نظم کے خانے میں صرف صابر عظیم آبادی کی آٹھ رباعیات کو ہی گنا جا سکتا ہے جو مضمون کے لحاظ سے سپاٹ اور معمولی ہیں اور زبان کے دروبست کے لحاظ سے ان میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔ رباعی کا فن ایک نہایت

مشکل فن ہے۔ صرف وزن کی پابندی رباعی کی کامیابی کی ضامن نہیں ہو سکتی ہے۔

ہزاروں جام ہائے تلخ و شیریں پینے پڑتے ہیں بڑی مشکل سے کوئی آشنائے راز ہوتا ہے
(راز چاند پوری)

یقین تو نہیں آتا کہ پابند نظم کہنے کا فن دُنیائے اردو سے اٹھ گیا ہے لیکن اس سالنامہ کو دیکھ کر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے اور یہ ایک مقام فکر ہے۔ مندرجہ بالا رُباعیات کے علاوہ باب نظم میں چھ آزاد نظمیں ہیں۔ ان میں اویس جعفری کی ''گریۂ شبنم'' اور حسنِ عسکری اعظمی کی ''روشنی کا سفر'' متاثر کرتی ہیں پہلی شاید اپنے حمد یہ نعتیہ رنگ کی وجہ سے اور دوسری پاکستان کی دگرگوں سیاسی حالت کے باعث۔ واقعہ یہ ہے کہ مشمولہ آزاد نظموں سے بہتر تخلیقات کا تصور زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آزاد نظمیں آج کل ہر طرف دیکھنے میں آتی ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ پابند نظم کہنے میں جس ذہنی اور فنی نظم و ضبط اور دماغ سوزی کی ضرورت ہوتی ہے اس سے آج کا نظم گو شاعر فرار چاہتا ہے؟ کیا اس کو علم نہیں کہ اچھی آزاد نظم کہنا بھی ایسا آسان نہیں ہے۔ اس کے بھی اپنے اصول اور معیار ہیں۔ رسالہ کی آزاد نظمیں مناسب ہیں لیکن ان کے بہتر بنانے کے امکان بھی بہت وسیع ہیں۔ ادارۂ رسالہ سے گزارش ہے کہ پابند نظموں کی تلاش اور بازیافت کی جانب سے مایوس نہ ہوں بلکہ کوشش سے ان کے فروغ کی جانب توجہ کی جائے۔

''نقد و نظر'' کے عنوان سے اس شمارہ میں حال ہی میں شائع شدہ کتابوں پر تبصرے کئے گئے ہیں۔ عام رسالوں میں ایسے تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں اور بیشتر کو پڑھ کر نہ صرف متعلقہ کتاب کے بارے میں کوئی علم افروز بات نہیں معلوم ہوتی بلکہ اکثر یہ شک ہوتا ہے کہ خدا جانے تبصرہ نگار نے کتاب پڑھی بھی ہے یا صرف چند اوراق الٹ پلٹ کر (یا بقول شفیق الرحمٰن ''سونگھ کر'') تبصرہ لکھ دیا ہے۔ کتاب کے کاغذ، جلد سازی اور طباعت سے متعلق کچھ گھسے پٹے جملے اور نفس کتاب پر چند آزمودہ فقرے ہی ایسے تبصروں کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ الاقرباء میں کئے گئے تبصروں سے از خود ظاہر ہوتا ہے کہ تبصرہ نگار نے نہ صرف کتاب پڑھی ہے بلکہ اس پر سوچا بھی ہے اور غور و فکر کے بعد ہی اس پر رائے لکھی ہے۔ زیر نظر سالنامہ میں صرف تین کتابوں پر تبصرے شامل ہیں جو

اُنیس (۱۹) صفحات پر محیط ہیں۔ تبصروں کی یہ ضخامت بجائے خود تبصرہ نگاروں کی محنت اور ادب دوستی کی جانب ایک معتبر اشارہ ہے۔ تبصرے دراصل مختصر لیکن جامع مضامین ہیں اور جن کتابوں پر کئے گئے ہیں اُن کے متعلق سوچی سمجھی اور پُر مغز رائے کا حکم رکھتے ہیں۔ راقم الحروف کی رائے میں سید ابرار حسین کے شعری مجموعہ ''تم جلاؤ تو دیا'' پر سید منصور عاقل کا تبصرہ اتنا مفصل اور دلپذیر ہے کہ اس کو ایک مضمون کی حیثیت سے سالنامہ میں ہی شائع کیا جانا چاہیئے تھا۔ ایسے تبصرے دوسرے رسالوں کے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔

مجموعی طور پر الاقربا کا سال رواں کا سالنامہ ایک دلفریب، خوش آئند اور مفید ادبی اور علمی دستاویز ہے۔ ادارۂ الاقربا کی محنت اور دلسوزی رسالہ سے ظاہر ہے۔ امید ہے کہ قارئین رسالہ اس محنت اور محبت کی قدر کریں گے تاکہ اردو کی جو خدمت الاقربا کر رہا ہے وہ یونہی جاری رہے۔ آج کے اہلِ اردو کو اس کارواں میں بڑھ کر شامل ہونا چاہیے، پرانے چراغوں سے نئے چراغ جلانے چاہئیں اور پھر یہ سلسلہ آئندہ نسلوں کے لیئے روشن اور ضوفشاں چھوڑنا چاہیے۔ ہمارا طرزِ عمل وہ ہونا چاہیے جس کی طرف عرفی نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی   حُدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی

(نوٹ) ہم ممنون ہیں کہ فاضل تبصرہ نگار نے سالنامہ 'الاقرباء' ۲۰۱۴ء کی نگارشات کے تفصیلی جائزہ میں مختلف اصناف نظم ونثر کے حسن و قبح پر جامع گفتگو کی ہے اور خود اپنے مضمون (اردو زبان کے تابعات) کے محاسن اور اہم

نکات واضح فرمائے ہیں۔ تاہم ہماری عاجزانہ رائے میں بہتر ہوتا کہ وہ اپنے وقیع مضمون پر اظہار رائے کی ذمہ داری قارئین کرام پر چھوڑ دیتے (ادارہ)

متفرقات

شمس جیلانی۔ وینکور (کینیڈا)

الاقرباء۔ اسلام آباد

اس عنوان اور نام کی ندرت کی وجہ سے آپ چونکیئے گا نہیں، دراصل یہ اسلام آباد سے نکلنے والے ایک ادبی مجلے کا نام ہے، اور اس نے ''اقرباء'' سے پہلے اپنے ساتھ ''ال'' لگا کر اپنی شناخت ان سے الگ کر لی ہے تاکہ لوگ اس کا رشتہ اقرباء پرستوں سے نہ جوڑ سکیں۔ دوسرے دونوں میں فرق بہت بڑا ہے کہ وہ قومی اساسوں کو خرد برد کر کے ٹیکس کی رقم پر اقربا پروری کرتے ہیں، جب کہ یہ جس ادارے کے تحت شائع ہو رہا ہے اس کا نام الاقرباء فاؤنڈیشن ہے اور اردو کے پرستاروں کے لیے معیاری ادب پیش کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ صرف اقربا پروری بھی کرتا تو بھی اس کا ہر قدم ازروئے اسلام مستحب ہوتا اس لیے کہ دین اسلام میں اپنے اقرباء کو نوازنا پہلی ترجیح اور ایک مستحسن فعل ہے۔

جب کہ اس کے برعکس بیت المال یا سرکاری وسائل پر اقربا پروری کرنا قابلِ مذمت ہے اسی لیے وہ ہر گناہ کی طرح چھپ کر کی جاتی ہے اور میڈیا والے اس کی تاک میں لگے رہتے ہیں اور وہ اس سے استفادہ کرنے والوں کی پول کھولتے رہتے ہیں۔ یہ ایک کلیہ ہے کہ ہر برائی بدبودار ہوتی ہے اور اس سے ایسے بھبکے اٹھتے ہیں کہ ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ پہلے تو ایسے مقامات سے لوگ ناک دو انگلیوں سے دبا کر وہاں سے گزر جاتے تھے، یا اپنی جیب سے خوشبودار رومال نکال کر ناک پر رکھ لیتے اور آگے بڑھ جاتے تھے۔ لیکن اب وہاں لوگ اس کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ بدبو محسوس ہی نہیں ہوتی بلکہ بعض تو سونگھتے پھرتے ہیں اور منبع غلاظت تک پہنچ کر ہی دم لیتے

ہیں تا کہ اس سے فیض یاب ہو سکیں جب کہ اقربا پروری اپنی جیب پر ہو تو مستحب ہے اور اعلیٰ درجہ کی نیکی سمجھی جاتی ہے۔ وہ بھی چھپائے نہیں چھپتی اور اللہ سبحانہ تعالیٰ اسے ایسی خوشبو عطا فرماتا ہے کہ اس کی فرحت خیزی ایک کو متاثر کر کے دوسروں کے لیے تحریک کا ذریعہ بنتی ہے کہ وہ بھی اسی طرح اللہ اور رسولؐ کا اتباع کریں؟

الاقرباء فاؤنڈیشن کے اغراض و مقاصد تو ہمیں معلوم ہیں مگر جوان کا عمل ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے کرتا دھرتاؤں کا تعلق یقیناً ادب سے ہے جو انہوں نے اپنے یوم تاسیس سے ادب کی خدمت شروع کر رکھی ہے اور غالب حصہ اس میں معیاری ادب کا ہے، جب کہ زیر نظر مجلہ ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں سے صرف چار صفحات اقربا پروری کے زمرے میں آتے ہیں جو ہر طرح سے مستحسن ہے۔

اس میں لکھنے والوں میں جتنے نام شامل ہیں وہ سب اُردو کے جانے پہچانے لوگ ہیں اور قد میں مجھ سے کہیں اونچے ہیں؟ لیکن یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں ان میں سے بہت کم لوگوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں،۔ اس لیے کہ عرصہ چھبیس سال سے میں کینڈا میں ہوں۔ لہٰذا میں صرف دو حضرات کے بارے میں لکھ رہا ہوں، کیونکہ بغیر جانے کسی کے بارے میں لکھنے یا ضمانت دینے سے ہمیں منع کیا گیا ہے کیونکہ اس میں جھوٹ سرزد ہونے کا امکان ہے، اور اس سلسلہ میں یہ طویل حدیث مشعل راہ ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ ''مسلمان میں سب خامیاں ہو سکتی ہیں مگر جھوٹا مسلمان نہیں ہو سکتا۔'' جب کہ جھوٹ کو ہم نے ابھی اپنے روزمرہ میں شامل کر لیا ہے۔ اس دائرے کے اندر رہتے ہوئے میں جن کے بارے میں لکھ رہا ہوں! ایک تو اس ادارے کے صدر نشیں جناب سیّد منصور عاقل صاحب ہیں جن کو میں نے ان کے دو چھپتے ہوئے اداریے پڑھ کر پہچانا کیونکہ تحریر خود بھی شہادت دیتی ہے، وہ اداریے جن سے میں متاثر ہوا ہوں ''ایک کراچی اور لاہور کی تشنہ مقاصد بین الاقوامی ادبی و ثقافتی تقریبات'' ہے اور دوسرا ''قندیل علم۔ ظلم اور جہالت کے حصار میں'' جن سے وہ درد جھلکتا ہے جو کہ ان کے دل میں پاکستان اور اردو کے لیے ہے؟

جب کہ دوسری شخصیت ہمارے کرم فرما جناب اویس جعفری صاحب ہیں، جن کے ذریعہ یہ پرچہ ہم تک پہنچا۔ جعفری صاحب سے ہماری بہت پرانی یاد اللہ ہے۔ اس لیے کہ وہ میرے ہمسایہ ہیں، میں وینکور میں ہوں اور وہ سیاٹل میں۔ ان دونوں مقامات کا موسم وغیرہ سب ایک ہے ہاں! حکومتیں مختلف ہیں۔ لیکن سرحدیں برائے نام ہیں، شہریوں کے آنے جانے پر کوئی پابندی بھی نہیں ہے بس پہچان کے لیے ان کی طرف امریکہ کا پرچم لہرا رہا ہے اور میری طرف کینڈا کا۔ جب کہ جعفری صاحب کی پہچان یہ ہے کہ وہ وہاں اردو کی جوت جگائے ہوئے ہیں اور ہمیں ان سے دوستی کے علاوہ ان کی مہمانی اور میزبانی دونوں کا شرف بھی حاصل ہو چکا ہے؟ بس یوں سمجھ لیجئے کہ وہ لکھنوی تہذیب کا منہ بولتا ثبوت ہیں اب ایسے لوگ دنیا میں کہاں؟ جب کہ لکھنویت خود لکھنؤ میں بھی نہیں رہی؟ کہ حضرت گنج اور امین آباد جو کبھی شہر کی جان سمجھے جاتے تھے اب ان پر لالوکھیت کا گمان ہوتا ہے۔ ویسے تو یہ شہر بہت قدیم ہے اور ہندوؤں کے اوتار رام جی کے بھائی لکشمن جی نے آباد کیا تھا اور اپنے نام پر ہی نام بھی رکھا تھا، وہی نام بگڑ کر موجودہ نام اختیار کر گیا۔ مغلوں کے کمزور پڑنے کے بعد یہ شاہان اودھ کا دارالحکومت بنا پھر انگریز کی علمداری میں آیا تو یوپی کا دار الحکومت بنا اور دونوں ادوار میں بہت ترقی کی، مجھے تین وجوہات کی بنا پر یہ شہر بہت پسند تھا ایک اس کی تاریخی عمارات؟ دوسرے اس سے شرف ہم سائیگی کہ میرا وطن پیلی بھیت اپنے جنگلات اور شکارگاہوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہاں کے لوگ ہمارے یہاں اکثر شکار کھیلنے آتے تھے اور ہم وہاں تہذیب سیکھنے جاتے تھے کیونکہ ان دنوں مسلمانوں کو کوئی اور کام تھا ہی نہیں؟ تیسرے یہ کہ وہ گہوارۂ ادب تھا اور میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بھی ۱۹۴۴ء میں نسیم انہونوی مرحوم کے "حریم" سے کیا تھا جو کہ شوکت تھانوی مرحوم کے برادر نسبتی تھے۔ لہٰذا اویس جعفری سے محبت ہونا قدرتی بات ہے خاص طور سے ان کا مذہب سے لگاؤ اور ان کے اندر پوشیدہ ندرت پسندی مجھے برسوں سے انکا گرویدہ بنائے ہوئے تھی وہ تھا ان کا مشاعروں کی نظامت کرتے ہوئے شاعروں کا منظوم تعارف جس کی طرح ڈالنے والے وہی تھے، جواب عام ہو چکا ہے۔ ابھی میں نے جنوری تا مارچ کے

شمارے میں ان کا حضرت حسان بن ثابتؓ کے بارے میں جو جامع مضمون دیکھا تو مجھے ایسا لگا کہ وہ معلومات کا خزانہ ہے۔ میں نے ان پر اس سے بہتر مضمون سیرت نگار ہوتے ہوئے اپنی زندگی میں نہیں پڑھا، میری ان سے دوستانہ درخواست ہے کہ وہ فن سیرت کی طرف توجہ دیں تو انشاللہ کامیابی ان کے قدم چومے گی اور ان کا نام بھی حضورؐ کے غلاموں میں شامل ہوجائے گا۔

اس شمارے میں باقی مضامین اور شاعری بھی اعلیٰ معیار کی ہے میرے خیال میں یہ اردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے

*****

سمیرا حمید☆

ماریشس میں اُردو

عربی رسم الخط کے انفرادیت کے ساتھ اردو برصغیر کے مسلمانوں کی زبان کے طور پر اُبھری۔ جو بعد میں پاکستان کی قومی زبان کے طور پر جانی گئی۔ عام بول چال میں اردو اور ہندی یکساں تاثر پیش کرتی ہیں تاہم ہندی رسم الخط اور گرائمر کے قواعد وضوابط اردو سے کافی مختلف ہیں۔ زبان کسی بھی قوم کا تہذیبی ورثہ ہوتا ہے۔ ایک پاکستانی اور اردو کی ترویج وترقی کے نمائندے کی حیثیت سے مجھے ہمیشہ اس بات کی پریشانی لاحق رہی کہ ہمارا انگریزی زبان سیکھنے اور اپنے بچوں کو سکھانے کی طرف بڑھتا ہوا رجحان ہماری قومی زبان اردو کی بقاء کے لیے بے انتہا نقصان دہ ثابت ہوگا۔ ہندی کی موجودگی میں اردو زبان کے بولنے اور سمجھنے والے تو مستقبل قریب میں موجود ہونگے۔ لیکن اردو کا رسم الخط اس کی سمجھ بوجھ اور استعمال کا تحفظ ایک مشکل امر ثابت ہوگا۔ قطع نظر اس بات کے کہ اردو کے مصنفین بھارت میں زبان کی ترویج اور اس کے عربی رسم الخط کے تحفظ کے لیے قابل قدر خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔

خوش قسمتی سے موریشس کے مسلمان جو ہمارے آباؤ اجداد کی موریشس ہجرت کی وجہ سے گویا اپنا ہی خون معلوم ہوتے ہیں۔ وہ جغرافیائی طور پر تو ہم سے بہت زیادہ فاصلے پر ہیں لیکن تہذیب و تمدن، مذہب اور زبان کے لحاظ سے ہم پاکستانیوں کے ساتھ کافی مماثلت رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے مجھے اور اُردو زبان کے دیگر رفقاء کو اطمینان ہے کہ ہماری زبان کا تحفظ ہمارے علاوہ کہیں اور بھی کیا جا رہا ہے۔ جب سے ہمارے آباؤ اجداد موریشس ہجرت کر کے گئے اس وقت سے ہی اردو

☆ نائب صدر۔ پاکستان ماریشس فرینڈشپ ایسوسی ایشن۔ اسلام آباد

زبان سے متعلق تحقیق، تربیت، تعلیم، تحریر، ترویج اور تحفظ زبان کا سلسلہ ایک تہذیبی ورثے کے طور پر جاری وساری ہے۔

موریشس میں بہت سارے ادارے، تنظیمیں، کلب اور گروپ اردو زبان کی ترویج وترقی کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں مختلف ادیب انفرادی طور پر شاعری، ادب اور تھیٹر ڈراموں کے ذریعے ہماری زبان کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ جو بلاشبہ ہماری امیدوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اردو خصوصاً موریشس کے ان مسلمانوں کی مادری زبان ہے جن کی جڑیں برصغیر کے مسلمانوں سے جا ملتی ہیں اور تمام مسلمانوں کی عمومی زبان کے طور پر جانی جاتی ہے۔

موریشس کے بہت سے ادیب ہمارے پاکستانی مصنفین سے اپنی تحقیق وتحریر کے ذریعے رابطہ رکھے ہوئے ہیں۔ انجمن فروغ اردو، اردو بان کے فروغ کی سوسائٹی، اسلامک کلچرل سینٹر اور دی نیشنل اردو انسٹیٹیوٹ وغیرہ ایسے ادارے ہیں جو موریشس میں اردو زبان کے لیے کیے جانے والے کام پر اپنی توجہ مرکوز کیئے ہوئے ہیں۔

سینتیس سے بھی زیادہ ڈرامہ نگار اپنی تحریر سے تہذیب وزبان کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے تحریر کردہ ڈرامے تھیٹر میں فخریہ طور پر پیش کیے جاتے ہیں اور انھیں سراہا بھی جاتا ہے۔ پاکستان میں تعینات موریشس کے سفیر میجر جنرل (ر) الفت حسین نے جب مجھے افریقی براعظم میں موجود موریشس کے مصنفین کے کام سے آگاہ کیا تو یہ میرے لیے حیرانی اور سرخوشی کا باعث تھا کہ وہاں چالیسواں اردو ڈرامہ فیسٹیول (۱۹۷۴۔۲۰۱۴ء) منایا جا رہا تھا۔ ہر پاکستانی اردو زبان سے محبت رکھتا ہے۔ اور موریشس کے مسلمان اردو کی ترویج کے لیے کام کر کے پاکستان کی مدد کرنے میں اپنا کردار ادا رہے ہیں۔ کراچی آرٹ کونسل کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے موریشس کا اردو ڈرامہ ''آہ کی گونج'' موریشس کے اداکاروں کے ذریعے ہی پیش کیا۔ پہلے یہ ڈرامہ موریشس میں پیش کیا گیا تھا۔

ڈرامہ ایک نہایت اہم صنف ہے لیکن اسے اردو ادب میں کافی نظر انداز کیا جارہا ہے۔ موریشس کے اردو ادب میں بہت سارے مکمل ڈراموں کے ساتھ ساتھ 'یک بابی ڈرامے' (ون ایکٹ۔ پلے) بھی موجود ہیں۔ ۱۹۷۴ء سے لے کر ۲۰۱۴ء تک ۸۸ (اٹھاسی) تنظیموں اور ۵۰ (پچاس) کالجوں نے بے شمار اداکاروں کے ساتھ "اردو ڈرامہ فیسٹیول" میں حصہ لیا۔ ہر سال بہترین اداکار، بہترین اداکارہ، بہترین ہدایت کار اور بہترین ڈرامہ کی مد میں ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔

ایم۔ بی۔ سی (MBC) ریڈیو نے ڈرامہ کی ترویج میں خصوصاً اہم کردار ادا کیا ہے۔ موریشس میں اردو ڈرامہ نے بہت ترقی کی ہے۔ ڈراموں کے دس مجموعات شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں چھ (۶) ڈرامہ نگاروں کے ستر (۷۰) ڈرامے شامل کیئے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمارے پڑھنے والے خصوصاً ادبی لوگ اسے ایک معمولی کاوش سمجھیں۔ لیکن اگر موریشس کی آبادی کو دیکھا جائے جو کہ ۲۹۶ء املین ہے اور مسلمان اس آبادی کا محض ۳ء ۱۷ فیصد ہیں (جن میں عربی ماخذ سے تعلق رکھنے والے اور بعد میں اسلام قبول کرنے والے دونوں طرح کے مسلمان شامل ہیں) تو یہ بہت بڑی کاوش نظر آتی ہے۔

مزید برآں جغرافیائی طور پر ہم سے انتہائی مختلف حیثیت رکھنے والا خطہ ہماری زبان کی محبت میں مبتلا ہو کر اس کی ترویج اور تحفظ میں مصروف ہے۔ میں اور دیگر رفقاء اپنی پوری کوشش کریں گے کہ موریشس کے اردو ادب کے لیے ہماری لائبریریوں اور کتابوں کی دکانوں پر مخصوص حصے مختص کر دیے جائیں۔ اس کے علاوہ ہم یہ کوشش بھی کریں گے کہ سرحدوں کے آر پار تھیٹر ڈراموں اور مصنفین کا تبادلہ اور آمد و رفت ممکن بنائی جائے۔ مقتدرہ قومی زبان، نیشنل بک فاؤنڈیشن و اکیڈمی آف لیٹرز، پاکستان آرٹس کونسل، نظریہ پاکستان ٹرسٹ، آئینہ اور انسانیت ویلفیئر نیٹ ورک وغیرہ کے ذریعے سے موریشس کے اردو ادب کی کتابوں کا سلسلہ وار تعارف ممکن بنایا جائے۔

پاکستان کا ایک تحقیقی رسالہ "الاقرباء" جو میرے علم کے مطابق برصغیر کا واحد تحقیقی رسالہ ہے جسے موریشس کے اردو معلوماتی دائرے میں باقاعدگی سے پڑھا جاتا ہے۔ اور یہ اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے

والوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ مزید یہ کہ پاکستان موریشس فرینڈ شپ ایسوسی ایشن" کے ذریعے سے مختلف اداروں کی مدد سے اردو زبان کی ترویج کے لیے ترقیاتی اقدامات بھی کیے جا رہے ہیں۔

عقیل دانش

'مت سہل ہمیں جانو'۔۔۔عبداللہ جاوید

محترم عبداللہ جاوید ہمارے اُن لکھنے والوں میں ہیں جنھوں نے حرف کو اعتبار اور معیار عطا کیا ہے۔ معروف شاعر صاحب دل افسانہ نگار۔ ژرف نگاہ ناقد اور باشعور کالم نگار عبداللہ جاوید نے اُردو دنیا کے لیے مطالعۂ میر "مت سہل ہمیں جانو آیئے میر پڑھیئے" کے نام سے پیش کیا ہے۔

میں پوری ذمہ داری اور وثوق سے عرض کرتا ہوں کہ میر پر اب تک متعدد تحریریں شائع ہو چکی ہیں لیکن عبداللہ جاوید نے میر پر جو نظر ڈالی ہے وہ انوکھی، دلچسپ، دلنشیں اور دل چھو لینے والی ہے۔ غالب کی طرح میر پر بھی اردو اور انگریزی میں خاصا کام ہوا ہے۔ لیکن عبداللہ جاوید نے میر کو سمجھنے کا جواز یہ تراشا ہے وہ ایک خاصے کی چیز ہے۔ انہوں نے اپنے پیش اس میں معروف اور معتبر ناقد پروفیسر عسکری کا ایک جملہ مذکور کیا ہے کہ "میر کو پڑھنا زندگی بھر کا جھگڑا مول لینا ہے۔ میر کے بارے میں ایسا جملہ عسکری صاحب ہی لکھ سکتے تھے یعنی میر کو بادی النظر میں دیکھا جاتا تو بہتر نشتروں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا لیکن میر کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اُن ہر ہر شعر میں پرت در پرت معنی ہویدا ہوتے ہیں۔ غالب کے لیے نیاز فتحپوری نے کہا تھا کہ "غالب ہر مستقبل میں مستقبل کا شاعر ہے" میں عرض کرتا ہوں کہ میر کے اشعار کسی ایک نسل کے لیے نہیں ہیں بلکہ نسلوں کے لیے ہیں۔ شاید اسی تیقن نے میر سے کہلوایا تھا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

عبداللہ جاوید صاحب نے اپنے وجدان، صلاحیتِ نقد اور ذہنی اُپج سے میر کے اُن اشعار کو بھی زندہ کر دیا ہے جس پر مجھ جیسے بے ذوق اور سہل پسند سرسری نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

میر کی شاعری کا ایک بنیادی عنصر ان کا عشق ہے۔ میر پر وہ وقت بھی گزرا ہے جب انھیں چاند میں کسی کی صورت نظر آنے لگی تھی۔ عشق سوز ہے۔ سازہ۔ آگہی ہے۔ درد ہے۔ کسک ہے۔ لذت ہے۔ میر نے اِس لذت سے آشنائی حاصل کرلی تھی حالی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

جاوید صاحب نے میر کی شاعری میں عشق کے اس عصر کو جس خوبصورتی سے پیش کیا ہے وہ قاری کی داد کے مستحق ہیں۔ راقم الحروف نے بڑے عاجیانہ' انداز میں عشق کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا تھا۔

کسی غزل میں کوئی دلکشی نہیں ہوتی بغیر عشق کے شاعری نہیں ہوتی

عبداللہ جاوید صاحب نے میر کے یہاں "مستیِ عشق نہیں" جذبۂ عشق کی تلاش کی ہے اور اس تلاش میں اُنھوں نے میر کے اشعار کے اُن اُن گوشوں پر نگاہ ڈالی ہے جو عام قاری پر واضح نہیں ہوتے۔ بعض جگہ اُنھوں نے میر کے ایک ایک شعر کا مفہوم ایک ایک صفحے تک رقم کیا ہے۔ اور اس تفسیر کو پڑھ کر قاری کے دل سے بے اختیار نکلتا ہے۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میر دل میں ہے

تفسیر میر میں عبداللہ جاوید صاحب نے اردو شاعری اور ادب کے ایسے ایسے حوالے دیئے ہیں جن تک عام قاری کا ذہن نہیں پہنچتا۔ میر کا عشق ہو۔ نظریۂ وحدت الوجود ہو، تصوف ہو حکمت پنہاں ہو، حیات و کائنات کو دیکھنے اور پرکھنے کا انداز ہو جاوید صاحب نے میر کے اشعار کے حوالے سے ہر زاویے پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ میر کی نظر ایک طرف اردو شاعری کی پوری روایت پر۔ انسانی نفسیات پر انسانوں کی محرومی پر فطرت کے حسن پر، اور سیاستِ دوراں کی شورش پر تھی تو دوسری طرف شرفِ انسانی پر، اخلاقی قیود پر، عظمتِ انسانی پر، باری تعالیٰ کی قدرت پر اور اپنے عہد کی بصیرت پر اُن کی گہری نگاہ تھی۔ عبداللہ جاوید صاحب نے انھیں بنیادوں پر میر کو سمجھنے

اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ میر کو زبان وبیان پر قدرت حاصل تھی ہر چند کہ اُن کے یہاں عہد حاضر کے مقابلے میں ایسے الفاظ اور تراکیب ملتی ہیں جو آج اجنبی نظر آتی ہیں۔ لیکن عہد حاضر کے بڑے شعراء نے بعض غزلیں تبرّ گا میر کی زبان میں بھی لکھی ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بعض اشعار میں میر کا اندازِ بیان اجنبی ہو کر بھی اتنا دل کش تھا کہ لوگ بے اختیار ہو کر آج بھی اس انداز میں غزل کہنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ جاوید صاحب نے کیسی خوبصورت اور دل میں اُتر جانے والی بات کہی ہے۔ ''یہ غلط ہے کہ وُہ آہ کے شاعر تھے وہ نہ تو ''آہ'' کے شاعر تھے نہ ''واہ'' کے وہ زندگی کے شاعر تھے'' وہ زندگی سے لطف لینا جانتے بھی تھے۔

چلتے ہو تو چمن کو چلئے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے ڈال نئے ہیں پات نئے ہیں کم کم بادباراں ہے

اور لذّت غم کے سرور میں بھی ڈوب جانا چاہتے تھے۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

عبداللہ جاوید کی ''مت سہل ہمیں جانو'' پڑھ کر ہم ایک نئے میر سے آشنا ہوتے ہیں عبداللہ جاوید نے یہ کتاب لکھ کر اردو دنیا کو ایک نادر اور یادگار تحفہ دیا ہے۔ ہم اُن کی اس کاوش پر انھیں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

فرزانہ اعجاز

'بارِشناسائی'۔۔۔کچھ تأثرات

'بارشناسائی' کے مصنف جناب کرامت اللہ غوری صاحب، پاکستان کے سفیر با تدبیر ضرور رہے اور ملکوں ملکوں گھوم گھوم کر دنیا دیکھتے رہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ پڑوسی ملک ہندوستان کے 'دل' 'دلی' سے نکلنے والے اردو کے دو مشہور رسالوں 'شمع' اور بیسویں صدی کے ذریعے انڈیا میں اُردو کی دنیا میں اس مدبر قلمکار اور حساس افسانہ نگار اور شاعر کو جو شہرت اور پزیرائی ملی وہ صرف ان ہی کا حصہ تھی، اور بجا طور پر تھی دراصل ہندوستان میں پاکستان کے اردو رسائل اور اخبارات دستیاب نہیں تھے بس کبھی کبھار کرامت اللہ غوری یا قتیل شفائی قبیل کے معزز اور محترم ناموں کی ان ہی رسائل میں زیارت ہو جایا کرتی تھی۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح بھی چونکہ اچھے رسالے اور کتابیں پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں اور ہمیشہ اچھے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کی تلاش میں رہتے ہیں، سو کرامت اللہ غوری صاحب کے نام سے واقفیت رکھتے تھے، قسمت سے سلطنت آف عمان کے شہر مسقط پہنچ گئے، جہاں دوسری بہت سی نعمتوں کی طرح پاکستانی رسائل اور کتابوں کی نعمت بھی میسر آئی اور ہم پاکستان میں تخلیق ہو رہے ادب سے استفادہ حاصل کرتے رہے، پچیس سال تک متواتر ہم پاکستانی رسائل بڑے شوق سے پڑھتے رہے اور کبھی کبھی لکھے اور شائع ہوتے رہے۔ کئی بار پاکستان رشتہ داروں سے ملنے آنا جانا ہوا، ساتھ ہی مسقط میں لگا تار ہونے والے بہت اعلیٰ پیمانے کے 'انڈو پاک مشاعرے' بھی برابر سننے کو ملے ایسے مشاعرے جن میں ہندوستان سے آل احمد سرور، غلام ربانی تاباں، معین احسن جذبی تا منظر بھوپالی اور راحت اندوری

پاکستان سے احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، پروین شاکر، اور بھی بہت مشہور شعراء کو سنا، ایسے ہی ایک مشاعرے میں 'شیرٹن ہوٹل کے پچھلے لان میں جناب کرامت اللہ غوری اور ان کی اہلیہ عابدہ کرامت صاحبہ کو سنا اور اس صحرا میں سانس لیتی ہماری روح کی ادبی پیاس بھی بجھی اچھی شاعری کا کمال یہی ہے کہ وہ روح کو چھو جاتی ہے اور اچھے اشعار کا سرور برسوں قائم رہتا ہے۔

ہمارا اپنا خیال ہے کہ مشاعروں سے زیادہ اچھا کلام ادبی نشستوں میں سننے میں لطف آتا اور شعرا کو بھی سنجیدگی سے اپنا معیاری کلام سنانے کے موقع ملتے ہوں گے، شیرٹن کے مشاعرے کے بعد ایک ایسی ہی نشست میں بھی ہم نے کرامت صاحب اور انکی اہلیہ کا کلام سنا۔ مختلف ممالک کے سفر تو بہت دیکھے اپنے ملک کے بھی اور دوسرے ممالک کے بھی لیکن ایسا بہت کم نظر آیا کہ سفیر با تدبیر اپنے سرکاری عہدے پر بھی متمکن ہوں اور ہاتھوں میں قلم بھی سنبھالے رہیں اور بہت باریک بینی سے سیاسی دنیا کے 'راز نیاز' اور 'ساز باز' دیکھتے بھی رہیں اور عوام الناس کو ایسے کچھ رازوں سے روشناس بھی کراتے رہیں جو عام طور پر عام لوگوں سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں یا پوشیدہ رکھے جاتے ہو۔ تاریخ گونگی نہیں ہوتی برسوں بعد بھی آپنے اندر چھپے رازوں کو بتا دیتی ہے۔ اس لیے ہر زمانے میں لکھے جانے والی تاریخی دستاویزات ہر صورت میں اہم ہوا کرتی ہیں خواہ وہ کسی کو پسند آئیں یا نہ آئیں۔ خاص طور سے ایسے لوگوں کے قلم سے لکھی گئی تاریخ جو سیاسی ایوانوں میں ایک اہم مقام بھی رکھتے ہوں، ایسی ہی ایک اہم شخصیت کی کتاب آج کل ہندوستان میں بھی بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے، اتفاق کی بات کہ کچھ عرصہ پہلے لکھنؤ سے نکلنے والے اردو کے ایک مشہور روزنامے کے اتوار میگزین میں بی بی سی لندن کے ایک معتبر رکن جناب رضا علی عابدی صاحب کا ایک مضمون نظر نواز ہوا جن میں سابق سفیر پاکستان جناب کرامت اللہ غوری کی کتاب 'بار شناسائی' کا ذکر اس ضمن میں تھا کہ کتاب بہت اچھی ہے پھر کراچی پاکستان کی ایک ادب نواز ہستی جناب راشد اشرف صاحب نے حسب سابق، علی گڑھ اردو فورم۔ پر بار شناسائی کے کچھ اقتباسات بھیجے، جسے پڑھ کر جی اور بھی چاہا کہ کتاب پڑھی جائے کئی وجوہات کی بنا پر یہ کتاب کافی تعطل کے بعد دلی

میں پہلے شائع ہوئی مسقط میں اب کتابیں اور رسال نہیں ملتے ہیں لیکن لوگ اپنے دوستوں کے لیے اکثر تحفے کے طور پر مشہور کتابیں لاتے ہیں ہم نے بھی حیدر آباد دکن میں چھپی ایک مشہور کتاب داوہائٹ مغل کسی سے مستعار لے کر پڑھی اور عصمت چغتائی کی وہ اک قطرۂ خون بھی۔ ہمارا نام 'فرزانہ' ضرور ہے لیکن دیوانوں کی طرح اچھی کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔

کرامت صاحب کی کتاب کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ قدرت اللہ شہاب کی کتاب 'شہاب نامہ' جیسی کوئی ضخیم کتاب ہوگی شہاب صاحب بھی اہل قلم تھے اور پرانے آئی سی ایس تھے یعنی ارباب اقتدار کے بہت قریب رہے تھے اور ایوان صدرات کے سربستہ رازوں کے امین بھی رہے تھے۔ چونکہ ہمارا اہم موضوع 'تاریخ' رہا ہے اس لیے تاریخ ساز شخصیات کے بارے میں جانتے ہیں خاص دلچسپی بھی رہتی ہے مسقط میں ہمارا ایک عزیز دوست نے ہم سے شرط لگائی کہ آپ شہاب نامہ چار دن میں پڑھ کے دکھایئے تو ہم آپ کو دعوت کھلائیں گے، شہاب نامہ ایسی دلچسپ کتاب ہم نے جو ہاتھ میں پکڑی تو دنیا مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔ اب دل چاہ رہا تھا کہ بار شناسائی بھی جلد از جلد پڑھیں، ہمارا گھریلو ماحول ادبی اور سیاسی تھا اس وہ سے اپنے ملک کی سیاست اور سیاسی لیڈران کے بارے میں برابر سنا اور پڑھا کرتے اور اکثر سے ملے بھی تھے لیکن پڑوسی ملک کی خبریں ریڈیو سے اور وہاں سے آنے والے لوگوں سے ملا کرتی تھیں ننھے سے تھے جب کان میں یہ بات پڑی کہ پاکستان کے وزیر اعظیم جناب لیاقت علی خاں کو قتل کر دیا گیا اسی ایک سیاسی خبر سے ہماری شناسائی پاکستان سے ہوئی پاکستان سے آنے والے رشتہ دار بیبیاں سونے کے زیورات سے لدی پھندی اور قیمتی ملبوسات اور عطریات سے بجی سنوری آئیں تو پاکستان کی آسودہ حالی کا اندازہ بھی ہوتا تھا اور زندگی میں پہلی بالفظ 'بلائی آمدنی' بھی ان ہی خواتین میں سے کسی سے سنا تھا ورنہ ہم تو صرف اس موٹی سی بلائی ہی کو جانتے تھے جو لکھنو والے میٹھے زردے یا سیویوں پر ڈال کر یا کشمیری چائے میں مل کر کھاتے تھے۔

انیس سو اٹھاون میں ہماری پھوپھی اپنی پہلی زچگی کے لیے لکھنؤ آئی تھیں جب پاکستان میں

مارشل لا لگا اور صدر ایوب نے اقتدار سنبھالا پہلی بار 'مارشل لا' کا لفظ سنا تو ابو سے پوچھا۔۔۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ تب ہی سنا تھا کہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم اسکندر مرزا اور ان کی بیگم جب ملک چھوڑ کر جارہے تھے تو بیگم صاحبہ کے گلے میں نولکھا ہار تھا جو کسی فوجی افسر نے کھینچ لیا تھا۔ واللہ اعلم۔ پھر صدر ایوب کے زمانے میں سن پینسٹھ کی انڈو پاک جنگ ہوئی، تاشقند معاہدہ ہوا اور تاشقند ہی میں ہندوستانی وزیر اعظم لال بہادر شاستری جی کا اچانک انتقال ہو گیا اور پاکستان کے صدر ایوب نے شاستری جی کے جنازے کو کندھا بھی دیا صدر ایوب جب کبھی میرٹھ میں ہوتے تھے تو کنٹونمنٹ میں بنی مشہور کوٹھی 'معصوم ولا' میں جاتے تھے اتفاق کی بات کہ جب صدر ایوب کے انتقال کی خبر ملی تو ہم میرٹھ کی اسی کوٹھی 'معصوم ولا' کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے کوٹھی کے مالکوں سے صدر ایوب ہی کی بات کر رہے تھے۔

کرامت صاحب کی کتاب 'بار شناسائی' پڑھ کر گزرا زمانہ آنکھوں کے آگے آتا جارہا ہے۔ کیونکہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب ہم جیسے بہت سے لوگ سانس لے رہے تھے اور لے رہے ہیں۔ صدر ایوب کا زوال، یحییٰ خاں، ذوالفقار علی بھٹو اور ٹکا خان کا عروج سن اکہتر کی انڈو پاک جنگ، شملہ معاہدے کے لیے بھٹو کے ساتھ ان کی بیٹی بینظیر کا آنا اور ہندوستانی فلم میکر آئی ایس جوہر کا بینظیر کو فلم میں کام کی آفر کرنا ہندوستان ہی میں سنجیدہ لوگوں کو یہ آفر ناگوار گزرنا، بھٹو کا جیل جانا، ضیاالحق کا اقتدار سنبھالنا اور بھٹو کی پھانسی اور تب سے ایک تک کے حالات۔ آخر آخر بینظیر کا اقتدار سنبھالنا اور ایک دلاری چہیتی بیٹی اور بہن کا ایک کے بعد ایک اپنے عزیزوں باپ ایک بھائی پھر دوسرے بھائی اور پھر خود بھی خون میں نہا کر اس دار فانی سے بے وقت رخصت ہو جانا ایک دلچسپ بات یہ کہ ہم کسی شادی میں شرکت کے لیے کراچی ہوتے ہوئے لاہور جارہے تھے، مکمل تیاری تھی، شام کی فلائٹ تھی کہ اچانک دوپہر میں ہمارے بھائی نے خبر دی کہ پاکستان میں نواز شریف کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا ہے اور فوج نے اقتدار سنبھال لیا ہے، ہم نے سوچا وہ مذاق کر رہا ہے لیکن بعض باتیں حقیقت میں بہت خطرناک ہوتی ہیں اور قوموں کی تقدیر سے کھلواڑ ثابت

ہوتی ہیں۔

اگرچہ اب ٹی وی اور کمپیوٹر کی وجہ سے دنیا بہت سمٹ گئی ہے اور دنیا کے ہر گوشے کی خبر آن واحد میں معلوم ہو جاتی ہے، لیکن پھر بھی ایسی کتابیں جن میں ان لوگوں کے تذکرے ہوں جو آسمان سیاست کے روشن ستارے رہے ہوں یا یوں آج بھی اہمیت رکھتی ہیں، محترم کرامت اللہ غوری صاحب کے قلم میں واقعی اللہ کی کرامت ضرور شامل ہے۔ ایسا لگتا ہے:

دیکھنا تحریر کی ندرت کہ جو اُس نے لکھا — لوگ یہ سمجھے کہ گویا یہ بھی اُن کے دل میں ہے

نورین طلعت عروبہ

حمدِ باری تعالیٰ

جو بھی لکھیں وہی کم ہے تری زیبائی پر
حرفِ توصیف میسّر نہیں یکتائی پر !!

دیکھتے ہیں جو ترے گھر کی تجلّی اِس سے
پیار آتا ہے ہمیں اپنی ہی بینائی پر

صُورتِ خانۂ کعبہ ، اے گلابِ اسود
باغِ ہستی ہے نچھاور تری رعنائی پر

تھامتی ہے تری رحمت اسے آگے آکر
ناز کرتا ہے مُسلمان پذیرائی پر !

مُلتزِم اس کی رسائی میں کیا ہے تُو نے
کیسے آ جائے کوئی غم ترے شیدائی پر

جس میں رحمٰن کے اذکار مرے ساتھ رہیں
محفلیں واردوں اُس گوشۂ تنہائی پر

اپنے محبوب کی اُمّت کو ظفریابی دے
جو بھی دُشمن ہے وُہ مجبور ہو پسپائی پر

شفق ہاشمی

مناجات

تار تار اپنی قبائیں مولا
اور بے رحم ہوائیں مولا

کج ادائی وہی اغیار کی ہے
اور اپنوں کی جفائیں مولا

جز ترے سب سے امیدیں باندھیں
تجھ سوا سب سے وائیں مولا

آسرا تیری عنایات کا ہے
اور پیہم ہیں خطائیں مولا

بے ہنر اپنی ادائیں آقا
بے اثر اپنی دعائیں مولا

تیرے میزان میں بے وقعت ہیں
اپنی ناکام صدائیں مولا

بھیج دے اپنے گنہگاروں پر
اپنی رحمت کی گھٹائیں مولا

سُرخرو کر دے شفق کو اپنے
ہوں قبول اس کی دعائیں مولا

تنویر پھول

حمد

دو عالم پہ تیرا کرم دیکھتے ہیں — بصیرت کی آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں
پکارا تجھے مرکزِ دل سے جس دم — معاً اپنی پلکوں کو نم دیکھتے ہیں
نہیں ہم ہیں مایوس رحمت سے تیری — فلک کی طرف دم بدم دیکھتے ہیں
ترے سامنے جو ہُوا سر فگندہ — اُسی فرد کو محترم دیکھتے ہیں
سکھایا قلم سے ہمیں علم تُو نے[1] — تو ہم ربط علم و قلم دیکھتے ہیں
تُو رزّاق ہے، اس زمیں پر بہر جا — ترا خوانِ یغما بہم دیکھتے ہیں
عطا ہیں تری مرغ و ماہی خدایا! — کبھی آگے لحمِ غنم[2] دیکھتے ہیں
ہمیں بار بار اُن کے ہمراہ کر دے — جو شہرِ شفیع الاممؐ دیکھتے ہیں

ق

مقدّم ہے تیری رضا جن کو ہر دم — نہ جو راہ کے پیچ و خم دیکھتے ہیں
جو ہر کام کرنے سے پہلے ہمیشہ — شہ دیںؐ کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

تری حمد میں پھول رطب اللساں ہے
"خیابان خیاباں ارم دیکھتے ہیں"

۱۔ سورہ علق، آیت نمبر۴ ۲۔ بکرے یا بھیڑ کا گوشت، نیز دیکھئے: سورہ واقعہ آیت نمبر ۲۱، سورہ نحل آیت نمبر ۱۴، سورہ طٰہٰ آیت نمبر ۱۸، سورہ یٰس آیت نمبر ۷۲

صابر عظیم آبادی

نعت

رنجش کے در و بام عداوت کے در و بام
مسمار کئے آپؐ نے نفرت کے در و بام

جب نعت کی خوشبو کا سفر ہوتا ہے جاری
کھل جاتے ہیں اس وقت عنایت کے در و بام

مایوس ہو کیوں آؤ مرے سائے میں آؤ
دیتے ہیں صدا قصر رسالتؐ کے در و بام

گھر ان کا معطر ہے نوازش کے گلوں سے
جو لوگ سجاتے رہے سنّت کے در و بام

دل یادِ محمدؐ سے منور ہے انھیں کا
رکھتے ہیں درخشاں جو عقیدت کے در و بام

حاصل ہے جنھیں سرورؐ عالم کی محبت
ہر وقت کھلا رکھتے ہیں مدحت کے در و بام

بنیاد میں ہے جس کی محمدؐ کا پسینہ
ہیں عطر فشاں ایسی عمارت کے در و بام

سرکارؐ کی چوکھٹ پہ کھڑا سوچ رہا ہوں
یہ روضۂ اطہر ہے کہ جنت کے در و بام

صابرؔ کو تمازت کا کوئی خوف نہیں ہے
ہیں سایہ فگن آپؐ کی رحمت کے در و بام

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال

دعوتِ فکر (نعتیہ نظم)

جب شعور و فکر پر تاریکیوں کا راج تھا
ایک ہستی، شمع کی مانند نور افشاں ہوئی
مطلعِ گیتی پہ اُبھری بن کے خورشیدِ شکوں
قاصدِ خیر و سفیرِ رحمتِ یزداں ہوئی

ارضِ تشنہ کام پر برسا سحاب نور حق
اس زمیں کو ایک انعام حسیں بخشا گیا
غرقِ گردابِ بلا تھا جب سفینہ دہر کا
ناخدائے رحمت لِلعالمیں بخشا گیا

بول! اے دلدادہ و شیدائی تہذیب نو
محوِ خواب عیش ہے چشم بصیرت کس لیے؟
ہے اگر دعوائے عرفاں تو بتا اُمّ الکتاب
طاقِ نسیاں کی بنا رکھی ہے زینت کس لیے

چھوڑ دے یا تو تضادِ قول و فعل اے ہم نفس!
یا نہ کر دعوائے حُبّ سرورِ کون و مکاں
اے عقیدت کیش! وہ میراثِ مومن کیا ہوئی
کھو چکی ہے جوہرِ تاثیر کیوں تیری زباں

ہے علاج خاطرِ ناشاد کی خواہش اگر
بے قراری کا اگر تجھ کو مدوا چاہیئے
سرورِ کونینؐ کو اپنا بنالے ناخدا
ہاں اگر تیرے سفینے کو کنارا چاہیء

پروفیسر زُہیر کنجاہی

نعت

مرا اِک اِک نفس مدحت سرا ہے
یہ سب عشقِ محمدؐ کا صِلا ہے

بہاریں ہر طرف ہیں اُنؐ کے دَم سے
چمن کا پتّا پتّا کہہ رہا ہے

اُنہیؐ کے نور سے روشن ہے دُنیا
مہ و خورشید میں اُنؐ کی ضیا ہے

کِیا کافور ہر مشکل کو میری
کرم اُنؐ کا سدا مجھ پر رہا ہے

ملا اُس کے نصیبوں کو اُجالا
جو خاکِ راہِ طیبہ ہو گیا ہے

سند اُنؐ کی غلامی کی ہے یہ بھی
کہ مُجھ سا شخص نعتیں کہہ رہا ہے

بھٹکنے کا کوئی خطرہ نہیں اب
مرے دل میں مدینہ بس گیا ہے

بلا بھیجا ہے مُجھ کو اپنے دَر پر
زُہیر اُنؐ کے کرم کی انتہا ہے

رشید آفریں

نعت

رفعتوں کے گُل کھلے ہیں گلستانِ نعت میں
ایک میں بھی ہوں مسافر کاروانِ نعت میں

چاند تاروں کی طرح ہیں نعت گو سب ضوفشاں
ایک سے ہے ایک بڑھ کر آسمانِ نعت میں

جن پہ اک چشمِ کرم خیرالوریٰ کی ہو گئی
پا گئے منصب وہ اعلیٰ اس جہانِ نعت میں

جس طرح شاملِ حریمِ نعت میں کچھ لوگ ہیں
کاش میں بھی ہوں شریک اس داستانِ نعت میں

ہم نشیں! غنچے کھلیں گے سب دلوں کے آخرش
دیکھ لینا اس بہارِ جاودانِ نعت میں

دھوپ کی نگری میں لاکھوں نعت کے رسیا بھی ہیں
جو سکوں پاتے ہیں دل کا سائبانِ نعت میں

روح و دِل مسحور ہوں اک والہانہ کیف سے
جب سرورِ سرمدی پائیں بیانِ نعت میں

سیّد حبیب اللہ بخاری

نعت

آپؐ جب آئے تو آیا اس جہاں میں انقلاب
آپؐ کی رحمت سے عالم ہو گیا پھر فیضیاب

نکبت و ظلم و جہالت کے اندھیرے چھٹ گئے
نور پھیلا ہر طرف اور شب نے پھر اُلٹا نقاب

ربّ واحد سے شناسا ہو گئے دنیا کے لوگ
آگیا پھر بت پرستوں میں نمایاں انقلاب

رنگ و نکہت کا حسیں ماحول پیدا ہو گیا
گلشنِ گیتی پہ برسا جب بہاروں کا سحاب

سربلند و حق شناس و دین کے سردار تھے
تھا زمانے میں ہمارا نائبِ حق کا خطاب

آج کیوں مجبور ہیں، مقہور ہیں، معذور ہیں
ظاہر و باطن ہوئے ہیں غرقِ عصیان و عتاب

اے نبی محتشمؐ ہو ہم پہ رحمت کی نظر
صاف ہو ظاہر ہمارا اور باطن بھی شتاب

اویس الحسن

نعت

ہیں عرشی بھی فرشی، فلک بھی زمیں ہے
دو عالم کا ولہا یہیں ہے یہیں ہے

یہیں سے ہے پایا غلامی میں رُتبہ
اِسی در پہ جھکتی مری یہ جبیں ہے

ملائک اُتر کر سلامی کو آئے
تجلّی کا منبع تری سر زمیں ہے

خدا کو نہ ڈھونڈو کہیں اور جا کر
جہاں پر ہیں آقاؐ خدا بھی وہیں ہے

ہماری ہو بخشش تمہارے کرم سے
ہمیں تو تمہارے کرم پہ یقیں ہے

ہے اُن کی عطا بھی عطائے الٰہی
''نہیں'' آپ کی بھی خدا کی ''نہیں'' ہے

ہو میری رسائی ترے آستاں تک
یہی میرا مذہب یہی میرا دیں ہے

ڈاکٹر فریاد آذر۔ دہلی (انڈیا)

منقبت

تشنگی ایسے لبوں کی کیا بجھا پاتا فرات
مدتوں سے خود تھا جنکی دید کا پیاسا فرات

تشنگی کو آپ اپنا امتحاں مقصود تھا
ورنہ پاکیزہ لبوں تک خود ہی آجاتا فرات

پھر وہی منظر نظر کے سامنے کیوں آگیا
کربلا، خوں ریزی، کوکفہ، تشنگی، صحرا، فرات

اب بھی ہیں صحرا کی آنکھوں سے یونہی آنسو رواں
نام ان کو دے دیے ہیں وقت نے دجلہ، فرات

سر پہ آکر رک گیا ہے آفتابِ مغربی
پی نہ جائے یہ کہیں اب سارے کا سارا فرات

شہر تھا شہروں میں اک، بغداد کہتے تھے جسے
اور دریاؤں میں آذر ایک تھا دریا فرات

سیّد تابش الوری

چراغ وفا

جفا شعار تھے حق کے خلاف صف آرا
وفا کی رسم و رہ آگہی رہی باقی
کہا کہ جس کو پلٹنا ہے وہ پلٹ جائے
بجھا چراغ مگر روشنی رہی باقی

حسین

تم نے تو اک فرات پہ پہرے بٹھائے تھے
گہرے سمندروں کا نشاں ہو گئے حسین
تم نے تو قطع کی تھی فقط اک رگ لہو
ہر اک رگِ لہو میں رواں ہو گئے حسین

مالکِ کوثر

وہ کوثر و تسنیم کے مالک ٹھہرے
پانی نہ دے کب ہے کسی دریا کی مجال
سمجھانا تھا پیاس اپنوں کی کیا ہوتی ہے؟
رکھنا ہے انہیں حشر میں پیاسوں کا خیال

عطاالرحمٰن قاضی

O

کون یہ شام ڈھلے نغمہ سرا ہونے لگا
دلِ وارستہ، گرفتارِ ہوا ہونے لگا

دیدنی تھی کفِ احساس پہ خوشبو کی پھوار
چاک اٹھے رنگ تو وابندِ قبا ہونے لگا

ایک عالم تھا سرِ خلوت جاں، رات گئے
سجدۂ شوق جو یاروں سے ادا ہونے لگا

بھول جاؤں نہ کہیں نام بھی تیرا، ڈر ہے
عکس تو آینۂ دل سے جدا ہونے لگا

ایک اک کر کے بجھے جاتے ہیں کیوں سارے چراغ
دفعتاً ابلۂ تمنا کو یہ کیا ہونے لگا

خاک پھر اُڑنے لگی معبدِ جاں میں ہر سُو
چاک پھر پیرہنِ برگِ دعا ہونے لگا

تیر سینے میں جو پیوست ہُوا، خوب ہُوا
دیدوادید کا سامان، عطا ہونے لگا

O

اسیرِ لمحۂ تشکیک ہے اِدھر مت آ
ہر ایک دل، یہاں تاریک ہے اِدھر مت آ

دھڑک رہا ہے ہر اک دل کسی اشارے پر
ہر ایک سانس یہاں بھیک ہے اِدھر مت آ

کھِلا نہ پھُول کسی شاخ پر، ہوائے بہار!
کہ حالِ دل زدگاں ٹھیک ہے اِدھر مت آ

اب اُس کی زلفِ پریشاں کو کون سلجھائے
یہاں تو حرص کی تحریک ہے اِدھر مت آ

یہ شہرِ کمِ نگہباں ہے قدم قدم پہ یہاں
ہر اہلِ درد کی تضحیک ہے اِدھر مت آ

چراغِ شامِ تمنا کی خیر ہو کہ یہ دل
ہوائے مرگ کی تملیک ہے اِدھر مت آ

عطا یہ لمحۂ پرّاں تجھے خبر ہی نہیں
پھر اک سراب کے نزدیک ہے اِدھر مت آ

مضطر اکبر آبادی

O

آئنہ خانوں کی زینت بنی حیرت میری
پاس مدّت سے ہے اُن کے یہ امانت میری

بدلہ لینے کا کسی سے جو خیال آتا ہے
روک دیتی ہے مجھے بڑھ کے شرافت میری

اپنی تلوار سے میں اپنا گلا کاٹتا ہوں
میری سب سے بڑی دشمن ہے ذہانت میری

حُسن ہی حُسن تری ذات ہے اور میں ترا عکس
ہے ہی کیا اس کے سوا اور حقیقت میری

یہ بدلتے ہوئے موسم یہ برستے ہوئے رنگ
ان کا مطلوب ہوں میں اور یہ ضرورت میری

ذکر بھی باعثِ تسکینِ دل و جاں ہے مگر
دیکھتے رہنا کسی کو ہے عبادت میری

نہیں پاسنگ بھی میرا تو دو عالم مضطر
کر سکیں گے ادا کس طور وہ قیمت میری

نکلے ہی کب ہیں حلقۂ شام و سحر سے ہم
برداشت کر رہے ہیں یہ دُکھ عمر بھر سے ہم

بنتی ہے ناخوشی کا سبب بھی وہی خبر
ہوتے ہیں تھوڑی دیر کو خوش جس خبر سے ہم

کر لی ہے راہ خیر کی جس دن سے اختیار
محفوظ ہو گئے ہیں حریفوں کے شر سے ہم

بے دخل اپنے گھر سے جو ہونا پڑا ہمیں
روئے لپٹ لپٹ کے بہت بام و در سے ہم

صرف ایک دل کی راہ تھی جو کام آ گئی
پہنچے نہ اُس تک اور کسی رہ گزر سے ہم

وہ خود بھڑک کے بجھنے ہی والا تھا جب تو پھر
کیا کرتے کسبِ نور چراغِ سحر سے ہم

تعمیر گھر ہوا ہی تھا مضطر کہ ڈھے گیا
باز آئے اس تکلفِ دیوار و در سے ہم

محمد طارق غازی

○

کبھی ندیا کے تٹ گیا بادل
کبھی بستی سے ہٹ گیا بادل

جب دعا سے زبان تر نہ ہوئی
راستے سے پلٹ گیا بادل

جس نے پڑھ لی نمازِ استسقاء
شہر میں اس کے جھٹ گیا بادل

قوم کی قوم تھی ثمود مزاج
اس پہ شب میں الٹ گیا بادل

دیکھ کر اس زمیں کے نظارے
شرم کے مارے کٹ گیا بادل

آسماں پر تنی ہوئی ہے گھٹا
اور فرقوں میں بٹ گیا بادل

شوخ بارانی پہلے دکھلائی
شرم سے پھر سمٹ گیا بادل

دشت پھیلا رہا ہوا کی مثال
چاند کی طرح گھٹ گیا بادل

تم نے کیا کہہ دیا اسے طارق
کیوں اچانک ہی چھٹ گیا بادل

عطاء الرحمٰن قاضی

○

ریزہ ریزہ کسی دوری نے سمیٹا مجھ کو
کر دیا تھا تری قربت نے ادھورا مجھ کو

جانے کس شے کی طلب میں ہے یہ دل سرگرداں
جانے کیا رنگ، ہواؤں نے دکھایا مجھ کو

اک الاؤ نے کیا، نخلِ تمنا سرسبز
دشتِ بے آب میں اک آگ نے سینچا مجھ کو

چار سو یہ جو کھنچا ہے مرے، وحشت کا حصار
ہے کسی آہوئے رم خوردہ سے رشتہ مجھ کو

چھین کر دربدری، پائے طلب سے اک روز
وقت نے ہجر کی دہلیز پہ پھینکا مجھ کو

حرف آجائے مبادا تری گل کاری پر
یوں نہ اس کارِ شب و روز میں الجھا مجھ کو

سرِ محفل ہی ٹپکنے لگے آنسو کیا کیا
بات کرنے کا بھی آیا نہ سلیقہ مجھ کو

دور تک میرے تعاقب میں رہا اک سایہ
یاد ہے خود سے بچھڑنے کا وہ لمحہ مجھ کو

صابر عظیم آبادی

o o

بشر جو صاحب سیف و قلم ہے
دماغ و ذہن سے سازش نکالو
وہ دنیا کی نظر میں محترم ہے
پرائی چیز کی خواہش نکالو

ہوا کے ہونٹ شاید جل گئے ہیں
تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں
چراغ رہ گزر کی آنکھ نم ہے
تم اپنے دل میں گنجائش نکالو

مجھے کیا چاہئے اس کے علاوہ
زمیں کو تازہ دم رکھنے کی خاطر
عنایت ہے نوازش ہے کرم ہے
ہوا کے جسم سے بارش نکالو

ستارے ، چاند ، جگنو ، پھول خوشبو
ترقی کی تمنا ہے تو دل سے
یہ سب ہوتے ہوئے کیا مجھ کو غم ہے
خیال عیش و آسائش نکالو

نہ جانے کیا ہو اس کے بعد منظر
دلوں کے ناپنے کی ہے ضرورت
ابھی تو یاد اس کی ہم قدم ہے
کوئی ترکیب پیمائش نکالو

لگا لیتا ہوں دنیا کا پتہ میں
تم اپنے ذہن کی گہرائیوں سے
مرا یہ شیشۂ دل جام جم ہے
کبھی تو گوہر دانش نکالو

مرے پہلو سے اٹھ کر جانے والے
تعلق کا کنول کھلنے سے پہلے
یہیں بیٹھو تمہیں میری قسم ہے
دلوں سے کینہ و رنجش نکالو

جسے سر دینا آتا ہے وہ صابر
غزل میں رنگ بھرنا ہے تو صابر
فراز دار پر بھی محترم ہے
نئے معنی نئی بندش نکالو

پروین شیر

O

ایک آندھی سی سرِ ساحلِ جاں آئی ہے
دل نے کیا ڈوب ہی جانے کی قسم کھائی ہے

عجب انداز سے گزری ہے غمِ ہستی میں
رابطہ خود سے نہ اوروں سے شناسائی ہے

آخری وقت میں کیا جور و ستم کا رونا
اب تو شکوہ بھی مجھے باعثِ رسوائی ہے

زندگی تیری ادائیں نہ مجھے لے ڈوبیں
بس بھی کر اب تو مری جان پہ بن آئی ہے

اک عجب دور ہے یہ دور کہ جس میں ہر شخص
خود تماشا بھی ہے اور خود ہی تماشائی ہے

جان لیوا تھا بہت عہدِ خزاں سچ ہے مگر
حشر دامن میں لیے فصلِ بہار آئی ہے

جاؤ بے سود پریشان نہ ہو چارہ گرو
اب دواؤں سے طبیعت میری اُکتائی ہے

صابر عظیم آبادی

O

کھڑکیاں بند کر دو باہر کی
پھر صدا آرہی ہے صرصر کی

خون بہنے لگے تو یہ سمجھو
آبرو رہ گئی ہے پتھر کی

جتنی وسعت ہے تیری آنکھوں میں
اتنی وسعت کہاں سمندر کی

سلسلہ ٹوٹتا ہے یادوں کا
جب شکن ٹوٹتی ہے بستر کی

تشنگی ، بھوک ، مفلسی ، افلاس
ایسی حالت نہ تھی مرے گھر کی

اس کو دیکھوں تو ایسا لگتا ہے
ہو غزل جیسے اِک سخنور کی

عیش و عشرت میں لٹ گئی صابر
جو کمائی تھی زندگی بھر کی

شفق ہاشمی

O

دھوپ کنارے تنہا، گُم سُم، سایہ بھی ہے کب تک ساتھ
دیس بدیس سدھارے پنچھی، بوڑھا برگد خالی ہاتھ

گھر کے سُونے آنگن میں اب اڑتی ہے ماضی کی دھول
جانے والے لوٹ آئے ہیں بیت گئی ہے جب برسات

اپنی خاک اڑی اور اڑ کر دیکھو پہنچی کہاں کہاں
گلشن گلشن پھول کھلے ہیں، عام ہوئی اپنی سوغات

جیون کی اس بازی میں ہے کیسی ہار اور کیسی جیت
ہارے ہیں سو ہار گئے ہیں ، جیتے بھی تو بازی مات

حسن طلب کی جھولی بھی ہو ، دامن دل بھی ہم پھیلائیں
ان کے حسن کا فیض ہے جاری ، پل پل بٹتی ہے خیرات

غم کیا ڈوب گئے جو شفق ہم ، مشرق و مغرب اپنا رنگ
سورج ساتھ گیا ہے دیکھو روشن کرنے اپنی رات

ڈاکٹر سیّد قاسم جلالؔ

o

جلوت کی ہوس کیا ہے، خلوت کے تقاضے کیا
محرومِ بصیرت دل، اس راز کو سمجھے کیا

سوچوں پہ اگر پہرے بیٹھے ہوں تو پھر انساں
سوچے بھی تو سوچے کیا، بولے بھی تو بولے کیا

تنقید سے ناواقف نقاد نگارش کو
جانچے بھی تو جانچے کیا، پرکھے بھی تو پرکھے کیا

اے امن کے رکھوالو! تہذیب کے متوالو
فریاد سنو میری، سب ہو گئے بہرے کیا

غاروں کے مکینوں کو، کیسے کوئی سمجھائے؟
سورج کسے کہتے ہیں؟ ہوتے ہیں اُجالے کیا

ہر ایک مصیبت، اک عبرت کی نشانی ہے
تم اب بھی نہیں سمجھے قدرت کے اشارے کیا

سمجھے نہ کوئی تو کیوں ہم حق کی نہ دعوت دیں؟
بنجر ہوں زمینیں تو، بادل بھی نہ برسے کیا

ہم جگ میں جلالؔ اب تو خود ایک تماشا ہیں
اب بن کے تماشائی دیکھیں گے تماشے کیا

ظفر اکبرآبادی

o

جو ساتھ دیتے رہے عمر بھر فقط غم تھے
غموں سے جس نے رفاقت نبھائی وہ ہم تھے

ہمارے درد کو درماں کی احتیاج نہ تھی
جو زخم دل میں تھے اپنے وہ خود ہی مرہم تھے

ہیں یاد آج بھی وہ زندگی کی برساتیں
کہ جب نصیب ہمیں دیدہ ہائے پرنم تھے

نہ تھا ہمیں کوئی احساس ناگواری کا
مسرتوں کی طرح خوشگوار جب غم تھے

کسی کی یاد میں دل مستقل تھا کھویا ہوا
کسی کی سوچ میں دن رات گم کبھی ہم تھے

تھیں تتلیوں کی اُڑانیں نظر نواز کبھی
بہت حسین بڑے دل فریب موسم تھے

ہجوم جلوہ کبھی تھا کراں سے تابہ کراں
نظر نظر میں ظفر حیرتوں کے عالم تھے

سرور عالم راز سرور

○

کسی کی جستجو ہے اور میں ہوں
حجابِ رنگ و بو ہے اور میں ہوں

نگاہِ شرگیں ہے اور تو ہے
بیانِ آرزو ہے اور میں ہوں

متاعِ زندگی تھوڑی ہے میری
یہی اک آبرو ہے اور میں ہوں

مجھے دیر و حرم سے واسطا کیا
طوافِ کو بہ کو ہے اور میں ہوں

وفا نا آشنا تیری نظر ہے
دلِ آشفتہ خو ہے، اور میں ہوں

خدایا ! بے نیاز آرزو کر
یہی اک آرزو ہے اور میں ہوں

میں کس منزل پہ آخر آگیا ہوں
یہاں بس تو ہی تو ہے اور میں ہوں

مجھے بھاتی نہیں دُنیا کی باتیں
جہانِ حیلہ جو ہے اور میں ہوں

مجھے یوں راس آئی خود شناسی
خدا سے گفتگو ہے اور میں ہوں

مجھے فکرِ دو عالم کیوں ہو سرور
وہ میرے روبرو ہے اور میں ہوں

○

محبت پھر اس کا بیاں! اللہ اللہ!
زمیں ہو گئی آسماں ! اللہ اللہ !

ہوئی آرزو پھر جواں ! اللہ اللہ !
کوئی ہو گیا مہرباں ! اللہ اللہ !

سرِ طورِ عرفاں، یہ طوفانِ حیرت !
حجاباتِ کون و مکاں ! اللہ اللہ !

بھلا کس طرح ملتی منزل خودی کی
صنم خانۂ این و آں ! اللہ اللہ !

نہ میر اگلستان، نہ میری خدائی
مگر ہے غمِ آشیاں ! اللہ اللہ !

زمانہ کی یہ کروٹیں ! توبہ توبہ !
محبت کی یہ داستاں ! اللہ اللہ !

اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے کھو گیا میں
سرابِ یقین و گماں ! اللہ اللہ !

خدا بن گئی میری یہ خود پرستی
ہوا جب میں خود پر عیاں ! اللہ اللہ !

تمنا ، غمِ بیکسی ، نامرادی
مقاماتِ آہ و فغاں ! اللہ اللہ !

مگر زندہ ہے چار و ناچار سرور
تقاضائے دورِ جہاں ! اللہ اللہ !

پرتو روہیلہ

O

حاکموں غاصبوں کی علّت میں
وحشتیں آگئیں حقیقت میں

بند کر دینا سیدھے رستوں کا
ہو گیا لازمی حکومت میں

عدل کا خون کر رہے ہیں آپ
کون جا کر کہے عدالت میں

وہ جو فرماں روائے اعلیٰ تھے
آج پکڑے گئے بغاوت میں

مفتیِ وقت کا ہے یہ فتویٰ
قتل شامل ہوا عبادت میں

آدمی آدمی کو کافی تھا
کیوں فرشتوں کو ڈالا زحمت میں

آپ بھی چپ رہیں تو بہتر ہے
ہم بھی خاموش ہیں ندامت میں

زندگی ایک لفظ بے معنی
سوچئے کیا لکھیں عبارت میں

عہد الفت کیا تو کس سے کیا
دوست مارے گئے حماقت میں

وطن آشوب بن گئے آخر
جو قصیدے تھے تیری عظمت میں

اب جو الزام دیں تو کس کو دیں
سب ہی شامل ہیں اس شراکت میں

کھیل تو یہ ہے کٹ مریں پیدل
شاہ بیٹھا رہے حفاظت میں

اک خراشِ نفس نہیں پرتو
زخم دل بھی ہے اس کی قدرت میں

سلیم زاہد صدیقی

○

تم خود میں تراشو نئے پیکر تو مجھے کیا
بن جاؤ کسی اور کے دلبر تو مجھے کیا

رستے میں پڑا ہے کوئی پتھر تو مجھے کیا
کھاتا ہے کوئی شخص جو ٹھوکر تو مجھے کیا

تم اپنی انا سے کبھی باہر نہیں نکلے
ہے راہ میں اک سدِّ سکندر تو مجھے کیا

جب آنکھ میں وہ ذوقِ نظارہ نہیں باقی
اب روپ ترا ہو بھی اجاگر تو مجھے کیا

جب آپ کی زلفیں مرے شانوں پہ نہ بکھریں
پھر رات اگر ہو بھی معطّر تو مجھے کیا

جب چل نہ سکا مجھ پہ ترے حسن کا جادو
دنیا کو کیا تو نے مسخّر تو مجھے کیا

ناصح ہوں نہ زاہد ہوں نہ قاضی ہوں نہ واعظ
چھلکیں کسی میخانے میں ساغر تو مجھے کیا

پرتو روہیلہ

○

ہر سایۂ خیف سے ڈرتا اِدھر اُدھر
پھرتا ہوں بستیوں سے گزرتا ادھر اُدھر

اب اپنے گھر میں بند ہوں محفوظ تو ہوں دوست
ورنہ سڑک پہ راہ میں مرتا اِدھر اُدھر

اچھا ہوا کہ ساتھ ہی خود لے کے مر گیا
ورنہ گنہ کا بار میں دھرتا اِدھر اُدھر

مٹ جائیں اپنی آنکھ میں جس رخ کے خدّ و خال
کس آئینے میں جا کے سنورتا ادھر اُدھر

بگڑا ہوا تھا روز ازل سے مرا نصیب
دو چار دن میں کیسے سدھرتا اِدھر اُدھر

غالب ہی بن کے رہ گیا اک غنچہ نگاہ
ورنہ گل اور بھی ہیں کترتا اِدھر اُدھر

جمعیت دروں جو رہا مطمحِ حیات
پرتو رہا سدا میں بکھرتا اِدھر اُدھر

تنویر پھول (امریکہ)

O

خالق کا مخلوق پہ اپنی بے شک ہے احسان بہت
رحم و کرم ہر بندے پر ہے، مالک ہے منّان بہت

خلق میں اشرف اس کو بنایا، ظالم ہے انسان بہت
کرتا ہے یہ ناشکری اور نعمت کا کفران بہت

انسانوں کی اس بستی میں ہم کو ملے حیوان بہت
نام بظاہر انساں جیسے، اندر سے شیطان بہت

دل آزاری جرم بڑا ہے، اس سے مولا ہے ناراض
کعبۂ دل انساں کا نہ ٹوٹے رکھنا اس کا دھیان بہت

باقی کی تخلیق ہے فانی، سب کا ہے مقسوم اجل
دنیا میں آباد ہوئے جاتے ہیں قبرستان بہت

خاک میں مل کر خاک بنے ہیں کتنے ہی شاہانِ جہاں
سر پر جن کے تاج سجا تھا، قصر تھے عالی شان بہت

یہ تو وہی انساں ہے، جس کو ہم نے نکالا تھا یاں سے
در پہ جناں کے ہم کو دیکھا، ششدر تھا رضوان بہت

پھندے سے ابلیس کے بچنا، تم کو یہ رسوا نہ کرے
دشمن ہے شیطان تمھارا، کہتا ہے قرآن بہت

فصلِ قمر میں خالقِ عالم بندوں سے کہتا جائے
قرآں سمجھو، بہرِ نصیحت ہم نے کیا آسان بہت

چٹیل میداں، ویراں صحرا اِک پُر ہول سا سناٹا
چاند پہ جائیں، چاند میں گھومیں، دل میں تھا ارمان بہت

بارِ امانت اس نے اٹھایا پیچھے ہٹے جب ارض و سما
ظالم بھی ہر چند ہے انساں، جاہل اور ناداں بہت

سچ کی راہ پہ چلنا مشکل، کون بنے یحییٰ، سقراط
بچنے کا امکان تو کم ہے، مرنے کا امکان بہت

طرزِ تغافل کا کیا کہنا، دیکھو تجاہل کا انداز
جانیں، بوجھیں اچھی طرح سے، بن جائیں انجان بہت

طور نئے، تہذیب نئی ہے لیکن سن لو میری بات
اونچی اونچی ہیں یہ دکانیں، پھیکے ہیں پکوان بہت

شور بہت سنتے تھے اس کا اپنے پہلو میں ہر آن
دل کی اس بستی کو لیکن پایا ہے ویران بہت

پتھر کے بدلے میں دعا دی، ایسا بھیجا اس نے رسولؐ
بندے ہیں سرکش اور ضدی، مشفق ہے رحمٰن بہت

باغِ سخن میں اے دل والو! پھول کا ہے انداز نیا
یوں تو سنے ہیں شعر بہت سے، چھانے ہیں دیوان بہت

انور جہاں برنی۔(ورجینیا)امریکہ

O

کبھی موجِ نرم رَو سے مرا چھن گیا کنارا
کبھی سیلِ تندرَو نے مجھے دیدیا سہارا
کبھی بحرِ غم میں مجھ کو نہ ملا کوئی کنارا
کبھی حسرتوں نے بڑھ کر مجھے دیدیا سہارا
یہ حوادثات پیہم، یہ کشاکش مسلسل
یہ گہر ہیں جن سے ہم نے رخِ زندگی سنوارا
یہی حاصلِ جہاں ہے کوئی چارہ گر سے کہدے
کہ عطائے غم ہے اس کا مجھے زندگی سے پیارا
مری حسرتوں نے آخر مجھے زندگی عطا کی
مری حسرتوں کو یارب نہ ملے کوئی کنارا
وہ اک حرفِ آرزو تھا جو نہ آسکا زباں پر
ہے وگرنہ یوں بہت کچھ مجھے گفتگو کا یارا
کبھی بحرِ غم کی زد پر رہا ذات کا سفینہ
کبھی موجِ تند خُو ہی مجھے ہو گئی کنارا
اسے کیا کہوں کہ کیا ہے مجھے کچھ خبر نہیں ہے
کوئی یاد بن گئی ہے مری زیست کا سہارا
شبِ غم کی ظلمتوں کو وہ شکست دے رہا ہے
مری زیست کے افق پر تری یاد کا ستارا

O

مری زندگی کا حاصل مرا کربِ جاودانہ
یہ حکایتِ مسلسل یہی سرخیِ فسانہ
مری زندگی کی راہیں ہوئیں تیرہ تار لیکن
نہ کوئی گلہ ہے تجھ سے نہ شکایتِ زمانہ
وہ جو آئیں بھی تو احساں، جو نہ آئیں بھی تو احساں
مرے دل کو بھا گئی ہے یہ نزاکتِ بہانہ
نہ ڈرا مآلِ گُل سے مجھے کج نگاہ ناصح
یہی لمحۂ تبسم میری زیست کا خزانہ
تیری یاد کے بہانے گنے آسماں پہ تارے
مجھے راس آگئی ہے یہ عبادتِ شبانہ
مرے جذبۂ دروں نے وہ نگہ مجھے عطا کی
کہ جدھر بھی اٹھ گئی ہے وہیں جھک گیا زمانہ
یہی غم کی آبرو ہے یہی میری آرزو ہے
وہ سنیں تو بچ نہ سمجھیں مرے درد کا فسانہ
غمِ مہ وشاں بھی مجھ کو غمِ دو جہاں بھی مجھ کو
مرا درد بیکرانہ، مرا ظرف بیکرانہ
تیری تنہا ملکیت ہے، اسے فاش کر نہ انور
وہ سنیں تو بچ نہ سمجھیں ترے درد کا فسانہ

انور شعور

○

ہم نے سینچا تھا جو اصولوں سے
بھر گیا ہے وہ باغ پھولوں سے

دل بچائے ہوئے ہے تیرا دھیان
سر میں اُٹھتے ہوئے بگولوں سے

کیا یہی افتراق سیکھا ہے
اُمتوں نے بھلا رسولوں سے

دی گلابوں نے جو چُبھن وہ چُبھن
ہم نے پائی نہیں ببولوں سے

تجربوں کا نچوڑ ہوتے ہیں
فیض اٹھایا کرو مقولوں سے

تم بھی ہو جاؤ گے فضول شعور
دوستی کی اگر فضولوں سے

○

نظر میں آپ کی قابل نہیں تھے
تو ہم سچ مچ کسی قابل نہیں تھے

ہُوئے تھے کوششوں سے لوگ قابل
کوئی پیدائشی قابل نہیں تھے

بڑی اسناد رکھتے تھے مگر شیخ
نہیں تھے، واقعی قابل نہیں تھے

سمجھ بُوجھ اور لوگوں میں بھی دیکھی
جو قابل تھے وُہی قابل نہیں تھے

بھلا ہم خود بخود قابل بنے ہیں
معاون کیا کئی قابل نہیں تھے

پڑھاتے تو شُعور اچھا تھے لیکن
سُنا ہے ، آدمی قابل نہیں تھے

کرامت بخاری

O

حادثے حق کی حمایت نہیں کرنے دیتے
گویا کچھ لوگ عبادت نہیں کرنے دیتے

کیا قیامت ہے کہ اب تو مری سرکار کے لوگ
مجھ کو نفرت سے بھی نفرت نہیں کرنے دیتے

تشنگی حد سے بڑھی جاتی ہے اہلِ دل کی
پھر بھی ساقی کی شکایت نہیں کرنے دیتے

یوں تو ہر بات کی ہوتی ہے اجازت مجھ کو
بس روایت سے بغاوت نہیں کرنے دیتے

دُور سے دیکھتی رہتی ہے وہ دُزدیدہ نظر
مجھ کو حالات زیارت نہیں کرنے دیتے

ترکِ مے تو بہت آسان ہے لیکن مجھ کو
اہلِ دل ایسی جسارت نہیں کرنے دیتے

با کرامت ہیں یہ تخلیق کے لمحے لیکن
مجھ کو مجھ سے بھی رعایت نہیں کرنے دیتے

زخم کھا کر بھی دُعا کرتے تھے
ایسے بھی لوگ ہوا کرتے تھے

سب کو آسانیاں دے کر پھر بھی
خود وہ مشکل میں رہا کرتے تھے

ہائے وہ لوگ جو سچ کی خاطر
جھوٹ کو جھوٹ کہا کرتے تھے

ہاں وہی چاک گریباں والے
ہاں وہی لوگ وفا کرتے تھے

اب تو ہر شخص ولی ہے شاید
ہم تو انساں تھے خطا کرتے تھے

رہرو راہِ محبت کتنے
روز رستے میں ملا کرتے تھے

اب اُنھیں ڈھونڈتا رہتا ہوں کہ جو
صبر کا درس دیا کرتے تھے

عقیل دانش

○

ہجومِ غم میں بھی ہم مسکرائے ہیں کیا کیا
تمھاری یاد نے غنچے کھلائے ہیں کیا کیا

یہ سوچ کر کہ کبھی تو چھٹے گی تاریکی
چراغ دل کے لہو سے جلائے ہیں کیا کیا

جو بات کہنی تھی اُن سے وہی نہ کہہ پائے
اِدھر اُدھر کے فسانے سُنائے ہیں کیا کیا

خرد تو پرورش جور و دار کرتی رہی
جنوں نے پردے نظر سے اُٹھائے ہیں کیا کیا

کسی نے دل سے دُعائیں جو دیں کبھی دانش
بتائیں کیسے کہ وہ یاد آئے ہیں کیا کیا

○

فرازِ دار سے ہم نے جو بات کی ہوگی
ہمیں یقیں ہے کہ منشورِ آگہی ہو گی

فسونِ شب سے ہراساں نہ ہو خدا کی قسم
اسی زمیں پہ کہیں صبح بھی ہوئی ہو گی

یہ کس نے دل کے در و بام کو اُجال دیا
ترے خیال فروزاں کی روشنی ہو گی

یہ سچ ہے آج نہیں ہے نہ ہو مگر کب تک
کبھی تو دنیا میں توقیر آدمی ہو گی

کہاں شکایت احباب اور کہاں دانش
نہ جانے آپ نے کس طرح بات کی ہوگی

نسیم سحر

○

بپا جنوں میں پھر اِک ایسا انقلاب کروں
کہ آفتاب کے سائے کو آفتاب کروں

سوال کس سے کروں، کس کو لاجواب کروں؟
بہت سے چہرے ہیں، مَیں کس کا انتخاب کروں

کشید کرتا ہوں راحت عذابِ ہجر سے بھی!
مِرا کمال ہے، کانٹے کو بھی گُلاب کروں

یہ چاہتا ہوں، رُخِ یار سامنے لا کر
مہ و نجوم کو محرومِ آب و تاب کروں

کسی کی سمت نہ مَیں انگلیاں اُٹھاؤں کبھی
جو صِدقِ دل سے کبھی اپنا احتساب کروں

جُدائیوں کے مراحل کا یہ تقاضا ہے
کہ اپنی آنکھ کو راوی کروں، چناب کروں

وہ مُجھ سے عہدِ وفا کا حساب مانگتا ہے
مَیں اپنے روز و شبِ غم کا کیا حساب کروں؟

ترا ہی ذکر ہو میری کتاب میں، اور پھر
مَیں یہ کتاب ترے نام انتساب کروں

عجب ہے یہ مِری خواہش تری معیّت میں
کہ جیتے جاگتے منظر بھی خواب خواب کروں

مَیں اُس کی یاد کی دستک سے جاگ اُٹھوں گا
اس انتظار میں نیند اپنی کیوں خراب کروں

مطالعے کے جنون میں یہ چاہتا ہوں نسیم
تمام عُمر رُخِ یار کو کتاب کروں

صوفیہ انجم تاج (امریکہ)

O

تری یاد جو مرے دل میں ہے بس اسی کی جلوہ گری رہی
مرا غم بھی تازہ بہ تازہ ہے مری شاخ فن بھی ہری رہی

میں نے اپنے پردۂ شعر میں تجھے اس ہنر سے چھپا لیا
کہ غزل کہی تو ہر اک غزل تری خوشبوؤں سے بھری رہی

یہی زندگی مری زندگی یہی زندگی مری موت ہے
تیری یاد بن گئی اک چھری جو میرے گلے پہ دھری رہی

تجھے شوق میرے کلام سے تجھے پیار میرے ہنر سے تھا
تجھے اپنا میں نہ بنا سکی یہی میری بے ہنری رہی

میں فریفتہ ترے ناز پر میں نثار تیرے نیاز پر
تیری ہر ادا میں فریب تھا مجھے جس کی بے خبری رہی

وہ دن بھی صوفیہ آئیں گے کہ خوشی کی بزم سجائیں گے
وہ جو میرے دل میں تھی آرزو وہ یونہی دھری کی دھری رہی

فریدہ لاکھانی (سڈنی، آسٹریلیا)

O

راحت کی دے بشارت شاید خیال تیرا
لمحوں کے کرب میں ہے عکس جمال تیرا

کیا تیری چشم نے بھی اب اعتبار کھویا
مبہم سا لگ رہا ہے ہر اِک سوال تیرا

مجھ سے چھپا رہا ہے تو حال اپنا لیکن
آئینہ جان لے گا جو کچھ ہے حال تیرا

زنجیر پا ہوئی ہیں مجبوریاں ہماری
تقدیر میں نہیں ہے شاید وصال تیرا

ہوتا ہے ہر تغیر منشائے رب سے پیدا
وہ ہو کمال میرا، یا ہو کمال تیرا

تیری طلب کے جذبے پاکیزہ تر ہیں پھر بھی
حالات کہہ رہے ہیں ملنا محال تیرا

نوید سروش

O

ہم تو جب بھی کسی سے ملتے ہیں
سادگی۔ خوش دلی سے ملتے ہیں

سلسلے سب سیاہ راتوں کے
صبح کی روشنی سے ملتے ہیں

دل کا عالم عجیب ہوتا ہے
جب کسی اجنبی سے ملتے ہیں

میں اُنھیں بھی گلے لگاتا ہوں
دوست جو برہمی سے ملتے ہیں

جو مرے ساتھ ساتھ چلتے تھے
آج کیوں بے رُخی سے ملتے ہیں

شکر ہے ہم سے مل لیے ہیں سروش
ورنہ وہ کب کسی سے ملتے ہیں

محمد طارق غازی

براہیم

سوچ مشغول ہے پھر ذہن کی تنہائی میں

O

آگ ہی آگ ہے ہر سمت، گلستاں معدوم
لوٹ آتی ہے مناروں سے صدائے مظلوم

O

ارضِ احساں کو مٹاتا ہوا ابلیسی ہجوم
سبز خطوں کے خزانوں سے مسائل محروم
ریگِ جیزہ پہ پھر آسودۂ اہرام ہموم
رائے سینا کے اگن لوک پہ وحشت مرقوم
قصر بیضا کی منڈیروں پہ کبوتر نما بوم
کلکِ صرصر کی صریروں میں ہے تقدیر سدوم

O

بُرجِ بابل کے مکینوں کو خبر ہے کہ نہیں
تھا بہت ناز مگر شانوں پہ سر ہے کہ نہیں

O

سوچ پھیلی رہی احساس کی پہنائی میں

O

حجرۂ ذہن میں بے چین عناصر کا ضمیر
رمزِ تکوین سے اشیاء کی بدلتی تقدیر
روح کی راہ ہے اقطار جہاں کی تسخیر

O

قلم و نون سے لکھی ہوئی زندہ تحریر
خواب سے پہلے نگاہوں پہ ہویدا تعبیر

O

نارِ تخریب میں تعمیر کا، ترتیب کا خواب
نئی ملت، نئے انسان کی تہذیب کا خواب

O

سرِ عنواں ہے ابھی یا کہیں مضمون میں ہے؟
افقِ ذکر میں یا خطبۂ مسنون میں ہے؟

O

ایک سرگوشی سی کچھ کوئے امامت میں تو ہے

O

ابھی کچھ دیر اُدھر صورِ قیامت میں تو ہے
سوچ زندہ ابھی ویرانۂ امت میں تو ہے
ابھی ویرانۂ امت میں ہے ملت باقی
ابھی پہچان براہیم کی ملت میں تو ہے

O

راہ کا نقشہ اسی نسخۂ ترمیم میں ہے
کہیئے؛ کیا اگلا قدم جادۂ تسلیم میں ہے؟
کوثا میں، مکہ میں حرّاں میں، جبرون☆ میں ہے؟
سوچئے، سوچئے، کیا ذہنِ براہیم میں ہے

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقامات ہجرت

شفق ہاشمی

یہی رہا جو نظامِ گلشن

یہی رہا جو نظامِ گلشن نہ تم رہو گے ، نہ ہم رہیں گے
نہ تاج ہوگا نہ تخت ہوگا نہ جام ہوگا نہ جم رہیں گے

نہ ناوکِ نیم کش رہے گا نہ زُلف کے پیچ وخم رہیں گے
فسانۂ شامِ غم رہے گا، بلاکشانِ اَلَم رہیں گے

ہمیں یہ فرصت کہاں کہ زخموں کا اپنے گن گن حساب رکھیں
تمہارے تیر و تفنگ ہاں اب ہمارے زیرِ قدم رہیں گے

ہم اپنے صحرائے کربلا میں سپاہ باطل سے پنجہ زن ہیں
صدائے تکبیر سے ہماری بلند حق کے علم رہینگے

اٹھو کہ طرزِ کہن بدل دیں، بڑھو کہ ظالم کا سر کچل دیں
دیارِ الفت میں اور کب تک سِتم گروں کے سِتم رہیں گے

لہو جو اس راہ میں بہے گا حیاتِ نَو کی نوید ہوگا
طلوعِ صبحِ نوید ہوگی، چمن میں گل تازہ دم رہیں گے

یہ جادۂ اہلِ حق ہے، اس میں قدم قدم ہے نشانِ منزل
جو قافلے ہم سے آملیں گے وہی یہاں محترم رہیں گے

شہادتوں کا یہ کارواں اب جو چل پڑا ہے کہاں رکے گا
سروں کی ہر فصل سے ہُویدا، نئے سروں کے علَم رہیں گے

گدائے کوئے حبیبؐ ہیں ہم ، حقیر ہم کو نہ جانیئے گا
شفق ہے منزل ریاضِ طیبہ رواں طیورِ حرم رہیں گے

اویس جعفری سیاٹل۔ (امریکہ)

"لفظ" ماخوذ

عظیم ترک صوفی شاعر یونس ایمرے

(۱۲۳۸ء۔۔۔۱۳۲۰)

کبھی یہ قطرہ ، کبھی سمندر
یہ سنگ ریزہ ، کبھی یہ گوہر
یہ گاہ ذرہ ، یہ گاہ صحرا
کبھی پَر کاہ بھی یہی ہے
کبھی یہی خار و تیر و نشتر

کمال مہلک ، تمام قاتل
کبھی یہی جرعۂ ہلاہل
کبھی یہ آبِ بقا کا مژدہ
کبھی یہ تریاق اور مرہم
کبھی خزاں یہ ، کبھی زمستاں
یہ فصلِ گل ، موسمِ بہاراں
کبھی یہ برکھا ، کبھی یہ شبنم
کبھی یہ سنبل، کبھی یہ ریحاں
کبھی یہ نرگس، کبھی یہ سوسن
کبھی یہ لالہ ، کبھی یہ گلشن
یہ جنگ و پیکار اور عداوت
یہ صلح اور آشتی، اخوت
یہ "لفظ" تم کنجِ جاں میں رکھو
تم آب دو اس کو ، اور سوچو
نہ ہو ضرورت ، کبھی نہ بولو
اور اس سے پہلے کہ منہ کو کھولو
خرد کی میزاں میں اس کو تولو
کہ ایک احمق کے واسطے تو
یہی جہنم کی رہگزر ہے
اور ایک محتاط اور عاقل
جو حرمت لفظ جانتا ہے
یہ اس کا انعامِ معتبر ہے
کہ اس کا رضوان منتظر ہے
جہانِ گفتار کا نگیں ہے
وہ باغِ فردوس کا مکیں ہے
بس آخری بات ایک یونس

یہ چلتے چلتے تمہیں بتادوں
کہ طاقتِ لفظ بے بدل ہے
اور حیف و افسوس
"میں" وہ اک لفظ ہے کہ جس نے
جدا مجھے "اُس" سے کر دیا ہے

معظم سعید

جنت کے پھول

(سانحۂ پشاور کے تناظر میں)

بہت پیاری مری امی
کتابیں اور مرا بستہ حفاظت سے
مری ٹیبل پہ رکھ دینا
میں جب جنت سے لوٹوں گا
تو پھر مجھ کو
"جہاد فی سبیل اللہ" پر مضمون لکھنا ہے
مجھے تاریخ پاکستان کیا اسباق پڑھنے ہیں
مرے استاد کہتے ہیں
سلیبس میں
دونوں "لازمی" مضمون ٹھہرے ہیں
مجھے ڈر ہے۔۔کہ میں ان میں کہیں نہ فیل ہو جاؤں
تو میری پیاری امی تم
مرا بستہ حفاظت سے مری ٹیبل پہ رکھ دینا
مرے بستے پہ جو یہ سرخ دھبے ہیں
تم ان کی فکر مت کرنا

یہ جنت کے مہکتے پھول ہیں جن میں
قیامت تک
مری تصویر ابھرے گی
جسے تم چھو نہیں سکتیں
مگر۔۔تم چوم سکتی ہو
تو ان دھبوں سے مت ڈرنا
فقط۔۔۔بستہ حفاظت سے مری ٹیبل پہ رکھ دینا

پروفیسر خیال آفاقی

شانِ بے نیازی

بے نیازی گُل بداماں، اور ہوس آتش فشاں
بے نیازی کی زمیں کو چومتا ہے آسماں

بے نیازی زیست کا حاصل ہوس محرومیاں
بے نیازی کو نہیں فکرِ غمِ سود و زیاں

بے نیازی آتشی اور امن کی خلدِ بریں
بے نیازی کے جہاں میں مہرباں ہی مہرباں

بے نیازی کو نہیں ہے احتیاجِ زادِ رہ
بے نیازی کو نہیں درکار کوئی کارواں

بے نیازی خود ہی اپنی ہم سفیر و ہم سفر
بے نیازی خود ہی منزل، خود ہی منزل کا نشاں

بے نیازی رازدارِ اعتبارِ آدمی
بے نیازی عزتِ نفسِ بشر کی پاسباں

بے نیازی روز و شب کی گردشوں سے بے نیاز
بے نیازی اصل میں آزاد بندوں کی نماز

بے نیازی خود گرفتہ، خود نُما، خود احتساب
بے نیازی خود ہی اپنے لفظ و معنی کی کتاب

بے نیازی کو سکوں ہے اور ہوس کو اضطراب
بے نیازی عزمِ محکم اور ہوس در در خراب

بے نیازی فکرِ تازہ، اور ہوس مردہ نظر
بے نیازی دیدۂ زندہ، ہوس صدیوں کا خواب

بے نیازی غازۂ رسم و تکلف سے بری
بے نیازی حسن آرا، جلوہ فرما، بے حجاب

بے نیازی کو نہیں خوفِ زوالِ زندگی
بے نیازی آپ اپنی زندگانی کا شباب

بے نیازی قیدِ شرق و غرب سے آزاد تر
بے نیازی ہر نفس کرتی ہے پیدا آفتاب

بے نیازی شیوۂ جمہور، سلطانی ہوس
بے نیازی شیخ سرہندی، جہانگیری ہوس

بے نیازی مردِ حُر، مردِ قلندر کا اصول
بے نیازی کے لیے ہے قیصر و کسریٰ بھی دھول

بے نیازی کے لیے غارِ حرا بھی جیسے پھول
بے نیازی کو صفا کی سختیاں بھی ہیں قبول

بے نیازی بخشتی ہے بدر میں فتحِ مبیں
طمع کرتی ہے احد میں روحِ احمدؐ کو ملول

بے نیازی شانِ حق ہے چہرۂ باطل ہوس
بے نیازی سعیِ حاصل، سعیِ لاحاصل ہوس

پروین شیر وِنی پیگ (کینڈا)

شہرِ خموشاں

خموش بستی کے رہنے والے
زمیں کے آغوش میں ہیں سمٹے
ردائے گیتی کو جاں پہ اوڑھے
جہانِ غل سے نجات پاکر
سکوت کی نیند سو گئے ہیں
ابد کی دنیا میں کھو گئے ہیں

ہیں ختم سب وسوسے جنوں کے
نہ ڈر کوئی خواب ٹوٹنے کا
نہ درد کی کوئی ٹیس ہے اب
کہ ہو گئے ختم سلسلے سب
مسافتوں کی تھکن نہ کوئی
نہ دشتِ غم کا عذاب باقی

نہ دردِ جاناں نہ فکرِ دوراں
نہ اب ہیں سود و زیاں کے جھگڑے
دھنی ہے قسمت کی میری ماں جو
رہائی پاکر غمِ جہاں سے
سکوں کی بستی میں جا بسی ہے

شکست

جو دن چڑھا تو، جوان سورج
شباب کا ایک تاجِ زریں پہن کے نکلا
بڑے تکبر سے آسماں پر پہنچ کے
نیچے زمیں پہ دیکھا
زمیں کی ظلمت کو فتح کر کے اُسے لگا
جیسے اس نے تسخیر کر لیے ہوں سبھی اندھیرے
کہ ماہ و انجم بھی اس کے آگے
وجود اپنا گنوا چکے تھے۔ چھپے ہوئے تھے
نشے میں ڈوبا ہوا اکیلا ہی آسماں پر چمک رہا تھا
جو دن ڈھلا تو وہی تکبر سے چُور سورج
زمیں کے قدموں پہ آگرا ہے، شکست خوردہ نڈھال ہو کر
زمیں کے سینہ پہ سر ٹکائے لہو کے آنسو بہا رہا ہے
پناہ لینے زمیں کے آنچل میں منہ چھپا کر پڑا ہوا ہے
سرکتے تاریک سائے دن کو چھپا گئے تھے، پلٹ چکے ہیں
زمیں تو مادر ہے۔ روز کی طرح اس کا لہجہ
"سنا تھا واپس تم آرہے ہو
اسی لیے میں نے اپنے در کو کھلا رکھا ہے۔"

سید تابش الوری

لہو

لہو کہ تقریر بن گیا ہے
لہو کہ تحریر بن گیا ہے
لہو کہ تفسیر بن گیا ہے

لہو کہ عیسیٰ بھی ، مصطفٰے بھی
لہو کہ صدیق و مرتضٰے بھی
لہو کہ طائف بھی ، کربلا بھی

لہو محمد بھی لہو لحد بھی
لہو جنوں بھی لہو خرد بھی
لہو ازل بھی لہو ابد بھی

لہو کہ انسان کی بقا ہے
لہو کہ تاریخ میں رچا ہے
لہو کہ صدیوں سے بہہ رہا ہے

لہو کہ تاریخ میں رواں ہے
لہو کہ مظلوم کا نشاں ہے
لہو کہ ہر عہد کی زباں ہے

اسی لہو کو حشم بنائیں
اسی لہو کو قلم بنائیں
اسی لہو کو علم بنائیں

کرامت بخاری

بوڑھا وقت

بوڑھا وقت !
جواں جسموں کو بوڑھا کرنے آتا ہے
عُمر کی بڑھیا۔ ہر چہرے کے چاند میں بیٹھی چرخہ کاتتی رہتی ہے
اے دِل اے میرے افسردہ دِل
آ ؤ چلیں اُس دیس میں جس میں پیار کے چشمے پیاس بجھاتے رہتے ہیں
فِکرِ نو کا نور برستا رہتا ہے
سارے لوگ جواں جسموں کے پھول اُگاتے رہتے ہیں
اے دِل ! میں نے یہ بھی سُنا ہے
تو اُس دیس کے ہر رستے سے واقف ہے
آ ؤنا ، آ ؤنا ! اُس دیس چلیں ہم
جس میں وقت ٹھہر کر پوچھے کب رُکنا ہے کب چلنا ہے
اے دِل ! اے میرے افسردہ دِل

صوفیہ انجم تاج

ایک سوال

اگر میں ازل سے
نمودِ سحر کی تمنا کو اپنی رگ جاں میں
پیوست کر کے جو حاکم کے قول اور قرار اور وعدوں پہ
خوابوں کی گٹھری سنبھالے جھلستی زمیں پہ چلی جا رہی ہوں
میں سارے دکھوں کو سہے جا رہی ہوں
تو آخر یہ کب تک
لہو کے یہ منظر تو ماؤں کی گودی سے
لال و گہر اور دبی سسکیوں کو دہکتی زمیں میں بھسم کر رہے ہیں
وہ سر کھولے بے سدھ سلگتی ہی مردہ سی
ہر سمت کھنچتی چلی جا رہی ہیں
کسی کو کسی کی خبر تک نہیں ہے
تو کیا آرزو کی یہی وہ سحر ہے!
بہت سارے آدھے ادھورے سے الفاظ
دہشت سے ڈوبے ہوئے سسکیوں میں ہر اک سمت بکھرے پڑے ہیں
یہ سب پو پھٹنے سے ہی سڑکوں پہ ٹوٹی سی ہانڈی کے مانند
دھوئیں کی فضا میں
جو اوندھے پڑے ہیں وہ جاگیں گے اک دن
وہ پوچھیں گے محشر کے میداں میں تم سے
تم ہی اب بتاؤ کہ تم کیا کہو گے

اویس الحسن

میراثِ وفا!

تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کے تقدس کی قسم! ان کی پلکوں کا لرزنا نہیں دیکھا جاتا!
ان کے آنچل کے سرکنے پہ خدا خیر کرے! ان کی زلفوں کا بکھرنا نہیں دیکھا جاتا!
ایسے عالم میں کہ صحرا کا سفر ہے درپیش پائے نازک میں پڑے آج ہیں چھالے کتنے!
ان کی آنکھوں نے تو اک سمت بہائے دریا خار ہاتھوں نے خدا جانے نکالے کتنے!
دل کے جذبوں کی حرارت سے پگھلتی دنیا اُن کے آنے پہ ذرا اور پگھلتی کیوں ہے!
اس سے پہلے بھی پری نیند کی دیکھی ہم نے! آج آنکھوں میں اُترتے ہی سُلگتی کیوں ہے
سانس روکے ہوئے بیٹھے ہیں فلک پر قدسی! حُرمتِ عشق کے وارث ہیں زمیں پر دیکھو!
کہکشاؤں نے بھی دوری سے نظارہ کر کے اپنی تقدیر کو ڈھونڈا ہے یہیں پر دیکھو!

جذبۂ عشق سلامت تو سلامت ہم ہیں
وہ نہیں پاس جو راہوں میں تو غم ہی غم ہیں

اویس الحسن

دل کی باتیں

آج پھر دل پہ برس جائے گا غم کا بادل
آج پھر درد کی فصلیں بھی پنپ جائیں گی
آج دل کی یہ دعا ہے کہ ملاقات نہ ہو
ورنہ انجان نگاہیں بھی تڑپ جائیں گی

اپنے ہونٹوں سے جو بیساختہ چُھو جانے کو
اک ترا نام کہ دھیرے سے مچل جاتا ہے
پاس آکر جو گزر جائے ہوا کا جھونکا
میرا دل تیرے تصوّر سے بہل جاتا ہے

تیرے قدموں سے لپٹتے ہوئے ذرّوں کی قسم
میں بھی خود کو ترے رستے میں بچھا ڈالوں گا
آج میں اپنا پڑپتا ہوا دل لایا ہوں
آج روتے ہوئے تجھ کو بھی رُلا ڈالوں گا

میں نے سوچا تھا کسی شام ملیں گے دونوں
رنگِ قُربت کی دھنک اپنا سماں باندھے گی
پھر گھڑی وقت کی آہستہ سے رک جائے گی
اور ہم دونوں کی خوشیوں کا نشاں باندھے گی

سحرِ نو کی ہمیں آس ملے گی کب تک
ہم جو ناکردہ گناہوں کے گناہگار ہوئے !
ہم جو بکھرے ہوئے آتے ہیں نظر آج کی رات
تیری اک دید کی حسرت کے سزاوار ہوئے !

کس قدر تیرے خیالوں میں مگن رہتا ہے
میری آنکھوں سے چھلکتا ہوا آنسو بھی تو دیکھ
اپنی ہستی سے گزر جائے نہ کوئی آکر
اس اندھیرے میں یہی سوچتا جگنو بھی تو دیکھو

کیوں تجھے ، پھر بھی گوارا نہیں دِل کی باتیں !
کیا محبت کا اشارا نہیں دِل کی باتیں !

صابر عظیم آبادی
رباعیات

ہر آن دمکتا ہے لہکتا ہے بدن
جیسے کسی لالے کا دہکتا ہے بدن
کیسے نہ معطر ہو مرے سانس کی ڈور
پھولوں کی طرح اس کا مہکتا ہے بدن

☆

دیکھی ہے ہتھیلی پہ سجائی ہوئی آگ
ہر سمت نظر آئی اگائی ہوئی آگ
یہ آگ ہے سینے میں دہکنے والی
بجھتی ہے کہاں ایسی لگائی ہوئی آگ

☆

بڑھنا ہے تمہیں آگے نہ ہمت ہارو
مل جل کے کرو کام جہاں میں یارو
انسان سے ڈرنے کی ضرورت کیا ہے
شیطان ملے تم کو تو پتھر مارو

☆

کیا کام کریں لوگ انوکھا کوئی ؟
کر جاتا ہے ہر روز تماشا کوئی
جاتے ہیں سراہے وہ زمانے بھر میں
ہوتا ہے عمل جس کا بھی اچھا کوئی

☆

تکذیب کی بڑھتی ہوئی شدت پہ نہ جا
ہر سمت سے آتی ہے صداقت کی صدا
آنے کو نہیں حرف مری حرمت پر
تو شوق سے جتنی بھی ہنسی میری اڑا

☆

طوفان اٹھانے سے نہیں مٹ سکتا
آواز دبانے سے نہیں مٹ سکتا
جو داغ ہے انسان کے دل پر کندہ
وہ داغ مٹانے سے نہیں مٹ سکتا

☆

ہیجان چھپا ہوتا ہے خاموشی میں
امکان چھپا ہوتا ہے خاموشی میں
خاموش کو خاموش نہ سمجھا جائے
طوفان چھپا ہوتا ہے خاموشی میں

☆

خلوت میں بھی جلوت کا مزہ ملتا ہے
نفرت میں بھی الفت کا مزہ ملتا ہے
انبوہ بشر سے نہ کبھی گھبراؤ
کثرت میں بھی وحدت کا مزہ ملتا ہے

☆

مظلوموں سے الفت نہیں کرتا کوئی
کمزوروں پہ شفقت نہیں کرتا کوئی
اس دور مکافات عمل میں صابر
ظالم کی مذمت نہیں کرتا کوئی

☆

کانٹوں سے نکلنے کی کوئی کر تدبیر
دنیا میں سنبھلنے کی کوئی کر تدبیر
کیوں ہاتھ پہ تو ہاتھ دھرے بیٹھا ہے
حالات بدلنے کی کوئی کر تدبیر

نقد و نظر

کتاب : غنچۂ نگاہ (شعری مجموعہ)

شاعر : سید نواب حیدر نقوی

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : زرنگار بک فاؤنڈیشن۔خیابان کالونی۔فیصل آباد

قیمت : ۵۰۰ روپے

سابقہ تین مجموعوں کے بعد سید نواب حیدر نقوی کا زیرِ نظر چوتھا شعری مجموعہ زمینِ شعر میں ان کے فکر و فن کا تسلسل ہے۔وہ فرماتے ہیں:

''اپنی جمالیاتی بصیرت اور تجربات کی روشنی میں ادبی دنیا میں اپنی تازہ کاری سے کچھ کر گزرنے کی خواہش ہے کہ نہ صرف متنِ شعر کو نئے اور پرانے استعارات اور علامات کی مدد سے بہتر طریقہ سے تخلیق کیا جائے بلکہ اس کے بطن میں معنی کی 'نادر یافتہ' پرتوں کو دریافت کیا جائے اور نت نئی ہئیتں اور تازہ بہ تازہ اسالیب واضح کیے جا سکیں۔آپ کو میری شاعری میں تلخ اور خوب صورت یادوں کی طرف مراجعت بھی نظر آئے گی لیکن مقصد ان سے ایک توانائی کشید کرنا ہے پیچھے کی طرف سفر نہیں کرنا اور انھیں کی مدد سے لمحۂ موجود کو زیادہ پُر معنی اور ثروت مند بنانا اور اِن تجربات کی روشنی میں ایک بہتر مستقبل کی طرف چلنے کی سعی مسعود کرنا ہے۔''

اِس سلسلہ میں میر انیس' غالب ، میر تقی میر، حسرت موہانی اور جگر مُرادآبادی سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں اور ان کو شعوری طور پر اپنا راہبر تسلیم کیا ہے۔''

زہے نصیب کہ شاعر نے اپنی ترجیحات فکر اور اہداف فن واضح کر کے ہمارے تجزیہ و انتقاد

کے لیے خود ہی راہ ہموار کر دی ہے نیز جن قدیم و متوسط اور جدید شعراء کے فکر و فن سے انھوں نے خوشہ چینی کی ہے اُس کی بھی نشاں دہی کر دی ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر کلام کے مطالعہ سے شاعر کے ادراک و شعور سے اُبھرنے والی فکری معنویت کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ حُسن اتفاق کہ ہماری نظر سے اُن کا قبل ازیں کہا ہوا کلام بھی ایک حد تک گزرا ہے چنانچہ شاعر کے ارتقاء پذیر شعری رویے واضح ہو کر سامنے آگئے ہیں ایک اچھی بات یہ بھی ہے کہ مطالعاتی وسعت میں بھی اضافہ اُن کی شاعری کے خد و خال بہتر بنانے میں اپنا اکردار ادا کرتا نظر آتا ہے۔ تازہ کاری جو اُن کا ہدفِ فکر ہے وہ اب اُن کے کلام میں جا بجا رنگ و آہنگ کے دریچے باز کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس تازہ کاری کو اُن کے حُسن اسلوب نے اور بھی نکھار دیا ہے کیونکہ شعراء کے کلام میں مضامین کی تکرار تو ایک معمول کی بات ہے لیکن جو چیز شاعر کے فن کو انفرادیت بخشتی ہے وہ حسنِ اُسلوب اور تازہ کاری ہے چند مثالیں:

جلتے کچھ اور بساطِ شب ہجراں پہ چراغ　　　گردشِ وقت کو جلدی تھی سحر کرنے کی

سُنے ہیں پیرہنِ شوق نوکِ خار سے بھی　　　چھوا ہے بامِ تمنا کو اوجِ دار سے بھی

سعیِ لاحاصل کا راہی کچھ تو حاصل چاہیئے　　　ڈھونڈیئے آبِ رواں ریگِ رواں ہوتے ہوئے

اُسے تو ڈوب ہی جانا ہے قلزمِ غم میں　　　دلِ حزیں کو کہاں تک بچائے جائیے گا

قیامت ہے بہارِ شوق میں بھی　　　گُلِ جاں قطرۂ شبنم کو ترسے

چشمِ بے خواب کے سہارے تھے　　　خواب جیسے بھی تھے ہمارے تھے
آج غلطیدہ خاک و خوں میں ہیں　　　جو کبھی آسماں کے تارے تھے

ہو چراغاں سرِ دیوارِ تمنا ہی سہی   چلیئے اک اور ہواؤں پہ بھروسہ ہی سہی

دل کے آنگن میں چمکتا ہوا چاند   غرفۂ شوق سے اترا ہوگا

'غنچۂ نگاہ' کے شاعر نے اپنے محرکاتِ شاعری میں کلامِ غالب کو سرِ فہرست رکھا ہے بلکہ اس کے شواہد اُن کے سابقہ شعری مجموعوں میں بھی کثرت سے ملتے ہیں ان مجموعوں کو جو عنوانات دیئے گئے ہیں اُن میں کلام غالب سے انتخاب وانتساب ایک واضح ''مغلوب الغالب'' رجحان نظر آتا ہے۔ یہ نہیں کہ ان کی فکر کلاسیکی مطالعہ کے تابع ہو کر رہ گئی ہے بلکہ شاعر کے فکری وفنی ارتقاء نے اُنھیں حرف وصوت اور معنی ومفہوم کو نت نئے پیرائے عطا کیے ہیں۔ نیز الفاظ کے دروبست پر مشاقی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ مثلاً:

شوقِ دیدار نے مجبور کیا تھا لیکن   آنکھ کو تاب نہ تھی اس پہ نظر کرنے کی

دماغ ہم کو نہیں شامِ غم منانے کا   فصیلِ جاں پہ چراغِ الم جگانے کا

مسافرانِ شب تیرگی سے پوچھا جائے   رکھا ہے ساتھ تمنا کے نوحہ گر کوئی

پردہ وہ گرایا ہے ترستی ہیں نگاہیں   کہنے کو یہ دعویٰ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

درج بالا پہلے اور آخری شعر میں جو مضمون نظم کیا گیا ہے وہ اپنے اُسلوب کے اعتبار سے شاعر کے تخلیقی ذہن کا تراشیدہ ہے لیکن معنوی لحاظ سے شاعر کی عقیدت وارادت کے رشتے غالب سے بھی ملتے ہیں اور جگر سے بھی:

خیر گئی نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں   اور بھی دور ہو گئے آکے ترے حضور میں
جگر

نظارے نے بھی کام کیاواں نقاب کا   مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی
غالب

دوسرے اور تیسرے شعر میں علی الترتیب 'دماغ' کا لفظ اولاً میر کے یہاں اور پھر غالب کے درج ذیل شعر میں ملتا ہے۔:

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

اسی طرح تیسرے شعر میں ''نوحہ گر'' کو ایک ''پیشہ ور'' کے طور پر جو عرب کے عہدِ جاہلیت سے منسوب ایک تلمیح ہے استعمال کیا گیا ہے یہ بھی نقوی صاحب کے 'دلدادۂ غالب' ہونے کا ثبوت ہے۔ غالب کا شعر ہے:

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

'غنچۂ نگاہ' میں ایک اور ایسے ہی شعر نے متوجہ کیا:

نمو کے زعم میں یہ مشتِ خاک کیا نہ بنا خدا کا شکر کہ سب کچھ بنا خدا نہ بنا

یاس یگانہ چنگیزی کہتے ہیں:

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا خدا بنے تھے یگانہ نہ مگر بنا نہ گیا

زیرِ نظر مجموعہ میں شاعر کے نقد و نظر کے انداز کو بھی مائل بہ ارتقا دیکھنے کا موقع ملا اور جہاں جہاں جواز موجود ہے وہاں نکتہ چینی بھی دیکھنے کو ملی مگر زبان و بیان کی ثقاہت کے ساتھ:

مصلحت کوشیاں نمایاں ہیں عظمتِ حرف آشکار نہیں
اے مصور تری قلمرو میں فن کے پارے میں شاہکار نہیں

پھر بہارِ شوق آئی ہے لیے فصلِ جنوں یہ غنیمت ہے شعورِ چاک دامانی بھی ہے
آگہی کے دور میں راہی حقیقت اک سراب اور نادانی کی اک صورت ہمہ دانی بھی ہے

کیسے مفہوم و معانی سے اُٹھائے پردہ　　وہ جو واقف ہی نہیں حرف کی گہرائی سے

راہی کے محبوب شاعر غالب نے اردو شاعری کے باب میں صرف ایک ہی مجموعہ پر اکتفا کیا جسے اللہ نے ابدیت عطا کی لیکن راہی نے بہمہ وجوہ اچھا کیا کہ مطلع سخن پر اُن کے چار دواوین یکے بعد دیگرے طلوع ہو رہے ہیں لیکن یہ اس لیے اچھا ہے کہ اِس دورِ نقد و نظر میں کوئی نقاد اُن کے فکری وفنی ارتقا کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اُن کے کلام میں فنی محاسن کے ساتھ ساتھ پختگی اور ژرف نگاہی کا عنصر غالب آتا جا رہا ہے۔

جب سے بہارِ شوق ہے مہمانِ آرزو　　صد چاک ہو گیا ہے گریبانِ آرزو
فقرے زبانِ درد سے کوئی ادا کرے　　ترتیب دے رہا ہوں میں دیوانِ آرزو

یہ کیا غضب ہے کوئی ہمنوا دکھائی نہ دے　　دیارِ جاں میں کوئی آشنا دکھائی نہ دے
یہ کائنات ہے روشن وجود سے اس کے　　ہے کم نگاہ وہ جس کو خدا دکھائی نہ دے
ادائے حق کی طرح دیجیے جو دینا ہے　　کہ لینے والے کو دستِ عطا دکھائی نہ دے

بیتاب دل، جزیرۂ صبر و سکوں بھی ہے　　دریائے خوں بھی ساحلِ دریائے خوں بھی ہے

ہماری فکر کی سُرعت صدا سے آگے ہے　　سماعتوں سے ورا انتہا سے آگے ہے

رات بھر تھا چراغِ جاں روشن　　دل جلا دن کی روشنی میں بھی
قربتیں فاصلے نہ بن جائیں　　فاصلے رکھیے قربتوں میں بھی

سر ہوئی منزلِ سخن لیکن　　گفتگو کی ہوئی نہ کوئی سبیل
یہ ازل سے ابد تلک کا سفر　　اور سامان کس قدر ہے قلیل

کھینچے ہیں دل کو عیش دو عالم کی لذتیں ——— اک کیفِ سرمدی ساغم معتبر میں ہے
ترکِ تعلقات کی بے منظری نہ پوچھ ——— ویراں سی روشنی کی جھلک بام و در میں ہے

جیسا کہ شاعرِ "غنچۂ نگاہ" نے لکھا ہے کہ دیگر کے علاوہ اُنھیں ایک مخصوص عقیدت جگر سے بھی ہے چنانچہ مندرجہ بالا دو اشعار جگر ہی سے اکتساب فیض کے مظہر ہیں جن کا اسی زمین میں غزل کا مطلع ہے:

کس کا خیال کونسی منزل نظر میں ہے ——— صدیاں گزر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے

زیرِ نظر مجموعہ میں تغزل میں تنوع اپنی جانب توجہ مبذول کراتا ہے جو ثبوت ہے اس بات کا کہ شاعر اُسلوب کی دلپذیری کے ساتھ روحِ غزل کو بھی پروان چڑھا رہے ہیں۔ ان اشعار پر لطیف اور کیف پرور داخلیت کی چھاپ ہے قاری کو محظوظ و متاثر ہونے کے مواقع فراہم کر دیے ہیں اس کا سہرا شاعر کی کلاسیکی ورثہ سے خوشہ چینی کے سر بھی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

امینِ سوزِ نہاں اور رفیقِ تنہائی ——— بس ایک دل ہی تھا اپنا جسے تمہارا کیا

جو زخمِ اعتبار ہے دل پر بلا کا ہے ——— کیا کیجیے یہ زخم کسی آشنا کا ہے

پروردۂ بہار کی جولانیاں نہ پوچھ ——— دامن کا پاس ہے نہ گریباں کا پاس ہے

ایسا لگتا ہے کہیں محوِ تماشا ہے کوئی ——— ورنہ یوں پردۂ احساس پہ آتا ہے کوئی

راہی صاحب کی داخلی کیفیات ایک یہ رخ بھی دیکھیے:

بستیاں آباد کرنے کو جدھر جاتا ہوں میں ——— ایسی ویرانی کا منظر ہے کہ ڈر جاتا ہوں میں
رات بھر تارے اترتے ہیں حریمِ شوق پر ——— اور جب تارے بکھرتے ہیں بکھر جاتا ہوں میں

یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ کلام راہی میں جا بجا حسیت اور عصری معنویت کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں لیکن پوری احتیاط کلام اور فنی اہتمام کے ساتھ:

ابھی دروازہ احساس کو وا ہونا ہے ابھی ہم اپنے ہی ماحول میں بیگانے ہیں
روشنی جس کو ملے جتنی ملے اُس کا نصیب شمع جلنے کے لیے مرنے کو پروانے ہیں
جو گزر گاہِ تمنا میں تھے ساتھی راہی پہنچے منزل پہ تو ایسا لگا بیگانے ہیں

خود فریبی کی ہوا ایسی چلی ہے ہر شخص اپنے ہی آپ پہ قربان ہوا جاتا ہے

نہ پوچھ اُس کی تنہائی کا عالم جو اپنے شہر میں بھی اجنبی ہے

دشتِ ناکام تمناؤں کا تا حدِ نظر کیا اِسی خوابِ پریشاں کا سزاوار ہوں میں

رشتۂ لوح و قلم ٹوٹ رہا ہو جیسے حرفِ روشن سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے

دیکھتے دیکھتے سرمایۂ جان ختم ہوا دونوں ہاتھوں سے کوئی لوٹ رہا ہو جیسے

صاحبانِ جفا کی ہے یہ دلیل ہم پہ لازم تھی حکم کی تعمیل

وحشتِ اقتدار سے ایسا عذابِ جاں میں ہوں رہتا ہوں میں زمین پر لگتا ہے آسماں میں ہوں

مراسلات

بیرسٹر سلیم قریشی۔ (لندن)

جولائی۔ستمبر ۲۰۱۴ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ سرِ ورق پر شالامار باغ کا عکس مسحور کن ہے۔ یہ تاریخ کو اُس دور میں لے جاتا ہے جہاں مغل بادشاہوں کی فنِ تعمیر اور باغات میں دلچسپی کے دلکش نمونے اُبھرتے نظر آتے ہیں۔

ہاں دکھا دے اے تصوّر پھر وہ صبح و شام تو ــــ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

ـــــــ

آپ کا اداریہ ''قومی ورثہ اور قومی تشخص بین الاقوامی تناظر میں'' برمحل اداریہ ہے جو نو مولود مملکتِ اسلامیہ کی نظریاتی اساس، تہذیب و تمدن و ثقافت و نیز قومی زبان جیسے تاریخی ورثوں کی طرف قومی اور بین الاقوامی توجہ مبذول کرانے کے لیے کوشاں ہے۔ خدا کرے ہماری حکومت اس طرف توجہ دے۔ حصہ نثر میں ''اردو زبان کے رسم الخط کے مسائل'' پر پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق آر کا مضمون جاندار اور معلومات افزا ہے جو اردو رسم الخط کے پھول اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ پاکستان میں اردو رسم الخط سے واقف لوگ رومن رسم الخط سے واقف لوگوں کی نسبت کئی گناہ زیادہ ہوں گے رسم الخط کی تبدیلی سے اردو داں اکثریت کے لیے مشکلات ہوں گی۔ اس بات کی صاحب مضمون نے بڑی اچھی طرح وضاحت کی ہے۔ تبصرہ کُتب میں حرفِ معتبر (ادبی اداریہ نویسی) پر پروفیسر غلام شبیر رانا کا تبصرہ نہایت مفصل تبصرہ ہے۔ اس میں پروفیسر موصوف نے اداریہ نویسی کے ابتدائی دور سے الاقرباء کے اداریہ نویسی کی تاریخ پر تبصرہ کیا ہے۔ آپ نے الاقرباء میں چھپنے والے اداریوں کو ''حرفِ معتبر'' میں جمع کر کے ان تاریخی اداریوں کا ریکارڈ محفوظ کر دیا ہے۔ بقول ہمدمِ دیرینہ محمود اختر سعید آپ کے اداریوں نے ایک کہنہ روایت کو نئی جہت عطا کی ہے اُمید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

حصہ نظم میں اویس جعفری صاحب کا سورۂ فاتحہ کا منظوم ترجمہ دلکش اور دلنشین ہے۔ جناب

شفق ہاشمی کی نظم ''پیامِ امروز اور ڈاکٹر سید قاسم جلال کی ''ارضِ فلسطین اور جناب پرتو روہیلہ کی غزل ۔۔۔ ' حکموں غاصبوں کی علت میں، دہشتیں آ گئیں حقیقت میں' قومی اور بین الاقوامی حالات کا عکس ہیں اور جناب عقیل دانش کا یہ شعر

سنگ باری گھر سے شیشے کے ہو لیکن سوچ کر   لوٹ بھی آتے ہیں دیواروں سے پتھر دیکھنا۔

نثر کے اور مضامین دانشورانہ تحریروں سے مزین ہیں۔ میرے اسلام آباد کے قیام کے دوران آپ کے دولت کدہ پر جن دانشوروں سے ملاقات ہوئی جن میں جناب پرتو روہیلہ، ڈاکٹر عزیز احمد ہاشمی، جناب شفیق ہاشمی اور ڈاکٹر شیر زماں نیز دیگر حضرات شامل تھے اُن کی خدمت میں براہِ کرام میرا اسلام نیاز پہنچایئے۔

مفتی لطف اللہ صاحب نے میرے ذہن پر گہرے تاثرات چھوڑے ہیں۔ بریگیڈیر جناب اقبال شفیع صاحب سے بھی سر سید میموریل سوسائٹی کے آفس میں ملاقات میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ بریگیڈیر صاحب نے ازراہِ عنایت اپنی ڈھیر ساری کتابیں عنایت کیں جو نہ صرف لندن میں میری لائبریری کی زینت بنیں گی بلکہ اُن کے رشحاتِ قلم میرے ذہن پر نقش بنے رہیں گے۔ مراسلہ طویل ہو رہا ہے اجازت چاہتا ہوں۔

منظور جنیجو۔ سیاٹل۔ (امریکہ)

ڈاک کی سست رفتاری بہرحال لاعلاج ہے اور اس سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑیگا تازہ شمارہ کافی تاخیر سے ملا اور حسبِ معمول خوشی ہوئی۔ پاکستان تاریخ میں وہ رہگزر رہی ہے جہاں سے بے شمار تہذیب وتمدن کے کارواں گزرے ہیں جن کے قدموں کے نشاں صرف مورخ اور ملک سے محبت کرنے والوں کو نظر آتے ہیں۔ آپ نے اپنے اداریہ میں جن مقامات کی نشاندہی فرمائی ہے ان کے علاوہ بھی بہت سے مقامات ایسے ہیں جن کو عالمی ورثہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر بقول آپ کے ''اربابِ خبر کی خبر لینا بہت ضروری ہے۔'' مگر یہ فرمایئے کہ ان کی خبر لینے والوں کی بھی توجہ کا مرکز

صرف اور صرف اُن کی اپنی ذات ہے جہاں ملک کی اہمیت کے بجائے ملک گیری زیادہ اہم ہو اور جہاں ایسے "پیر تسمہ پا" قوم پر مسلّط ہوں وہاں ملک وقوم کے ورثہ کا خیال بھلا کس کو آئیگا۔

ڈاکٹر قاسم جلال صاحب نے محسن احسان مرحوم کی غزل کا کیا ہی عمدہ جائزہ لیا ہے۔ محقق کے حساس ذہن نے صرف محسن کے کرب کا نہیں بلکہ اُس کی روشنی میں ایک پورے معاشرہ کے کرب کو بے نقاب کیا ہے۔ مصنف کا یہ قول "قول وفعل کے تضادات اپنی انتہا کو پہنچ کر منافقت بن جاتے ہیں۔۔" کے تحت محسن احسان کے جو اشعار نقل کیئے ہیں۔ وہ ایک طرف غاصبوں کی ریاکاریاں جنھوں نے "مقاصدِ پاکستان کو دھن، دھونس اور دھاندلی کے زور پر پسِ پشت ڈالدیا اور دوسری طرف حصول عدل کے متلاشی مجبور و مایوس عوام کی حالتِ زار کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ غلام شبیر علی رانا صاحب کی تحری بہت عرصہ بعد نظر آئی ہے۔ ابھی یہ شمارہ زیر مطالعہ ہے رسید سے جلد اطلاع اس لیے بھی دے رہا ہوں کہ مجھے دعاؤں کی ضرورت ہے ایک ہفتہ شفاخانہ میں داخل رہا دل کے سنبھلنے کا منتظر و آرزومند ہوں خوش رہیئے، اور ان کو ار کو میر اسلام پہنچا دیجئے۔

قمر وراثت ساؤتھ کیرولائنا۔ (امریکہ)

۲۰۱۳ء کا سالنامہ ڈاک میں گم ہو گیا تھا آپ نے دوبارہ زحمت کی شکریہ! الاقرباء میرے لیے ایک مشکبار گلدستہ ہے جس میں نثر ونظم کی متنوع خوشبو رچی بسی ہے۔ تازہ تر شمارہ کے اداریہ میں ارباب اختیار کی ذہنی کنگالی اپنی ثقافت اور زبان سے مجرمانہ اعراض، ڈاکٹر خلیل طوقار کی اردو رسم الخط کی حمایت میں مدلل، لاجواب، مبنی برحق وکالت اور ڈاکٹر قاسم جلال کی محسن احسان کی غزل کے فکری وفنی جائزہ میں ملک کی حبس زدہ اور مسموم فضا میں راہنماؤں کے بھیس میں خود پرست مریض راہزنوں کا شب خون اور عوام کے مصائب و مسائل کی ختم نہ ہونے والی داستان۔۔۔ ان تینوں تحریروں میں غضب کی تحیّر کن قرابت داری ہے اس کا اندازہ ان کے مصنفین کو نہ ہوگا۔

ڈاکٹر آصف طارق انسانی نفسیات کے نہ صرف نبض شناس ہیں بلکہ اپنے افسانوں میں جو محاورے استعمال کرتے ہیں وہ ہماری گم گشتہ معاشرت کے دلفریب عکاس ہیں مثلاً "گھر کاٹنے کو

دوڑ تا، لشتم پشتم، بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، ہتھیلی پر سرسوں جمالی، آبراجمان ہوئیں بولتے جبڑے دکھ رہے تھے، ادھار کھائے بیٹھا تھا، اور تنہائی کا جن بوتل سے باہر آگیا''۔۔۔ کے انجام تک انھوں نے اپنے قاری کے ذہن کو کس مہارت سے ڈرامائی تعلیق اور تشویش میں رکھا۔ بحیثیت افسانہ نگار یہ اُن کی سحر کاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ شمع سید کا افسانہ 'خالہ شبو' ایسی ہی زبان اور محاورں سے مزین ہے۔ عنوان ہی ہمارے سماج کے کرداروں میں آپ اپنی شناخت ہے۔ ڈاکٹر اعجاز الدین رحمت علی صاحب کی کہانی ہماری گنگا جمنی تہذیب کے پس منظر کی کامیاب تصویر کشی ہے۔ بے شمار الفاظ جو کہانی کے تانے بانے خوبصورتی سے پروئے ہوئے ہیں غالباً صرف برصغیر کے دیہاتوں میں اب بھی رائج ہوں، یہاں مغرب میں اُنھیں پڑھتے ہوئے ایسا لگا جیسے کوئی گمشدہ دولت ہاتھ آگئی ہو۔ ڈاکٹر موصوف ایک کامیاب مُصوّر نقش نگار ہیں، ذرا یہ منظر کشی ملاحظہ ہو''سینکڑوں بھیگے گنے کے لہلاتے ہوئے کھیت، لمبی چمنی کے دھوئیں، گنے کے کھیتوں کے درمیان سر جھکائے ہانپتے ہوئے جھاگ ٹپکاتے ہوئے بوجھ سے دبے کارخانے کی جانب جاتی ہوئے بیل، بانکے ترچھے نوجوان بچے ماں کا لہنگا پکڑے نل تک آتے۔ شرافت کی دہلیز نٹ کھٹ شرارت، گزک اور شراب ہٹکاتے، پھیری لگانے والے، شام کو گھر پر چاول ضرور بنتے مسور اور ارہر کی دال بھی آئے دن بنتی اور آچار کے ساتھ چھوٹی لال مرچ بھی کھانے میں اشتہا پیدا کرتی اور پھر پھاوڑا گنڈ اسا، درانتی، بی بی جمرن جیسے الفاظ نے ایک ایسے ماحول میں پہنچا دیا جو ماضی کے دبیز پردوں میں اوجھل ہے اور ہماری نسلوں کے لیے قطعاً نایاب۔

حصہ نظم کی ابتداء حمد ونعت سے ہوتی ہے اور یہ بہت مبارک آغاز ہے۔ سالنامہ کی منتظر۔

شاہ شجاعت اللہ۔۔۔ لنوڈ (امریکہ)

علم وادب اور تحفظِ ثقافت کا داعی وترجمان مجلّہ کا تازہ شمارہ ملا اور پڑھا۔ محترم طارق غازی صاحب ایک ایسے مورخ ہیں جو تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں اور جس محنت ودلسوزی سے مسلمانوں کے تاریخ ساز کرداروں کو ماضی کے اوراق سے ڈھونڈ نکالتے ہیں یہ انہی کا حصہ ہے اور ان کی یہ

خدمت لائقِ تحسین و قابلِ مبارکباد ہے مجھے اُن کے مضامین کا خصوصی طور پر انتظار رہتا ہے۔
مغرب میں اِن دنوں یا تو سالِ نو کا اور کرسمس کا شور دغوغا ہے اور ٹیلی وژن پر یہودی و نصرانی شخصیات اوران کے کارناموں پر فلمیں دکھائی جارہی ہیں۔ اگر ہمارے پاس بھی جدید ذرائع اور مہارت کے ساتھ ساتھ اپنی تاریخ سے محبت اور اسے عام کرنے کا جذبۂ شوق و ذوق بھی ہوتا تو اسلامی تاریخ کی نابغۂ روزگار شخصیات پر فلمیں بنائی جاسکتی تھیں تاکہ ہم اور ہماری نسلیں اپنی تاریخ سے شناسا ہوسکیں۔ ذرائع ابلاغ میں آج کل ٹی وی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

محترمہ نغمہ زیدی صاحبہ کا مضمون ''فلاسفۂ مغرب اور اقبال'' ایک اچھا تحقیقی مضمون ہے اور ابتدا میں ان مغربی فلسفیوں کی ایک طویل فہرست اور برگساں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں جو مضامین پڑھنے میں آتے ہیں وہ عموماً ایسی شکل، اجنبی اور غیر مانوس فلسفیانہ اصطلاحات سے پُر ہیں جو ایک عام قاری کے فہم و ادراک سے ماوراءاور اُن کے پڑھنے پر ذہن آمادہ نہیں ہوتا۔ پروفیسر نغمہ زیدی نے اپنے مضمون میں اس رعایت کا خیال رکھا ہے۔ میک ڈوگل، ڈبلیو جیمس، کارلائل، براؤننگ اور برنارڈ شا کے علاوہ اور بھی مغربی مفکرین اس فہرست میں شامل ہیں خواہش یہ ہے کہ اُن مغربی فلسفیوں کے فلسفہ کی متعلقہ اصطلاحات کو اقبال کے حوالہ سے عام فہم زبان میں لکھا جائے تاکہ اقبال فہمی آسان ہوسکے الاقربا کے گزشتہ چند شماروں سے شعر و سخن کی محفل میں ایک نئی دلکش آواز محترمہ پروین شیر صاحبہ کی سننے میں آرہی ہے۔ خوش آمدید! اُن کی غزل و نظم اُن کا لب و لہجہ دلنشین و منفرد ہے۔

''یادرفتگاں'' میں محمد فیصل مقبول عجز، غلام شبیر رانا، قاسم جلال اور سرور عالم راز صاحبان کے مضامینِ مرحومین کے اصناف سخن پر ہم جیسے دور افتادہ لوگوں کے علم میں اضافہ کا موجب ہیں۔ انشائیے اور افسانے بہت دلچسپ ہیں۔ امید ہے آئندہ شمارہ میں ان افسانہ نگاروں سے ملاقات ہوگی۔ ڈاکٹر احمد اعجاز کی کہانی ''گنے کے کھیت'' ادبی مصوری کی ایک اچھی مثال ہے۔ اپنے لکھنے والوں اور رفیقانِ کار کو سلام کہیے۔

ظفیر عالم۔ ٹلیڈو۔ (امریکہ)

ہجرت سے پہلے اور بعد بھی ادبی رسالوں کو پڑھنا میرا معمول رہا ہے۔ لیکن الاقرباء کے علاوہ کوئی ایسا رسالہ آج تک میرے مطالعہ میں نہیں آیا۔ جس کے مدیر یا مشیر وصولیابی کی رسید چاہتے ہوں یاددہانی کراتے ہوں کہ رسالہ پڑھا یا نہیں، پڑھا تو کیسا پایا تاثر سے آگاہ کیجیے اس اعتبار سے الاقرباء میرے لیے استاد کے فرائض انجام دیتا ہے مطالعہ کا شوق فروغ پا رہا ہے۔ اور مجھے اس پر بے حد فخر ہے۔ اویس جعفری صاحب کی نظم ''التماس'' کارگر ہوئی اور الحمدللہ مولانا احمد عبدل مجیب صاحب نہ صرف ہماری مسجد کے امام ہیں بلکہ اُن کے علم اور فیوض و برکات سے دوسری مساجد بھی استفادہ کر رہی ہیں۔ اب تو اُن کی شان میں استقبالیہ نظم ہونی چاہیے پروفیسر خلیل طوق اُر صاحب کو گلے لگانے کو دل چاہتا ہے انھیں اُردو سے عشق ہے اور وہ اس شیریں زبان کی بقا اور فروغ کے لیے ایک مثالی شخصیت ہیں۔ اللہ اُن کی مساعی کو کامیاب فرمائے اور اُن کا نورِ بصیرت عام فرمائے۔ مجھے تو وہ ترکی اور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اخوت کی ایک تابندہ علامت لگتے ہیں۔ میں ''نقد و نظر'' بہت شوق سے پڑھتا ہوں اور اس سے عصری ادب کے رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''حرفِ معتبر'' اور ''اندازِ سخن'' اگر ہاتھ آئیں تو ضرور پڑھ ہونگا۔ پاکستان میں اپنے عزیز واقربا اچھی کتابوں کے حصول میں کام آتے ہیں۔ اللہ آپ کو الاقرباء کے لکھنے والوں کو صحت مند اور خوش رکھے سب کو سلام پہنچے۔

منیر قریشی۔ سیاٹل۔ امریکہ

الاقرباء نظر نواز اہوا۔ شکریہ! آپ کا ہر اداریہ مملکتِ خداداد اور اس کے جاری استحصال پر روشنی ڈالتا ہے کاش سارے ہوش مند مصلح اور مملکتِ اسلامیہ کی نظریاتی اساس کے حامل محبان وطن کی آواز ایک تازیانہ بن جائے اور بددیانت ضمیر و وطن فروش عاقبت نااندیشوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دے۔

یہ ہمارے لیے بہت خوش نصیبی کی بات ہے کہ الاقرباء کے صفحات پر جن ہم عصر شعراء کے اسماء گرامی دیکھنے اور پڑھنے میں آتے ہیں ہم سیاٹل کے باسیوں کو اُن کو دیکھنے اور سننے کا موقع بھی

ملا ہے مثلاً مشکور حسین یاد، علی سردار جعفری، احمد فراز، اکبر حیدر آبادی، شہریار اور پیرزادہ قاسم وغیرہ وغیرہ۔ پروفیسر محمد زاہد صاحب کے علی سردار جعفری کی غزلیہ شاعری پر عالمانہ مضمون نے جعفری کے محاسنِ غزل گوئی پر یہ تاثر دور کر دیا ہے۔ کہ وہ محض نظم گو شاعر تھے ان کی غزلوں میں منفرد رنگِ تغزل کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں کا لب ولہجہ، آہنگ، اور جوش وجذبہ نظر آتا ہے۔ ایک نجی محفل میں فرمائش پر انھوں نے اپنی ایک پرانی غزل سنائی جس کے یہ دو شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں:

ابھی اور تیز کر لے سرِ خنجر ادا کو　　مرے خوں کی ہے ضرورت تیری شوخیِ حنا کو

تجھے کس نظر سے دیکھے یہ نگاہِ درد آگیں　　جو دعائیں دے رہی ہے تری چشمِ بے وفا کو

محسن احسان پر ڈاکٹر قاسم جلال صاحب کا مضمون شاعر کے فکر وفن بطور خاص پاکستان کے حالات کے تناظر میں لائقِ تحسین کاوش ہے۔ مصنف نے مختلف داخلی وخارجی جہتوں سے شاعر کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ یہ شعر آج کل کے حالات کا ترجمان ہے

"کوئی طوفان آنے والا ہے　　شہر کے ہیں تمام گھر بے خواب"

اور یہ شعر کیا خوب ہے:

تمام شہر ہے کاذب گواہوں کا مسکن　　حصول عدل کی کس در پہ جستجو کرتے

زیرِ نظر مضمون کو ایک مرتبہ پڑھنے سے تشفی نہیں ہوتی۔ الاقرباء کے ساتھ ایک نشست میں انصاف کرنا ناممکن ہے۔ آپ سے آئندہ شمارہ میں ملاقات ہوگی۔ والسلام

شجاع طلعت ۔۔۔ بیلیویو ۔۔ امریکہ)

گزشتہ ماہ جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۴ء کا شمارہ پہنچا۔ تمام تحریریں پُرکشش اور دعوت مطالعہ دیتی ہیں۔ بڑے ذہن یکساں سوچتے ہیں اور اُن کی تحریروں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر آصف طارق صاحب کا نفسیاتی افسانہ "اکیلا آدمی" بہت دلچسپ ہے۔ میں نے کچھ عرصہ قبل ایک ممتاز ماہر نفسیات Dr. Sidney Lecker کی کتاب The Success Factor پڑھی تھی۔ اس

میں اسی موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ میں آپ ڈاکٹر طارق اور قارئین سے اس کتاب کے مطالعہ کی سفارش کروںگا۔ ہمارے مسلم معاشرہ میں اکثر باپ اپنے بیٹوں سے اس قدر شفقت وقربت سے پیش نہیں آتے جتنا کہ بیٹوں کی نفسیات متقاضی ہے۔ غیر ضروری ڈانٹ ڈپٹ اور سرزش اُن کی نمو پذیر نفسیات کو مجروح اور اس پر منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ ''فلاسفہ مغرب اور اقبال'' پر پروفیسر نغمہ زیدی صاحبہ کا اور ''اقبال کی متصوفانہ فکر'' بہت اعلیٰ مضامین ہیں۔ موخرالذکر موضوع پر الاقرباء اپریل۔ جون ۲۰۰۶ء میں ڈاکٹر شاہد اقبال کامران صاحب کا مضمون '' تصوف اور اقبال'' اس سلسلہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

آٹھویں صدی ہجری اور نویں صدی ہجری کے لگ بھگ ایک ناقابل فراموش شخصیت حضرت شیخ عبدالکریم الجیلیؒ نے ایک شاہکار کتاب ''الانسان الکامل'' تصنیف کی تھی جو اُن کی منفرد فکر کی آئینہ دار ہے۔ ہر چند کہ برصغیر میں صوفیائے کرام کی بدولت ہزاروں لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے کاش کہ تخت کی ہوس کے ساتھ ساتھ مسلمان بادشاہ دعوت وتبلیغ کا کام بھی سرانجام دیتے تو ہندوستان مسلم اکثریت کا ملک ہوتا۔ لیکن بعد کا دور ایک غیر متحرک اور منجمد دور تھا جس میں تصوف جیسے شفاف وپاکیزہ فکر وعمل میں بدھ جین اور ہندو مذاہب کے علاوہ غیر عربی وغیر اسلامی عناصر بھی شامل ہو گئے جوگی، رشی مُنی، سادھو، سنت اور گیارہویں صدی عیسوی میں پادریوں کی تجرّد کی زندگی کی پابندی اور اس قسم کی راہبانہ فکر برصغیر کے تصوف میں درآئی۔ اقبال اس قسم کے تصوف کے خلاف نبرد آزما ہوئے وہ مسلمانوں کے فکری جمود اور علماء وشیوخ کی طریقت باہمی اختلافات "The Reconsstruction of Religious thought in Islam" میں سخت تنقید کرتے ہیں:

اُن عناصر کے علاوہ جن کا میں نے ذکر کیا ہے ایک اور فلسفہ ''وحدت الوجود'' نے بھی بہت بحث، مناظرہ کی بنا ڈالی۔ محی الدین ابن عربی کی دو بہت معروف کتابیں ''الفتوحات المکیۃ'' اور خصوص الحکم'' ہیں۔ موخرالذکر میں خصوصیت سے تصوف معرفت طریقت اور فلسفہ شریعت کے اہم

مسائل پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ جن صوفیاء علماء نے اس نظریہ کی حمایت کی اُن میں شیخ شہاب الدین سہروردی، امام فخر الدین رازی، جلا الدین سیوطی اور مولانا جلال الدین رومیؒ تھے۔ مگر اس دور کے دوسرے علماء نے اس نظریے کو قرآنی تعلیمات کے منافی سمجھ کر اس پر کفر کے فتوے بھی صادر فرمائے۔ ان میں خصوصی طور پر امام ابنِ تیمیہ علامہ ابن حجر عقلانی اور ابن خلدون وغیرہ تھے۔ اقبال کا معیارِ انتخاب ہمیشہ قرآن حکیم رہا اور وہ اس کے ارشادات کی روشنی میں کسی بھی نظریے کو رد یا قبول کرتے تھے وہ خود سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے اور تصوف کے اخلاقی پہلو تطہیر فکر و عمل کے قدردان اور عامل تھے۔ اُن کو اگر اختلاف تھا تو صرف تصوف سے جو فلسفہ بننے کی کوشش میں تھا۔ اور نتیجتاً نہ فلسفہ بنا اور نہ تصوف۔ وہ آرزومند تھے کہ صوفیاء کا علم و فضل زبان تک محدود نہ ہو بلکہ اس کا عمل میں ترجمہ ہو اور علما شیوخ دورِ حاضر کے جدید ترین نظریات کی روشنی میں اپنے حلقۂ اثر میں معتقدین کی رہبری کریں۔ اسلام غلبہ کا دین ہے علم و عمل کا دین ہے اور استقامت کا دین ہے وہ ایک متحرک ترقی پذیر کردار کو تکمیل انسانیت کے مراحل و مقامات سے گزار کر مردِ کامل کی منزل تک لیجانے کا واحد راستہ ہے۔

اقبال اس بات پر دل گرفتہ اور مغموم رہے کہ موجودہ دور کے مسلمان بے عمل کاہل اور اسلامی تعلیمات سے غافل اور اس لیے وہ اپنا مقام و منصب کھو چکے ہیں اگر وہ اپنے اسلاف کی طرح اپنے خالق و مالک اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کو اپنا طریقۂ حیات بنالیں تو وہ اپنے حال کو تابناک مستقبل میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ وہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دین و دنیا میں کامیابی کی کنجی تصور کرتے ہیں:

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست   بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

یہ موضوع بے حد دلچسپ اور عمیق ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے اور لکھا جاتا رہیگا۔ جس طرح اللہ اوّل و آخر اور اس کا کلام تابندہ و پائندہ و غیر فانی ہیں، اسی طرح اس کے شارح و مفسر اور موحدین اور عشقانِ رسولؐ امر اور غیر فانی ہیں اور اقبال ان افراد میں ممتاز و نمایاں مقام رکھتے

ہیں اور صدیوں کے بعد اس قد و قامت کے مصلح پیدا ہوتے ہیں دعا ہے کہ مسلمان اقبال کے پیام کو پڑھیں سمجھیں اور عام کریں۔۔

سرور عالم راز سرورؔ۔ ٹیکساس، یو ایس اے

جولائی۔ستمبر ۲۰۱۲ء کا الاقرباء محبی اویس جعفری صاحب کے توسط سے موصول ہوا۔ جس محنت اور محبت سے آپ ہر تیسرے ماہ اس قدر بیش بہا تخلیقات اتنے بہت سے معتبر اور اچھے لکھنے والوں سے حاصل کرتے ہیں اور ان کی شیرازہ بندی جس دلسوزی اور شائستگی سے کر کے الاقرباء کی صورت میں دُنیائے اردو کے سامنے رکھتے ہیں وہ قابل رشک بھی ہے اور مستحقِ تحسین بھی۔ رسالہ دیکھ کر یہ یقین ایک بار پھر پختہ ہو جاتا ہے کہ جب آپ جیسے لوگ موجود ہیں اردو نہ صرف یہ کہ مٹے گی نہیں بلکہ برابر پھلتی پھولتی رہے گی۔ زیرِ نظر شمارہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ سب مشمولات دل خوش کن اور معیاری ہیں اور آپ کے حسنِ انتخاب پر دلالت کرتے ہیں۔

''مضامین و مقالات'' کے تحت ڈاکٹر خلیق طوق اُر کا مضمون ''اردو زبان کے رسم الخط کے مسائل'' بہت برمحل ہے۔ انہوں نے موضع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اس پر بہت احتیاط سے کم ہی گفتگو کی ہے۔ اور نہایت خوبصورتی اور دانشمندی سے مضمون کا رُخ اُن امکانات اور خطروں کی جانب موڑ دیا ہے جو رسم الخط بدلنے کی صورت میں اردو کو اسی طرح پیش آسکتے ہیں جیسے ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک کے زیرِ اہتمام ترکی زبان کا عربی رسم الخط بدلنے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے اور جن کا خمیازہ ترک قوم آج تک بھگت رہی ہے۔ ان کا یہ اقدام بحث کو ایک عملی اور عقلی سمت میں لے گیا ہے جس کی یقیناً ضرورت تھی۔ اسی باب میں محمد زاہد صاحب کا مقالہ ''علی سردار جعفری کی غزلیہ شاعری'' بہت دلچسپ اور وقیع ہے۔ زاہد صاحب نے اپنے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے اور جعفری صاحب کی غزلیہ شاعری پر عالمانہ روشنی ڈالی ہے۔ جعفری صاحب پر کام کرنے والوں کے لیے ایسے مقالے بہت کارآمد ہوں گے۔ بہت سے رعایتی علوم کی طرح تاریخ گوئی کا فن بھی اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ انتخاب علی کمال صاحب (ابوالطاہر فدا حسین فدا ایک

ممتاز تاریخ گو) اور ابرار اعبدالسلام صاحب (نیساں اکبرآبادی کی تاریخ گوئی) ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ نامور تاریخ گویوں سے نہ صرف ہمیں متعارف کروایا بلکہ اس فن کی بہت سی بیش قیمت معلومات بھی فراہم کیں۔ جن لوگوں کو تاریخ گوئی کا شوق ہے وہ مضامین میں دی ہوئی مثالوں اور تفصیلات سے مستفید ہوسکتے ہیں اور اس فن کے رموز و نکات بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

''اقبالیات'' میں اس مرتبہ صرف دو مقالے شامل اشاعت ہیں لیکن دونوں ہی سے ظاہر ہے کہ نغمہ زیدی صاحبہ (فلاسفۂ مغرب اور اقبال) اور مظہر حامد صاحب (اقبال) کی متصوفانہ فکر) نے اپنے مقالات کو محنت، محبت اور دلسوزی سے مرتب کیا ہے۔ مجھ کو فلسفہ یا تصوف سے کوئی خاص شغف نہیں ہے لیکن دونوں مضامین پڑھتے وقت مجھے کو کسی قسم کی گرانی محسوس نہیں ہوئی بلکہ طبیعت کو شگفتگی اور طراوت حاصل ہوئی۔ اگر ایسے ہی علم افروز مضامین اسی انداز میں لکھے جاتے رہیں تو مجھ جیسے کتنوں کی تعلیم کا سامان ہوسکتا ہے۔!

''یادرفتگاں'' آپ کے رسالہ کا ایک اہم اور معتبر حصہ ہے۔ غلام شبیر علی رانا صاحب نے محسن بھوپالی اور انیتا غلام علی کی یادوں سے اس باب کو رونق بخشی ہے۔ کاش موصوف محسن بھوپالی کے بارے میں بھی اسی علم افروز تفصیل سے لکھ سکتے جو ان کی دوسری تحریر میں نظر آتی ہے۔ اس خواہش میں کچھ میری خودغرضی بھی شامل ہے کیونکہ محسن مرحوم اور میرے والد مرحوم (ابولفاضل راز چاند پوری) دونوں کو مولانا سیماب اکبرآبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اس باب کے باقی مضامین ہمارے تین مشاہیر شعرا (محسن احسان، شہریار اور احمد فراز) سے متعلق ہیں اور اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ ایسے مضامین سے یادرفتگاں تو تازہ ہو ہی جاتی ہے ساتھ ہی مرحومین کی فکر وفن پر قیمتی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔

افسانوں کا حصہ اس شمارہ میں کافی جاندار ہے۔ سلیم زاہد صدیقی کا ''جنرل فوبیا'' ملک اور قوم کی ذہنیت پر ایک اچھا طنزیہ۔ انشائیہ ہے۔ یہ دراصل ہمارے اجتماعی ذہن کے دیوالیہ پن کی نشاندہی کرتا ہے اور ہمارے فکر وشعور کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم اپنے

ماضی سے کچھ سیکھ کر اپنے بچوں کے مستقبل کو بہتر بنانے کی جانب پیش رفت کریں گے؟ آنے والا وقت ہی اس کا جواب دے سکے گا۔ ''اکیلا آدمی'' (آصف الرحمٰن طارق) اور ''خالہ شبو'' (شمع سید) انسانی نفسیات کو کریدنے اور اس سے سبق سیکھنے کی اچھی کوششیں ہیں۔ البتہ دونوں افسانوں کا بیانیہ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے اور نتیجہ میں ان کی اثر پذیری میں کمی واقع ہوئی ہے۔ احمد اعجاز الدین رحمت علی کی کہانی ''گنے کا کھیت'' دلچسپ ہے گو یہ بھی ضرورت سے زیادہ طویل ہو گئی ہے۔ اس میں موریشس کی دیہی زندگی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ ہمارے یہاں کی دیہی زندگی سے بہت مختلف نہیں ہے۔ ڈیڑھ دو سو سال قبل ہزاروں غریب ہندوستانی کسانوں اور مزدوروں کو انگریزی سرکار نے موریشس، گیانا، ٹرینیڈاڈ (جنوبی امریکہ) وغیرہ خالی پڑی ہوئی زمینوں کی آباد کاری کے لیے بھیجا تھا اور وہ لوگ بعد میں وہیں بس گئے تھے اور اب تک اپنی ہندوستانی رسوم اور روایات کو کسی نہ کسی شکل میں برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں امریکہ میں گیانا اور ٹرینیڈاڈ وغیرہ کے ہندوستان نژاد باشندے کافی تعداد میں ہیں۔

حمد اور نعت کا حصہ اچھا ہے۔ اس باب میں اویس جعفری صاحب نے سورۃ الفاتحہ کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ میری رائے میں اس کو ترجمہ کے بجائے ترجمانی کہنا زیادہ مناسب تھا۔ قرآن مجید کا ترجمہ نہ صرف انتہائی مشکل ہے بلکہ بڑی ذمہ داری کا کام بھی ہے۔ جعفری صاحب کا ترجمہ قاری کو متاثر نہیں کرتا ہے۔ اس کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ اجمالاً عرض ہے کہ مولانا سیماب اکبرآبادی نے قرآن مجید کے منظوم ترجمہ کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ قرآن کی آیات سے الگ جو اضافی الفاظ ضرورت شعری کے تحت انہیں ترجمے میں شامل کرنے پڑتے تھے ان کو وہ قوسین میں مقید دکھاتے تھے۔ اگر اسی قسم کی کوئی صورت یا احتیاط جعفری صاحب بھی اپناتے تو بہتر ہوتا۔

غزلوں نظموں اور رباعیوں کے حصے کامیاب ہیں اور ان میں اچھی تخلیقات نظر آ رہی ہیں۔ میں خود غزل گو ہوں اور اسی لیے غزلیں بہت شوق اور غور سے دیکھتا ہوں۔ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اردو غزل کا زرّیں دور گذر چکا ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں نامور شعرا ''بقدر بادام'' رہ گئے ہیں اور وقت کے بطن سے بڑے شاعروں کے اٹھنے کی دنیائے اردو منتظر نظر آتی ہے۔ یہ میرا خیال ہے جو غلط ہو سکتا ہے۔ خدا کرے کہ غلط ہی ہو! کتابوں پر نقد نظر الاقرباء کا ایک نہایت اہم حصہ ہو کر رہ گیا ہے۔ رسالے کے تبصرے سرسری کبھی نہیں ہوتے بلکہ بیشتر عالمانہ اور ناقدانہ مضامین ہوتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے کچھ کو ''مضامین و مقالات'' میں جگہ ملنی چاہیے۔ اتنی کامیاب کوشش پر ادارہ مبارکباد کا مستحق ہے۔

اگر خاطر نازک پر گراں نہ گذرے تو دو تجاویز پیش کروں! ایک تو یہ کہ متقدین شعرا کی ایک یا دو غزلیں ہر شمارے میں شائع کر دیا کریں۔ اس سے ایک تو اس بے بہا ادبی و شعری خزانہ کی بازیافت ہوتی رہے گی اور دوسرے یہ کہ موجودہ نسل اپنے بزرگوں کی تخلیقات سے فیضیاب و مستفید ہوتی رہے گی۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ طنز و مزاح کا ایک باب بھی رسالہ میں بڑھا دیا جائے۔ اس میں پرانے اور نئے سبھی لکھنے والوں کی تحریریں دی جا سکتی ہیں۔ اُردو میں طنزیہ اور مزاحیہ ادب انگریزی کی نسبت بہت کم ہے شاید اس لیے کہ برصغیر کی عام زندگی اتنے مشاکل و مصائب کا شکار ہے کہ ہنسی خوشی کے مواقع خال خال ہی میسر آتے ہیں۔ چونکہ ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے اس لیے اُن کا ان حالات سے متاثر ہونا ایک فطری بات ہے۔ ہندو پاک کی دوسری زبانوں کے شعر و ادب سے میں ایسا واقف نہیں ہوں کہ ان کے بارے میں کوئی رائے لکھ سکوں۔

عقیل دانش۔ لندن (برطانیہ)

جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء کا الاقرباء نظر نواز ہوا۔ آپ کے اداریے سے لے کر خبرنامے تک بالاستیعاب مطالعہ کیا اور صورت حال ہر ہر ورق پر یہ پائی کہ 'کرشمہ دامنِ دل می کشد جا ایں جاست'

آپ نے اداریے میں اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے بے اعتنائی کا ذکر جس دردمندی سے کیا ہے ہر پڑھنے والا اُس سے متاثر ہوگا معروف عمارات اور ہزار ہا سال پرانے مقامات کے علاوہ پاکستان میں کتنی درگاہیں، کتنے مقبرے اور کتنے قبرستان ہیں جو حکومت اور خصوصاً محکمۂ

اوقاف کی بے اعتنائی اور عدم توجہ کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ زندہ قومیں اپنی عمارتوں کی ایک ایک اینٹ کی حفاظت کرتی ہیں۔ اس ضمن میں ایک سانحے کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہوں گا چند سال قبل پاکستان کی وزیراعظم نے لندن میں ایک محل خریدا اور اپنے وزیرداخلہ کو حکم دیا کہ پاکستان کے متعدد عجائب گھروں سے خصوصاً مغربی پاکستان کے عجائب گھروں سے نادر اشیاء جمع کر کے اُن کے پاس لندن بھیج دیں۔ چنانچہ قومی ورثے کی تعریف میں آنے والی متعدد اشیاء بشمول گندھارا تہذیب کے بہت سے مظاہر لندن پہنچادے گئے۔ ''خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے''

ابھی حال ہی میں حکومت فرانس نے بہت سے نوادرات افغانستان کو واپس کیے ہیں جو طالع آزماؤں نے افغانستان سے فرانس بھجوائے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ارباب حل وعقد پر آپ کی بات کا اثر ضرور ہوگا۔ محمد طارق غازی نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے اُرخان کی فتوحات سے متعلق تحقیقات جمع کی ہیں مغرب میں بیٹھ کر اس قدر محنت اور پتہ ماری سے ادبی اور تاریخی کام کرنے پر میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق اُر نے ترکی زبان کا پس منظر بڑی کاوش سے بیان کیا ہے اور ببانگِ دُہل اردو رسم الخط کے متعلق دل آویز بحث کے بعد فرما دیا ہے کہ 'اردو رسم الخط میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے'۔ گزشتہ چند سال سے مغرب میں اردو رسم الخط کو رومن میں بدلنے کی باتیں ہورہی ہیں بعض اداروں کو ایک دو مقامی حکومتوں کی طرف سے مالی امداد بھی اسی ذیل میں دی گئی ہے۔ لیکن ابھی تک یہ تجویز ''پادر ہوا ہے'' لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اردو کے رسم الخط میں اردو والوں کی تہذیب اور ثقافت بھی پنہاں ہے۔ اس سلسلے میں لندن کے ماہنامہ 'صدا' کے زیراہتمام ایک کانفرنس میں راقم الحروف نے عرض کیا تھا ''یاد رکھیے کہ اگر اردو کو رومن میں لکھا جانے لگا تو ''صدا'' سے ''سدا'' کے لیے محروم ہو جائیں گے۔'' ڈاکٹر محمد زاہد نے علی سردار جعفری کی شاعری کا جائزہ بڑے مؤثر انداز میں لیا ہے۔ اُن کے مضمون سے جعفری کی شاعری کے کئی گوشے پہلی بار سامنے آئے ہیں اردو ادب کے اولین نقاد مولانا باقر آگاہ دیلوری'' کے عنوان سے ڈاکٹر جاوید حبیب نے دکن کے ادبی پس منظر میں مولانا باقر کے فن کا

جس طرح جائزہ لیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔ سید انتخاب علی کمال نے ایک ممتاز تاریخ گو ابوالطاہر فدا حسین فدا کا اور ڈاکٹر ابرار عبدالسلام نے نیساں اکبرآبادی جیسے تاریخ گو کا تعارف کرا کے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ تاریخ گوئی کے ذیل میں ایک لطیف واقعہ لکھنا غالباً نامناسب نہ ہوگا معروف شاعر، ناول نگار اور بیوروکریٹ فضل احمد کریم فضلی نے اپنے خوبصورت مکان کا نام 'بیت الغزل' رکھا۔ کچھ ہی دن بعد ایک سیاسی معاملے میں وہ پابند سلاسل ہو گئے اسلم فرخی نے تاریخ نکالی

''راس نہ آیا بیت غزل''

اقبال کی شخصیت برصغیر کی ایسی قد آور شخصیت ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس شخصیت کے پرت کھلتے جا رہے ہیں۔ پروفیسر سیدہ نغمہ زیدی نے ''فلاسفہ مغرب اور اقبال'' اور ڈاکٹر مظہر حامد نے 'اقبال کی متصوفانہ فکر' قلمبند کر کے اقبال کے مداحوں کو ایک خوبصورت تحفہ پیش کیا ہے۔ دونوں مضامین فکر اور تحقیق کا مظہر ہیں۔ یادرفتگاں میں پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا نے محسن بھوپالی اور پروفیسر انیتا غلام علی پر بڑے خوبصورت انداز میں لکھا ہے کاش وہ محسن بھوپالی کے فکر و فن پر پڑھنے والوں کو کچھ اور تفصیل دے سکتے تو علم و ادب کے پیاسوں کی تشنگی کم ہو جاتی احمد فراز پر محمد فیصل مقبول عجز نے اور شہریار پر جناب سرور عالم راز نے بڑے دلکش انداز میں لکھا ہے دونوں مضامین پڑھ کر قاری احمد فراز اور شہریار سے مزید قرب محسوس کرنے لگتا ہے۔ الاقرباء کے افسانے، انشائیے، کہانی اپنے دامن میں ایسی دلچسپی لیے ہوتے ہیں کہ ختم کیے بغیر قاری رسالہ ہاتھ سے نہیں رکھتا۔

حصہ نظم بھی اپنے دامن میں قوس قزح کے رنگ لیے ہوئے ہے۔ حمد۔ نعت۔ غزلیں۔ نظمیں۔ اور رباعیاں ایک سے ایک بڑھ کر دل نشیں، دل افروز، دل ربا اور دلکش ہیں۔

مندرجہ ذیل اشعار دل میں کھب کر رہ گئے

غزل میں رنگ بھرنا ہے تو صابر   نئے معنی نئی بندش نکالو

صابر عظیم آبادی

میں سچائی سربازار کہہ دوں خوشی سے پھر سپردِ دار کرنا
کرامت بخاری

جو رنگ ونفاست کا معیار تھا گلشن میں وہ برگ گل تر بھی تلوار ہوا چاہیے
محشر زیدی

نگاہ رہتی تھی بلائے بام جن کی سدا اُتر رہے ہیں بصد احتیاط زینوں سے
ڈاکٹر سید قاسم جلال

کیا حال میں بتاؤں چہرے پہ سب لکھا ہے
سلیم زاہد صدیقی

عجب ہے ترا روئے رنگین و روشن کبھی پھول پایا۔ کبھی تارہ ہم نے
انور شعور

عاقل صاحب! اس زرگزیدہ ماحول میں معیاری ادبی رسالہ نکالنا، اس کے لیے معیاری تخلیقات جمع کرنا بڑی ہمت اور سعادت کا کام ہے اور

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ کی محنت اور اللہ کے کرم سے الاقرباء معیار کے نئے فاصلے طے کر رہا ہے۔ اب علمی اور ادبی مجلوں میں اس مجلّے کا نام بڑے فخر اور یقین سے لیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر الاقرباء کی مقبولیت اس کے تخلیق کاروں کی بدولت ہے۔ میں آپ کو جون ایلیا، کے الفاظ میں یقین دلاتا ہوں کہ

اک معرکہ بہار وخزاں میں ہے آجکل ہم سب جواں مذاق بہاروں کے ساتھ ہیں

تنویر پھول۔ نیویارک (امریکہ)

برادرم اویس جعفری صاحب کی وساطت سے ''الاقرباء'' کے چند شمارے زیرِ نظر آئے۔ اُن

کی بہت نوازش ہے کہ جناب سعود صدیقی کی تحریک پر انھوں نے راقم الحروف کو اس بیش قیمت تحفے سے نوازا اور ''الاقرباء'' کا پارسل روانہ فرمایا، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

میری نظر میں ''الاقرباء'' نہایت وقیع اور اہم جریدہ ہے جو اُردو ادب کی بیش بہا خدمت انجام دے رہا ہے۔ فی الحال ایک شمارے پر (جو میرے پاس سب سے تازہ شمارہ ہے یعنی شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۳ء) اپنی رائے دے رہا ہوں۔ اس شمارے میں آپ کی تحریریں ''دختر پاکستان'' اور تحریم وتکریم'' نہایت اہمیت کی حامل ہیں اور موضوع سے انصاف کا حق ادا کر رہی ہیں۔ انتخاب علی کمال صاحب کی تحریر ''قرآن وحدیث کا جمال، فن تاریخ گوئی کا کمال'' بہت دلچسپ ہے۔ اسے پڑھ کر یاد آیا کہ راقم الحروف نے بھی حکیم محمد سعید کی شہادت کی تاریخ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کلیم متین حکیم محمد سعید ارجمند'' (۱۹۹۸ء) سے نکالی تھی۔ جناب محمد اویس جعفری کا تحقیقی مقالہ ''اردو ادب میں مشاعرہ کی روایت'' ایک قیمتی تحریر ہے، علاوہ ازیں ہر شمارے میں غزلیات کے علاوہ دینی شاعری کا حصہ بھی بہت وقیع ہے۔ میری طرف سے اردو زبان وادب کی اس بے لوث خدمت پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔

معلوم ہوا کہ کچھ عرصہ پہلے تک ''الاقرباء'' کا انٹرنیٹ ایڈیشن بھی دستیاب تھا جو بیرون ملک رہنے والے قارئین کے لیے نہایت مفید تھا۔ اب یہ سلسلہ تعطل کا شکار ہے۔ جناب منصور عاقل صاحب! میری آپ سے گزارش ہے کہ براہ کرم ذاتی دلچسپی لے کر اس سلسلے کو جلد از جلد بحال کرائیں تاکہ بیرون ملک رہنے والے شائقین اور قارئین اس سے استفادہ کر سکیں۔ ''الاقرباء'' کے لیے حمد ونعت منسلک ہیں۔ سب کو سلام کہیے اور دعاؤں میں یاد رکھیے۔ والسلام

خواجہ مشتاق حسین۔ گلبرٹ (امریکہ)

تازہ شمارہ ملا۔ الاقربا کے اہلِ قلم کو اعلیٰ نثری وشعری تخلیقات کی روایت برقرار رکھنے پر مبارکباد۔ ہر چند کہ کرشمۂ شعر کا میرے دامنِ دل کے ساتھ ازلی رشتہ ہے۔ لیکن اس کے علاوہ تصوف میرا پسندیدہ موضوع اور اقبالیات میرا محبوب مطالعہ ہے۔ الاقربا ہر شمارہ میں کلام اقبال کی

مختلف جہات پر خیال افروز مضامین پیش کرتا ہے۔اس شمارہ میں بھی پروفیسر نغمہ زیدی اور ڈاکٹر مظہر حامد کے مضامین تحقیقی اور خیال افروز ہیں Prof. Bruce B. Lawrance یہاں Duke University میں ادیانِ عالم کے پروفیسر رہے ہیں۔فرح دیبا فاؤنڈیشن کی کفالت پر جب دہلی میں Indian Institute of Islamic Studies نے پندرھویں صدی ہجری کے استقبال کے سلسلہ میں ۱۹۸۰ء میں تصوف پر ایک تین روزہ سیمینار منعقد کیا تو Prof. Bruce نے اس موضوع پر ''Sufism and the history of religions'' تین مقالے پڑھے اس کے علاوہ اسی موضوع پر انھوں نے ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے۔جس کا عنوان ہے:

Notes from a distant flute: the extent of litereture of pre-Mughal Indian Sufism.

اس کتاب کو ۱۹۷۸ء میں Imperial Iranian Academy Tehran نے شائع کیا تھا۔Prof. Bruce سے میری دعا سلام ہے اور انھوں نے اپنے آٹو گراف کے ساتھ یہ کتاب مجھے تحفتاً عطا کی تھی۔اگر آپ اِن مضامین کے اقتباس و ترجمہ پر مائل ہوں اور قارئین الاقرباء کو اس میں دلچسپی ہو تو میں آپ کی طرف سے اشارہ ملنے پر Prof. Bruce سے اجازت لے کر ان کی کاپیاں آپ کو ارسال کر سکتا ہوں☆۔ان کی ادبی حیثیت کی وجہ سے ہی ان تحریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ایک اور طویل مضمون مصنفہ مخفی القادری ماہنامہ ''شاعر'' آگرہ میں شائع ہوا تھا جو بعد میں کتابی شکل میں ۱۹۵۸ء میں 'ہفت روزہ قندیل' نے شائع کیا اور جس کا موضوع ''اقبال کا نظریۂ تصوف'' ہے یہ بھی آپ کی دلچسپی کا موجب ہو سکتا ہے۔تصوف ایک اہم موضوع ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے اس کے گوناں گوں گوشوں کی ارتقائی رفتار اور تبدیلیوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔قرونِ اولیٰ میں تصوف سے مراد ''اخلاص فی العمل'' لیا جاتا تھا اور اقبال کے نزدیک بھی تصوف کی یہی صحیح تعریف ہے۔اگر آپ برصغیر میں تصوف کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو اس میں غیر اسلامی معاشرت کے زیرِ اثر ہندومت، عیسائیت، بدھ مت اور فلسفہ یونان کے راہبانہ اور عمل کُش عناصر شامل ہوتے نظر آئینگے اور یہ ہی وہ عجمی تصوف تھا جس کے خلاف اقبال نے قلمی

جہاد کیا عجمی تصوف میں ''توکل'' کو بے عملی کے معنی پہنائے گئے۔ ''سورۃ مریم'' میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرستادہ فرشتہ حضرت مریم کو مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوا ''تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے اور تو ذرا اس درخت کے تنے کو ہلا تیرے اُوپر تازہ کھجوریں ٹپک پڑینگی پس تو کھا پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر'' (آیات ۲۵۔۲۳) اگر اللہ چاہتے تو پانی اور کھجوریں حضرت مریم کی خدمت میں فرشتہ پیش کر سکتا تھا، مگر یہاں اللہ نے عمل کی تاکید فرمائی۔ اسی طرح سفرِ معراج سے قبل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے توکل کرنے سے قبل اپنی سواری کی رسّی کو ایک جگہ باندھا اور پھر مسجد اقصیٰ کے اندر تشریف لے گئے اقبال شریعت اور طریقت میں دوئی کے قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک شریعت کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرنے کا نام طریقت تھا۔ اقبال کا نظریہ تصوف عشق و عقل جبر و قدر انسان جسم و روح صحبت مرشد یا مردِ کامل حکمتِ یقین مذمتِ تقلید درس توحید حکمتِ لا و الاّ اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم واضح اور نمایاں نظر آتا ہے۔ ملکِ الشعراءِ ایران بہار خراسانی کے اقبال کی خدمت میں اس خراجِ عقیدت کو پیش کرتے ہوئے آپ سے اجازت چاہونگا۔

قرنِ حاضر خاصۂ اقبال گشت   واحدے کز ہزاراں بر گزشت

شاعراں گشتند جیشی تار مار   ویں مبارز کرد کارِ صد سوار

ہیکلے گشت از سخن گوئی بپا   گفت کل الصید فی جوف الفرا

اقبال نے اس صدی کو اپنا کر لیا ہے۔ وہ تنہا ایک سو ہزار سے بازی لے گیا۔ یہ وہ مردِ میدان ہے جس نے ایک سو شہ سواروں کی طاقت رکھتے ہوئے ایک پوری شعراء کی فوج کو فرار ہونے پر مجبور کیا۔ اور مبارزت طلبی کی للکار پر پورا اترتے اور اپنی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ ان سب سے سبقت / بازی لے گیا۔ اللہ آپ کے اداریوں کے مخاطبین کو سماعت بصارت اور بصیرت سے سرفراز فرمائیے آمین۔

☆ ہم فاضل مراسلہ نگار کی علمی پیش کش کے لیے سراپا سپاس ہیں اور کرمفرمائی کے منتظر رہیں گے۔ البتہ پاکستان میں موجود تحقیقی مواد بڑی حد تک ہماری دسترس میں ہے۔ اس ضمن میں زحمت نہ فرمائی جائے (ادارہ)

راجہ نور احمد عبدالمومن ماہر۔ لیونیا مشی گن (امریکہ)

آپ یاد رکھتے ہیں آپ کا کرم ہے۔ الاقربا تو یدِ موسمِ گل کی طرح آتا ہے بس فرق یہ ہے کہ سال میں ایک مرتبہ نہیں بلکہ ہر سہ ماہی کے بعد جلوہ گر ہوتا ہے۔ سچ پوچھیئے تو یہ مرا رفیق تنہائی بھی ہے آج کل میں نے اپنا خیمہ جس شہر اور ریاست میں نصب کیا ہوا ہے اُس کی ترجمانی اقبال کا یہ مصرعہ معمولی تصرف کے ساتھ یوں ہے۔ ''زمستانی ہوا میں ہے یہاں شمشیر کی تیزی'' یا پھر ''جب دانت چنے سے دلتا ہو پھر دیکھ بہاریں جھرنے کی'' کے مصداق ہے میں کوشاں ہوں کہ اِس زمہریر سے جان چھڑاؤں۔ یار دوست دوسری ریاستوں میں بلا رہے ہیں ممکن ہے اٹلانٹا چلا جاؤں۔

ایک تحریر ''تہذیب کی سوداگر'' کے عنوان سے سپردِ قلم کر رہا ہوں مکمل ہونے پر سپردِ الاقربا کر دوں گا۔ سید قاسم جلال صاحب کو محسن احسان پر اتنا اعلیٰ مضمون لکھنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ احساسِ تنہائی میرا بھی شریکِ تنہائی ہے۔ امریکہ بہت وسیع و عریض ملک (براعظم) ہے۔ بچے ملازمت کی وجہ سے آنکھوں سے دور ہیں۔ جہاں دفتر بھیجتا ہے چلے جاتے ہیں۔ راہِ حیات میں ہم سفر سے محروم ہوں۔ نہ بھائی نہ بہن اور نہ والدین ۔ میں ہوں اور بس اللہ اللہ۔ آپ اور اویس جعفری صاحب جیسے چند مخلص احباب ہیں جن سے تعلق میرا قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ اللہ سب کو صحت مند اور تندرست رکھے آمین۔ محسن احسان کا کیا ہی عمدہ شعر ہے

ہوائے دشتِ جنوں کچھ سناؤ محسن کی وہ بے مراد غریب الدیار کیسا ہے

پروفیسر زاہد خان کا 'علی سردار جعفری کی غزل گوئی' اور سرور عالم راز صاحب کا 'شہریار کی غزل' پر دونوں مضامین بہت اچھے ہیں۔ اسلام آباد میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس پر محترمہ عالیہ امام صاحبہ کی روداد پڑھی۔ یہی کہہ سکتا ہوں کہ کیا ہمارے اہلِ قلم اُس سیلِ بے پناہ کو نہیں روک سکتے۔ جو ہماری زبان۔ اقدارِ صحافت کو بہائے لیے جا رہا ہے۔

سعود صدیقی۔ کراچی

الاقرباء کا تازہ شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء ملا جس کے لیے میرا شکریہ قبول کیجیے۔ پچھلے شماروں کی طرح زیرِ نظر شمارہ بھی آپ کے اور ادارہ الاقربا فاؤنڈیشن کے دیگر معاونین کے مقرر کردہ اعلیٰ ترین معیار کے عین مطابق ہے، اس شمارے میں بالخصوص آپ کا اداریہ بہ عنوان 'قومی ورثہ اور قومی تشخص بین الاقوامی تناظر میں' میری فوری توجہ کا باعث بنا۔ اس اہم موضوع پر آپ کا اداریہ ایک جاندار اور بے باک تحریر ہے جس کے لیے آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں غالباً اسی موضوع کی مناسبت سے اس شمارے کے سرورق پر شالیمار باغ لاہور کی رنگین تصویر شائع کی گئی ہے۔ ابھی حال ہی میں میں نے کمپیوٹر پر ایک چھوٹی سی ویڈیو ڈوکمنٹری دیکھی جس میں ماکلی، ٹھٹھہ کی صدیوں پرانی قبروں اور قبرستان کی زبوں حالی دیکھ کر انتہائی دکھ ہوا، آپ نے اداریہ کے آخر میں جو جملہ لکھا ہے اس میں مودبانہ ترمیم کرنا چاہوں گا مجرمانہ عدم توجہی کے بجائے 'مجرمانہ غفلت' کہنا چاہیے۔ دنیا کے دوسرے ممالک اپنے تاریخی ورثوں کی کتنی حفاظت اور ان کی داشت پرداخت کرتے ہیں اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہے کیونکہ میں نے اپنی ملازمت کے دوران کئی ممالک دیکھے اور ان کے بیشتر تاریخی مقامات کو دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ یہ اقوام اپنے قومی ورثوں کی نگہداشت اور حفاظت ایک عبادت کی طرح کرتی ہیں اور غیر ملکی مہمانوں کو فخریہ دکھاتی ہیں جب کہ ہم نے ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کرنے پر معمور کئی ریاستی اداروں کے باوجود اپنے قومی ورثوں کو برباد کردیا، ہمارے بعض قومی ورثے اور تاریخی مقامات تو اب دنیا کے ورثے (World Heritage) میں شمار کئے جاتے ہیں جن کے لیے (UNESCO) اور دیگر بین الاقوامی NGO's سے کافی رقم مہیا ہوتی ہے بشمول تیکنیکی مہارت۔ اس کے باوجود ہمارے قومی ورثوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔

مضامین اور مقالات کے تحت تمام مضامین نہایت اعلیٰ معیار کے اور پُر مغز ہیں بالخصوص جناب طارق غازی صاحب کا تاریخی مضمون اُرخان کی فتوحات (سلطنتِ عثمانیہ) نہایت معلومات افزا ہے۔ اسی طرح پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق آر کا مقالہ 'اردو زبان کے رسم الخط کے مسائل

پر بہت دلچسپ اور تحقیقی بحث کی گئی ہے کیونکہ دنیا میں اردو چوتھی سب سے زیادہ بولی لکھی اور پڑھی جانے والی زبان ہے، لہٰذا اس کے حروف تہجی میں کسی قسم کی تبدیلی اور رسم الخط کو رومن حروف میں تبدیل کرنے سے کوئی فوائد حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ اردو زبان کو سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ترکی کی مثال اردو پر لاگو نہیں ہو سکتی کیونکہ ترکی زبان دنیا کے دوسرے ممالک میں زیادہ رائج نہیں ہے اور پھر ترکی جغرافیائی حیثیت میں نصف یورپ میں واقع ہے۔ اس وجہ سے ترکی زبان کو رومن میں تبدیل کرنے سے ترکی کو شاید مختلف النوع سیاسی، تہذیبی اور دیگر مفادات ملتے ہوں اس سلسلے میں چند ماہ قبل ہندوستان کے ایک اخبار میں جو حیدرآباد دکن سے شائع ہوتا ہے، ایک خبر راقم الحروف کی نظر سے گزری جس میں اخبار کے رپورٹر نے یہ اطلاع دی کہ ہندوستان میں اردو رسم الخط کو ختم کر کے دیوناگری رسم الخط رائج کیا جائے گا جس کے لیے اردو کے کچھ حروف کو بھی حزف کرنا پڑے گا۔ اس خبر پر وہاں کے اردو بولنے اور لکھنے والے لوگوں اور بالخصوص اردو کے ادیبوں اور دانشوروں کا شدید ردِ عمل سامنے آیا۔ خود مقالہ نگار ڈاکٹر خلیل طوق اَر صاحب نے بھی یہ کہا ہے کہ ''اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ اردو میں رسم الخط کی تبدیلی کی ضرورت ہے یا نہیں تو میں کہوں گا کہ بالکل ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اردو کا رسم الخط ایک مکمل رسم الخط ہے جس میں تبدیلی یا اصلاح کی گنجائش بالکل نہیں'' یہ مقالہ بہت معلوماتی اور دلچسپ ہے۔

اقبال پر دونوں مضامین اعلیٰ معیار کے ہیں اور مجھ جیسے عام قاری کے لیے معلومات افزاء ہیں۔ محترمہ پروفیسر سیدہ نغمہ زیدی کے تحقیقی مقالے میں فلسفہ مغرب پر اقبال کی گہری نظر اور مطالعہ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مغربی فلسفیوں کے ہاں صرف عقل اور استدال پر زور ہے، جس سے روحانی سکون نہیں ملتا جب کہ عشقِ الٰہی اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر عقلی استدلال کے ساتھ غور و فکر میں لایا جائے تو انسان کی زندگی کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر مظہر حامد نے اپنے مقالے میں اقبال کی متصوفانہ فکر کے مختلف اور اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

مضامین اور مقالات کے تحت نیساں اکبرآبادی کی تاریخ گوئی پر ڈاکٹر ابرار عبدالسلام صاحب کا مضمون بہت دلچسپ اور معلومات افزاء ہے میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ گوئی اور اس کے اسرار و رموز پر پوری مہارت سے شعر میں تاریخ نکالنے کا فن اب معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شعر و سخن سے عام دلچسپی رکھنے والے عام قاری کو تاریخ گوئی کی ابجد بھی نہیں آتی چنانچہ وہ صرف اس کے اشعار یا قطعہ وغیرہ کو اچھی شاعری کے طور پر پڑھ تو سکتا ہے لیکن اس سے نکالی گئی تاریخ کو نہیں سمجھ سکتا۔

یادرفتگاں میں جناب سرور عالم راز نے شہریار کی غزل گوئی کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ شہریار صاحب کا یہ شعر ہمارے قومی لیڈروں کو آئینہ دکھاتا ہے۔

جھوٹ بولے تو اس ہنر سے کوئی　　　سچ کہے سُن کے جس کو سارا جہاں

احمد فراز پر محمد فیصل مقبول عجز صاحب کا مضمون اعلیٰ معیار کا اور فراز کی شاعری اور شخصیت کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ محسن احسان کی شاعری پر قاسم جلال صاحب کا تحقیقی تجزیہ بہت معلوماتی ہے جسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ محسن احسان کی شاعری میں موضوعات کا تنوع اور احساسات انسانی کی ترجمانی نظر آتی ہے اور خیر و شر کے تضادات بھی ملتے ہیں۔

کہانی اور افسانہ میں انشائیہ 'جنزل فوبیا' اور ڈاکٹر اعجاز الدین کی کہانی گنّے کے کھیت بہت دلچسپ ہیں۔ محترم اویس جعفری صاحب کا سورۃ فاتحہ کا منظوم ترجمہ بہت عمدہ ہے، کیونکہ قرآن کریم میں اس سورۃ کی سات (۷) آیہ مبارکہ ہیں اور اسی طرح منظوم ترجمے میں بھی سات (۷) مصرعے ہیں جس سے شاعر کی مہارتِ شعر گوئی سامنے آتی ہے، ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ترجمہ نہایت سادہ اور آسان اردو میں ہے۔ حمد، نعتوں اور غزلوں کا انتخاب حسبِ روایتِ الاقربا بہت عمدہ اور معیاری ہے الاقربا کی اور خوبی یہ ہے کہ آپ ہر شمارے میں رُباعیات شائع کر کے اس خوبصورت صنف شاعری کو بڑھاوا دے رہے ہیں کیونکہ میرے مشاہدے اور مطالعے کے مطابق آج کل رباعی اپنا مقام اور مقبولیت کھوتی جا رہی ہے۔ جناب صابر عظیم آبادی کی ایک رباعی

ہمارے ملک کے نوجوانوں کے لیے بہترین پیغام رکھتی ہے۔

دنیا میں سنبھلنے کا یہی ہے نسخہ — کانٹوں سے نکلنے کا یہی ہے نسخہ

ہر لمحہ جلاتے رہو محنت کے چراغ — تقدیر بدلنے کا یہی ہے نسخہ

آخر میں جناب سید منصور عاقل صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری والدہ مرحومہ شوکت جہاں شوکت کے مختصر اور سادہ مجموعہ کلام ''اندازِ سخن'' پر اپنا تبصرہ فرمایا۔ والدہ کے کلام کا بڑا حصہ گم ہو گیا تھا، باقی ماندہ اشعار اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے ان کو یکجا کر کے مرتب کرنے اور شائع کروانے کی محنت کا صلہ مجھے منصور عاقل صاحب کے تبصرے سے مل گیا۔

منصور عاقل صاحب نے از راہِ خلوص و محبت مجھے اپنی تصنیف بہ عنوان 'متاعِ فکر و نظر' بھیجی جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔ منصور عاقل صاحب اردو کے ایک معتبر نقاد، تبصرہ نگار، محقق، مدیر اور مترجم ہونے کے علاوہ اچھے شاعر بھی ہیں۔ اور اندرون اور بیرون ملک ادبی حلقوں میں مشہور اور معروف ہیں۔ زیر نظر تصنیف میں منصور عاقل صاحب نے اپنے ان تمام تنقیدی جائزوں اور تبصروں میں سے وہ منتخب کیے ہیں جو کئی سال سے الاقربا میں ''نقد و نظر'' کے عنوان سے شائع ہوتے رہے۔ نقد و تبصرہ نگاری کوئی آسان فن نہیں ہے یہ فن ایک عرصہ کی محنت شاقہ، مسلسل اور مختلف النوع کتابوں کے گہرے مطالعے اور تحریروں کے اچھے اور کمزور پہلوؤں کا بغور جائزہ لینے سے ہی حاصل ہوتا ہے اس کے لیے خود تنقید اور تبصرہ نگار کا ایک کہنہ مشق نثر نگار اور شعر و ادب کا منجھا ہوا انشاء پرداز ہونا ضروری ہے۔

متاعِ فکر و نظر میں تمام مضامین، شعر و ادب کے تنوع اور پھیلاؤ نے اس کتاب کو بہت معلوماتی اور دلچسپ بنا دیا ہے اور یہ کتاب علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے سب افراد کے لیے مفید اور معلوماتی ہے منصور عاقل صاحب کے تبصروں میں راقم الحروف نے یہ خصوصیت دیکھی کہ وہ اپنی زیر نظر کسی تحریر یا شاعری میں پہلے تعریف اور توصیف کے پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں اور پھر اگر کوئی عیب یا کمزوری دیکھتے ہیں تو اس کی نشاندہی ایسے نفیس اور عمدہ پیرائے میں کرتے ہیں جس

سے مصنف کی دل آزاری یا حوصلہ شکنی نہ ہو۔ ان کے ہاں بے جا اور مبالغہ آمیز تعریف و توصیف بھی نظر نہیں آتی۔ مراسلہ شاید کچھ طویل ہو گیا ہے معذرت قبول کیجیے۔ آخر میں الاقربا کی مسلسل ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

صابر عظیم آبادی۔ کراچی

امید کہ مزاج عالی بخیر ہوں گے۔ جولائی تا ستمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ زیر نظر شمارے میں تمام مضامین لائق مطالعہ ہیں لیکن علالت کے سبب تین مضامین ہی کا مطالعہ کر سکا ہوں۔ منظومات بھی بہت جامع اور معیاری ہیں۔ طبیعت بحال ہو جائے تو باقی حصے کا مطالعہ کروں گا۔ چند غیر مطبوعہ تخلیقات حاضر خدمت ہیں امید ہے پسند فرمائیں گے۔ باقی حالات بدستور ٹھیک ہیں۔ تمام احباب کی خدمت میں میرا سلام کہیے۔

محترمہ سعدیہ راشد۔ کراچی

جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۴ء کا ''الاقربا'' آپ کی عنایت سے حسب معمول مل گیا۔

یہ شمارہ بھی دلچسپیوں سے پُر ہے۔ ادب اور زبان کے مسائل پر کئی مضامین، شخصیات اور ان کی ادبی خدمات کے علاوہ علامہ اقبال پر معیاری تحریریں بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ یادرفتگاں کا حصہ بھی متنوع شخصیات کی یادوں کو تازہ کرتا ہے۔ یہ شخصیات زندگی اور ادب کے میدان میں اپنے نقوش چھوڑ کر رخصت ہو گئیں۔ ان پر پُر محبت مضامین ہیں۔ حصہ نظم بھی جاندار ہے۔

اللہ آپ کو توانا صحت کے ساتھ اس خدمت کو جاری رکھنے کے لیے طویل زندگی عطا فرمائے۔

پروفیسر خیال آفاقی۔ کراچی

اس کرم فرمائی پر آپ کا ممنون ہوں کہ تواتر کے ساتھ آپ مجلہ الاقرباء عنایت فرماتے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ گذشتہ کئی شماروں میں میری کوئی چیز جگہ نہیں پا سکی۔ جب کہ میں اپنی شعری و نثری تخلیقات باقاعدہ آپ کی طرف ارسال کرتا رہا ہوں۔ ممکن ہے ڈاک نے گُل کھلائے ہوں یا پھر

معیار نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا ہو کئی تازہ تصنیفات بھی کتابی شکل میں آپ کی نذر کیں اسی غرض سے کہ آپ کی رائے سے استفادہ کر سکوں خصوصاً کلامِ اقبال کی تفہیمات پر مشتمل کتاب "اذانِ اقبال" لیکن وہ بھی آپ کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ یاد رہے یہ کتاب میں نے مکرر ارسال کی تھی۔ اپنی "تخلیقات" کے شائع ہونے کا افسوس نہیں، ملال اس بات کا ہے کہ میں اپنی خراب عادت دیرینہ کے تحت نقول نہیں رکھتا۔ اس بے اُصولی کا اصل سبب مصروفیات کا ہجوم ہے جو مجھے "سلیقہ مند" نہیں ہونے دیتیں۔ انہیں خواجہ صاحب نے زندگی کو کس معنی میں طوفان قرار دیا تھا۔ ہم تو ان مصروفیات کے ہاتھوں مجبور ہیں اور اس ہنگامہ خیزی کو طوفان سمجھتے ہیں تاہم اسی نیلوفر کی آغوش میں رہنے کی اب ایسی عادت پڑ چکی ہے کہ لمحہ فرصت ملنے پر زندگی بے کیف لگنے لگتی ہے۔ آپ کیسے ہیں؟ امید ہے جان و ایمان کی سلامتی کے ساتھ بخیر ہوں گے۔ رواں سال میں وقفہ وقفہ سے تین بار اسلام آباد آنا ہوا۔ آپ سے ملاقات کی خواہش نے ارادہ بننا چاہا لیکن باوجوہ ایسا نہ کر سکا، زیرِ نظر شمارے میں محترم خواجہ شفیق احمد مدنی کی نعت پیش نظر آئی تو مرحوم کی یاد تازہ ہو گئی۔ خواجہ صاحب گزشتہ دنوں دیارِ رسولؐ زندگی پا گئے۔ ان کا آخری ایس ایم ایس ابھی تک میرے موبائیل سیٹ میں محفوظ ہے۔ اللہ رحمٰن و رحیم ان کے درجات بلند فرمائے۔ بہت خوبیوں کے انسان تھے۔ عاشقِ رسولؐ تھے اور دل گداز رکھتے تھے۔ میری آخری ملاقات گنبدِ خضرا کے سائے میں ہوئی تھی اور اب انشاء اللہ لوائے شفیع امت کے سائے میں ہوگی۔ ارادہ ہے محترم شفیق احمد المدنی کی شخصیت پر اختصاراً ہی کچھ لکھوں اگر اللہ نے اس ارادے میں کامیابی عطا فرمائی تو الاقرباء کے لیے ارسال کروں گا۔

کرامت بخاری۔ لاہور

آپ کا پرچہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت ہے، وقیع اور موثر ہے اور کچھ موضوعات پر جامع دستاویز ہے، حصہ نثر، منظومات، مقالہ جات اور مکتوبات تک علمی اور فکری مباحث اِس کا حصہ ہیں ایسے پرچے اردو ادب کی ترقی، ترویج اور اشاعت کے ضامن ہوتے ہیں۔

ایک اہم بات کی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ ہے اردو زبان کا رسم الخط، اس کا رسم الخط ہرگز ہرگز تبدیل نہ کیا جائے، کہ یہ رسم الخط اس کی پہچان اور اس کا لباس ہے، اگر ایسا ہوا تو آنے والی نسلیں جو نئے رسم الخط کے تحت پڑھیں گی پرانے اساتذہ اور ۴۰۰ سالہ اردو ادب کے مطالعہ سے محروم ہو جائیں گی یوں یہ ساری تاریخ ختم ہو جائے گی۔

یہ دائیں ہاتھ سے شروع ہونے والا مبارک رسم الخط ہے، فارسی اور عربی بھی دائیں ہاتھ سے شروع ہوتی ہے، رسم الخط صدیوں بعد جا کر پہچان کا درجہ اختیار کرتا ہے، دراصل اِس تحریک کے پیچھے اردو دشمنی چھپی ہوئی ہے۔ آپ کے پرچے کے لیے اپنی تخلیقات روانہ کر رہا ہوں۔

نوید سروش۔ میر پور خاص

''الاقرباء'' کا تازہ شمارہ (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء) نظر نواز ہوا۔ جس کے لیے ممنون ہوں۔
آپ کے لکھے ہوئے اداریے دردمندی، حُبّ ولوطنی اور حقائق پر مبنی ہوتے ہیں۔ ''قومی ورثہ اور قومی تشخص۔۔۔ بین الاقوامی تناظر میں'' بھی ایک ایسا ہی فکر انگیز اداریہ ہے۔

محمد طارق غازی صاحب نے سلطنت عثمانیہ میں اُرخان کی فتوحات'' کو حقیقی تاریخ نویسی کے اُصولوں پر تحریر کیا ہے۔ اسلوب سادہ اپنایا ہے جو اس قسم کے مضامین کا حُسن ہوتا ہے۔ پروفیسر خلیل طوقا آر کے مضمون ''اردو زبان کے رسم الخط کے مسائل'' میں صاحب مضمون نے جن خدشات کا ذکر کیا ہے اُن میں سے کچھ مصنوعی ہیں یہ اپنوں کی نوازشیں ہیں۔ ڈاکٹر جاوید حبیب نے 'مولانا باقر آگاہ ویلوری' اردو ادب کا اوّلین نقاد کتاب پر تبصرہ کیا ہے۔ جس کے لیے انھوں نے تمہید کو طول دیا ہے۔ جو مناسب نہیں، کتاب پر مختصر لکھا ہے۔ سید انتخاب علی کمال صاحب کا ہر مضمون میں بڑی توجہ سے پڑھتا ہوں۔ انھوں نے موجودہ پرچے میں ابوالطاہر فدا حسین فدا ۔۔ایک ممتاز تاریخ گو' بڑی محنت سے تحریر کیا۔ سید صاحب ایک ایک لفظ اور مصرع سوچ سوچ کر لکھتے ہیں۔ آخر میں حواشی، ماخذات وحوالہ جات بھی مستند اور اہم ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا نے محسن بھوپالی مرحوم سے اپنے ذاتی مراسم کو فکری انداز میں پیش کیا ہے کہ محسن بھوپالی ایک

دردمند اور حوصلہ دینے والی شخصیت تھے ڈاکٹر سید قاسم جلال صاحب نے منفرد لب ولہجہ کے شاعر محسن احسان کی غزل کا فکری و فنی جائزہ بڑی عرق ریزی سے لیا ہے اور حق ادا کر دیا ہے۔ محسن احسان اردو شعری ادب کا ایک ستارہ تھے جن کی چمک سے اردو شاعری تادیر روشن رہے گی۔ سرور عالم راز صاحب کا شہریار کی غزل پر مضمون اور محمد فیصل مقبول عجز کی احمد فراز پر تحریر پڑھ کر خوشی ہوئی پچھلے شمارے میں بھی اقبالیات پر اہم مضامین شامل تھے اس میں بھی ''اقبال کی متصوفانہ فکر'' میں ڈاکٹر مظہر حامد نے اقبال کی صوفیانہ فکر کو نئے زاویے سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک ایسے ماہر اقبالیات ہے ہیں جو کلام اقبال میں نئے گوشوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ پروفیسر نغمہ زیدی کا مضمون بہتر ہے اس موضوع پر خاصا لکھا گیا ہے مگر پروفیسر صاحبہ نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ محمد اویس جعفری کا سورۂ فاتحہ کا منظوم ترجمہ اُن کی عقیدت اور قادر الکلامی کا ترجمان ہے خواجہ شفیق احمد فاروقی اور شفق ہاشمی کی نعتوں میں محبت کے ساتھ ایک فکر کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ ماہر اجمیری کی نعت میں نبی کی غلامی میں بخشش کا سامان موجود ہے۔

خودسری نفس کی یوں ہم نے مٹا رکھی ہے اپنی پیشانی بھی سجدے میں جھکا رکھی ہے

محشر زیدی، پرتو روہیلہ، عقیل دانش، کرامت بخاری اور سلیم زاہد صدیقی، خواجہ شفیق فاروقی کی غزلوں میں تازگی اور نیا پن ہے۔ مشکور حسین یاد کی مختصر بحر کی انفرادیت برقرار ہے۔ امین راحت چغتائی اور انور شعور کی غزلیں مکرر مطالعے میں آئیں تو ایک نیا احساس جلوہ گر ہوا۔ ڈاکٹر قاسم جلال کی نظم ''ارض فلسطین'' میں ایک عام پرامن مسلمان کے احساسات کو زبان دی گئی ہے۔ پروین شیر کی نظم ''میرا وجود'' اور اویس الحسن کی نظم ''تم چلے آؤ'' میں باطن سے اٹھنے والے سوالات کو فکری تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ سید منصور عاقل صاحب کی کتاب ''حرفِ معتبر'' پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر نے ایک اچھا مضمون تحریر کیا ہے جسے تبصرۂ کتب کے گوشے میں شامل کیا گیا ہے جب کہ یہ فہرست مضامین میں ہونا چاہیے تھا میرا خیال ہے کہ یہ سید صاحب کی عاجزی و انکسار ہے کہ

انھوں نے اپنی کتاب پر لکھے گئے مضمون کو خاص اہمیت نہیں دی۔ پرچے میں شامل خطوط لائق مطالعہ ہیں۔

سید حبیب اللہ بخاری۔ بہاولپور

سہ ماہی ''الاقرباء'' کا شمارہ جولائی۔ستمبر۲۰۱۴ء موصول ہوا۔ مطالعہ سے مستفید ہوا۔

شمارہ کا سرورق شالیمار باغ لاہور سے مزیّن ہے جو مغلیہ دور کے تاریخی وثقافتی ورثہ کی یاد دلاتا ہے۔آپ نے اس شمارہ میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے۔

حالیہ شمارہ میں بیشتر مضامین ومقالات ان حضرات کے ارسال کردہ ہیں جو بیرون ملک رہائش پذیر ہیں۔ یہ کاوش ان کے علمی مقام وشغف کا بیّن ثبوت ہے۔شعبہ یادرفتگان میں مُحسن بھوپالی پر پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر علی رانا اور ڈاکٹر قاسم جلال کا ''محسن احسان کی غزل کا فکری وفنی جائزہ'' مقالات قابلِ ستائش ہیں۔آپ کی کتاب حرفِ معتبر (ادبی اداریہ نویسی) پر پروفیسر غلام شبیر علی رانا کا تبصرہ بے حد جامع اور معتبر ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور صحت وتوانائی سے نوازے تاکہ ہم جیسے تشنگانِ علم مُستفید ہوتے رہیں۔

پانچ کتب پر آپ کے تبصرے شامل ہیں جو آپ کے عمیق مطالعہ اور بنظر غائر جائزہ کے غماز ہیں۔

نسیم سحر۔راولپنڈی

سہ ماہی الاقرباء باقاعدگی سے موصول ہو رہا ہے اور ہر بار اس کے مندرجات میرے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ پُروقار ادبی جریدہ یقیناً دوسرے بہت سے جرائد سے بہتر انداز میں بہت سے اہم موضوعات کا احاطہ کر رہا ہے۔تازہ شمارے میں قومی ورثہ اور قومی تشخص کے بارے میں جس دردمندانہ انداز میں قلم اٹھایا گیا ہے اور قومی سطح پر قومی ورثہ کے تحفظ اور اقوام عالم میں اس کے عمدہ انداز میں تعارف اور پہچان کروانے کے بیشمار ذمہ داراداروں کی موجودگی کے باوجود کوئی ٹھوس کام سامنے نہیں آیا، اس کی نشاندہی آپ نے بہت خوب کی ہے مگر۔۔۔ ''مردِ ناداں پر

کلامِ نرم و نازک بے اثر۔"

جناب محمد طارق غازی نے سلطنت عثمانیہ کی تاریخ اور اُرخان کی فتوحات پر جو مقالہ تحریر فرمایا ہے اُسے بھی اس شمارے کی قابلِ قدر تحاریر میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ محمد طارق غازی کا طویل صحافتی و ادبی تجربہ ایک ایک لفظ میں اپنا اظہار کر رہا ہے۔ کناڈا جانے سے پہلے وہ ایک طویل عرصہ تک جدہ، سعودی عرب میں ایک انگریزی کے روزنامے کے مدیر رہے ہیں، اور اُن کے دولت کدے پر اور بہت سے دیگر مقامات پر ہونے والی ادبی محافل میں ان کی شاعری اور ادب و تاریخ کے حوالے سے ان کے زرّیں خیالات سننے کی خوش نصیبی مجھے میسر رہی ہے۔ اُن کے عظیم القدر والد مولانا حامد الانصاری غازی سے بھی وہیں ملاقاتیں رہیں اور بلاشبہ "ایں ہمہ خانہ آفتاب است" یہ مثال ان پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے کہ محمد طارق غازی کی والدہ محترمہ بھی ایک معروف ناول نگار تھیں۔

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق اُر نے ترکی کے تجربات کے تناظر میں اردو زبان کے رسم الخط کے مسائل کو حقیقت پسندی سے اجاگر کیا ہے اور ان کا یہ سوال اس موضوع پر طویل اور بے مقصد بحث کرنے والوں کے لیے قابلِ توجہ ہے کہ کیا اردو کا کوئی اور مسئلہ باقی نہیں رہا جو اردو داں دوست اردو کے رسم الخط پر آ کر اٹک جاتے ہیں اور اس پر قلم فرسائی کرتے جاتے ہیں۔

خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کیلئے)

مرتبہ :
پروفیسر ہما سالاری

احوال و کوائف

○ دعائے صحت یابی کے لیے اظہارِ تشکر

سہ ماہی الاقرباء کے مشیر اعلیٰ برائے امریکہ و کینیڈا جناب محمد اویس جعفری اور اُن کی اہلیہ بیگم مسرت جعفری نے الاقرباء فاؤنڈیشن کے ان سب اراکین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا ہے جنھوں نے جناب جعفری کے چھوٹے بھائی جناب محمد شعیب جعفری کی شدید علالت کے دوران دعائے صحت فرمائی۔ وہ اپنے ایک میجر آپریشن کے لیے ہارٹس انٹرنیشنل ہسپتال راولپنڈی میں دوبار داخل رہے۔ الحمدُ اللہ وہ اب مکمل صحت یاب ہو چکے ہیں اور معمول کی زندگی گزار رہے ہیں ادارۂ سہ ماہی الاقرباء انھیں اور اہل خاندان بالخصوص بیگم و جناب اویس جعفری اور بیگم راشدہ شعیب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور جناب شعیب جعفری کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے دعا گو ہیں۔

○ جناب محمد اویس جعفری کے پوتے کی ولادت پر مبارک باد:

اللہ تعالیٰ نے بین الاقوامی سطح پر مجلّہ الاقربا کے تعارف اور ترسیل علم کے لیے بے مثال خدمات انجام دینے اور دیگر اوصاف حمیدہ کے صلہ اور اُجر کے طور پر جناب محمد اویس جعفری و بیگم مسرت جعفری کی نسل نو میں مزید ایک پوتے کا اضافہ فرمایا ہے نومولود کی تاریخ ولادت ۲۹ اکتوبر ۲۰۱۴ء ہے جو ماشاء اللہ وجیہہ و شکیل ہیں اور نام محمد

ادریس جعفری رکھا گیا ہے۔ ادارہ الاقرباء اس ولادت باسعادت پر نومولود کے والدین۔ بیگم و جناب محمد اویس جعفری اور اہل خاندان کو ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ محمد ادریس جعفری کو بلند اقبال و باسعادت بنائے۔ آمین۔

○ سہ ماہی 'الاقرباءٗ کی قلمی معاون اور معروف شاعرہ وادیبہ پروین شیر کو صدمہ:

معروف شخصیت سید وارث شیر اور شوہر محترمہ پروین شیر ۲۵ ستمبر ۲۰۱۴ء کو امریکہ کے شہر ونی پیگ میں انتقال فرما گئے۔ آپ کی عمر ۷۸ سال تھی اور آپ انڈیا کے شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے تھے آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ یونیورسٹی آف لندن اور جرمنی کی جامعات میں تعلیم حاصل کی۔ موصوف نے یونیورسٹی آف مانی ٹوبہ اور ریڈ ریور کمیونٹی کالج میں اپلائیڈ میتھا میٹکس (Applied Mathematics) میں تدریسی خدمات انجام دیں نیز بین الاقوامی امور پر متعدد کتب تصنیف کیں۔ آپ کے مضامین بیشتر بین الاقوامی رسائل وجرائد میں اشاعت پذیر ہوتے رہے ہیں۔ 'امن عالم' مرحوم سید وارث شیر کا خاص موضوع تھا۔ آپ ایک مثالی استاد کی حیثیت سے اپنے طلباء میں بے حد مقبول تھے۔ انسانی حقوق اور رنگ و نسل، فرقہ و مذہب اور جنسی امتیاز کے بغیر انصاف کی فراہمی آپ کی زندگی کا نصب العین تھا۔ آپ نے زندگی بھر عدم مساوات، عدم برداشت اور تشدد کے خلاف علمِ بغاوت بلند رکھا۔ نجی زندگی میں مرحوم ایک شفیق اور محبت کیش باپ۔ دادا اور شوہر تھے۔ انھوں نے اپنی اولاد در اولاد کی تربیت و پرورش پر پوری سرگرمی سے توجہ دی اور ان کے کارناموں پر فخر کیا۔ آپ 'ونی پیگ جیٹس' اور ونی پیگ بلیو بومبرز' کے زبردست مداح تھے اور ان پر فخر کرتے تھے۔ آپ کے پس ماندگان میں اہلیہ پروین شیر۔ بیٹی صہبا۔ بیٹے شیراز اور فراز کے علاوہ پوتے پوتیاں شان۔ کامران۔ ہدیٰ۔ روبی اور لینہ شیر شامل ہیں۔ آپ کی نماز جنازہ گرینڈ ماسک (Grand Mosque) میں ادا کی گئی اور تدفین چیپل میں ہوئی۔

'حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'

ادارۂ سہ ماہی الاقرباء مرحوم کی مغفرت اور پس ماندگان کو صبر جمیل کے لیے دعا گو ہے اور

محترمہ پروین شیر سے خصوصی تعزیت کرتا ہے

O انتقال پُر ملال

محترمہ شہلا احمد نائب صدر الاقرباء فاؤنڈیشن کے چھوٹے بھائی جناب ناصر ممبر مجلسِ عموی الاقرباء فاؤنڈیشن تضائے الٰہی سے مورخہ ۲۳ دسمبر ۲۰۱۴ء کو انتقال فرما گئے۔ (اِنا اللّٰہ اِنّا الیہِ راجعون) مرحوم محترمہ شہلا احمد سے چوتھے نمبر پر تھے اور کافی عرصے سے بیمار تھے۔ آپ PTCL میں ملازمت کر رہے تھے۔ سوگواران میں انہوں نے چار بیٹیاں اور ایک بیٹا چھوڑا۔ ان کی اہلیہ کینسر کے مرض سے دو سال پہلے ہی انتقال کر گئیں تھیں۔ محترمہ شہلا احمد آج کل اُن کے تین بچوں کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔ اللہ اُن کے اہل خانہ کو صبرِ کامل عطا کرے اور مرحوم کی مغفرت کرے (آمین) ادارہ الاقرباء اُن کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

O سانحہ رحلت:

مجلس انتظامیہ کی رکن مسز عالیہ حسن سجاد کی والدہ محترمہ کا مورخہ ۷ نومبر ۲۰۱۴ء کو کراچی میں انتقال ہوگیا۔ اِنا للہ و اِنا الیہ راجعون

مرحومہ گزشتہ آٹھ ماہ سے بستر علالت پر تھیں اور کراچی ہی میں مستقلاً رہائش پذیر تھیں۔ ادارہ ’الاقرباء‘ ان کی مغفرت اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرنے کے لیے اللہ رب العزت سے دعا گو ہے اور خاص طور پر مسز عالیہ اور جناب حسن سجاد کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

فرزانہ اعجاز (فرزانہ رضا انصاری) ☆

الحاج مولانا مفتی محمد انصاری، فرنگی محلی صاحب مرحوم کی پانچ اولادوں میں سے بڑی بیٹی فرزانہ رضا انصاری ہیں۔ ابتدائی مذہبی تعلیم 'گھر' میں ہوئی، پھر تعلیم گاہ نسواں انٹر کالج لکھنؤ کے جی' کلاس میں داخلہ ہوا اور تیرہ سال لگاتار پڑھتے ہوئے ۱۹۶۵ء میں 'الہ آباد بورڈ آف ایجوکیشن' سے انٹرمیڈیٹ پاس کر کے ابو کی خواہش کے مطابق لکھنؤ یونی ورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا اور اردو، عربی، تاریخ ہند، (سلطنت غلاماں تا ۱۹۴۷ء)، یورپ کا نشاطِ ثانیہ معہ بنگالی، سنسکرت اور انگریزی نیز فارسی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا، بعد ازآں بوجہ امی محترمہ کی شدید علالت ایک سال چھوڑ کر تاریخ ہند سلطنت غلامان تا ۱۹۴۷ء ایم۔اے پاس کیا۔

پڑھائی کے آخری سال میں ۱۹۶۹ء میں اعجاز اللہ خاں صاحب کے ساتھ شادی ہو گئی اور زندگی کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔ اعجاز صاحب ملٹری انجینئرنگ سروس سینٹرل کمانڈ میں سول انجینئر اور کوانٹیٹی سرویئر تھے ۱۹۷۸ء میں ڈیپوٹیشن پر سلطنت آف عمان کے سرکاری محکمے دیوان میں آگئے اور ابھی تک وہیں مقیم تھے اسی سال واپس لکھنؤ آگئے۔ ہمارے تین بچے ہیں ماشاءاللہ، ڈاکٹر عرفان اللہ، رضوان اللہ اور خدیجہ اعجاز آخر الذکر دونوں امریکہ میں ہیں، رضوان کی بیوی ڈاکٹر انسل اسد علی کا تعلق لکھنؤ سے ہے، رضوان کے ننھی منی بیٹیاں ہیں۔ چونکہ گھر کا ماحول ادبی اور کسی حد تک مذہبی بھی تھا اس لیے بچپن ہی سے دل و دماغ اسی طرف مائل رہے۔ کے جی کلاس سے ہی ہر سال ڈراموں، کھیل کود، تقریری مقابلوں اور میلاد شریف کی تقاریب میں مضامین لکھنے اور پڑھنے کا موقع ملتا رہا، لکھنے کا رجحان بچپن ہی سے تھا بلکہ امی ابو سے ورثے میں ملا۔ امی شادی سے پہلے

☆ محترمہ فرزانہ اعجاز کا نام نامی 'الاقرباء' کے قلمی معاونین میں شامل ہے۔ آپ کا زیر نظر تعارف فاؤنڈیشن کے

اراکین کی فرمائش پر شائع کیا جارہا ہے (شہلا احمد)

ذکیہ برکت اللہ روحی کے نام سے افسانے، مضامین اور غزلیں لکھا کرتی تھیں، جو اس وقت کے رسالوں عصمت وغیرہ میں شائع ہوتے تھے ہمارے نانا محترم مولوی برکت اللہ رضا فرنگی محلی مستند شاعر تھے اور جنگ آزادی کے مجاہد بھی، انجام کار معہ بیوی بچوں کے بہرائچ میں نظر بند رہے، امّی کی ولادت وہیں بہرائچ میں ہوئی، ہمارے نانا محترم برکت اللہ رضا فرنگی محلی صاحب آنند نرائن ملاّ اور ان کے بھائی کے ٹیچر بھی تھے اسی لیے ملا صاحب ہماری امّی کا بہت احترام کرتے تھے۔

اس زمانے میں فرنگی محل کی خواتین میں ادب کی طرف رجحان تھا اور اکثر لڑکیاں، مولانا عبدالباری صاحب کی صاحب زادی صغرا بی بی کی قیادت میں شعروادب کی تربیت حاصل کررہی تھیں۔ صغرا بی بی صاحب دیوان شاعرہ تھیں ان کا کلام دوبارہ، مولانا جمال میاں صاحب نے کراچی میں شائع کروایا۔ دوسری طرف جناب حیات اللہ انصاری صاحب کی قیادت میں انگریزی تعلیم کی طرف بھی رجحان بڑھ رہا تھا، ہماری امی نے بہت ہی نامساعد حالات میں بھی یتیمی، یسیری کے باوجود سرکاری اسکول سے منشی کا امتحان پاس کیا ☆ مگر حالات نے آگے پڑھنے کا موقع نہیں دیا، پھر بھی لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رہا۔

ہماری امّی۔ابو کی ذہنی مطابقت حیرت انگیز تھی شاید یہی ادبی دولت ہم کو ورثہ میں ملی اور ہم اپنی استطاعت کے مطابق لکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

''بھلائے نہ بنے' تنہا تنہا' حاضری کا شرف' آنکھ نے جو کچھ کہ دیکھا' یادیں' حرف مکرر نہیں ہوں میں' بیس کہانیاں' کہکشاں' کچھ چھپی ہوئی کتابیں ہیں اور خطوں کی زبانی، کے عنوان سے ابو کے نام آئے اکابرین کے خطوط زیر اشاعت ہیں مزید یہ کہ ابو کے کچھ مضامین بھی ہم کتابی شکل میں لانے کی سعی کررہے ہیں کہیں بھی ہمارا کوئی سورس نہیں ہے اتر پردیش اردو اکادمی سے دو کتابوں پر انعام بھی ملا ہے۔

☆ اُس زمانہ میں السنۂ شرقیہ یعنی اردو۔فارسی اور عربی کے امتحانات بھی مروج تھے۔اردو میں ادیب۔ادیب عالم۔ادیب فاضل۔فارسی میں منشی۔منشی عالم۔منشی فاضل اور عربی میں مولوی۔مولوی عالم۔مولوی فاضل (شہلا احمد)

آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ اور دلی سے کئی افسانے اور خاکے نشر ہوئے ابو کو علم نہیں تھا کہ ہم لکھتے بھی ہیں کسی نے بتایا تو ابو نے ہم کو لکھا کہ بیٹی تم کب سے لکھتی ہو؟ اچھا لکھ رہی ہو، بس ہمارا یہی سب سے بڑا انعام ہے۔ ہم نے اسکول کی طرف سے ڈرائینگ کا مقابلہ بھی جیتا اور شہر کی انجمن "انجمن ادب اطفال" سے ایکٹنگ کے بہت انعامات جیتے، کھیل کود میں بھی اکثر انعام ملا یونی ورسٹی میں بھی کافی سوشل اور ادبی مصروفیت رہی۔

اسی سال (۲۰۱۴ء) ہم شکاگو آ گئے ہیں، یہاں کی ادبی محافل میں اب جانے پہچانے جانے لگے ہیں اور مدعو بھی کیے جاتے ہیں، وائس آف امریکہ کی اردو سروس سے بھی ہمارے کئی افسانے نشر ہوئے اور ایک گھنٹے کا ایک طویل انٹرویو بھی نشر ہوا، یہاں بھی ہمارا کوئی سورس نہیں ہے بس ہمارا قلم ہی ہماری پہچان ہے اللہ کا کرم ہے۔ لکھنؤ یونی ورسٹی میں ڈاکٹر احمد، ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی صاحبان ہمارے کلاس فیلو تھے، یعنی مقابلہ سخت تھا۔ مزاجاً جذباتی ہیں، خوش مزاج ہیں، دوسروں کی مدد کر کے خوش ہوتے ہیں اسی کوشش میں کبھی اُلو بھی بن جاتے ہیں۔ صراط المستقیم پر چلنے کی سعی میں مصروف رہتے ہیں۔ لیکن یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم جیسے دنیاداروں کے لیے یہ ڈگر بہت کٹھن ہے۔ ہمارے سر پر تو خطاؤں کی گٹھری بھی موجود ہے پھر بھی اللہ میاں سے بخشنے کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔

*****

اویس جعفری

(اپنے پوتے ۔۔ یوسف کی چہار سالہ سالگرہ پر)

ہے نور آنکھ کا دل کا قرار ہے یوسف
سراپا رحمتِ پروردگار ہے یوسف

ہے فخر دادا کو دادی کو نانا نانی کو
خوشا کہ باعثِ صد افتخار ہے یوسف

چچا ہیں نغمہ سرا اور چچی چہکتی ہیں
چمن میں آمدِ فصلِ بہار ہے یوسف

ہے ماں کی طرح مہکتا ہوا گلاب کا پھول
پدر شبیہ ہے اور پُر وقار ہے یوسف

ممانی ماموں کے دیدار کا ہے وہ مشتاق
سراپا ان کے لیئے انتظار ہے یوسف

خزاں کو جس کے تبسم نے کر دیا پامال
صدا بہار ، سراپا بہار ہے یوسف

خلوص، پیار ، محبت ہیں سلطنت میری
پہ سلطنت کا مری تاجدار ہے یوسف

فراز و رفعت و عظمت ہیں منزلیں جس کی
بساطِ وقت کا وہ شہسوار ہے یوسف

ہے خانداں کے اُفق پر مثال ماہِ تمام
جمالِ ذات کا اک شاہکار ہے یوسف

اویس جس نے کیا میرا شہر جاں آباد
وہ کج کلاہ ہے وہ شہر یار ہے یوسف

بیگم طیبہ آفتاب
گھریلو ٹوٹکے

○ کمر کے درد کے لیے

اگر آپ کی کمر میں درد ہے تو آپ ایک پیالی دودھ میں دو عدد چھوارے رات کو بھگو دیں اور صبح نہار منہ دودھ پی لیں اور چھوارے کھالیں انشا اللہ کمر کا درد ٹھیک ہوگا۔

○ پیٹ کم کرنے کے لیے

ایسی تمام غذائیں جو آپ کو مرغوب ہوتی ہیں زیادہ کھالیتے ہیں جو کہ بعد میں پریشانی کا باعث بنتا ہے اور جب آپ اپنا وزن چیک کرتے ہیں تو وہ بڑھ گیا ہوتا ہے۔ چنانچہ پیٹ کم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے آپ روزانہ سادہ غذائیں کھائیں۔ ریشہ والی غذائیں زیادہ کھائیں مثلاً بھوسی والا دلیہ کم چکنائی والا دودھ استعمال کریں۔

○ بھنڈی کے فائدے

قدرت نے بھنڈی میں بہت فائدے رکھے ہیں یہ غذا کے طور پر ہی نہیں بلکہ دوا کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس میں بہت سے فائبر اور وٹامن ہوتے ہین یہ کولیسٹرول کم کرتے ہیں اور دل کی بیماریوں کو کم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

○ بھنڈی میں وٹامن سی کے فائدے

بھنڈی میں وٹامن سی کافی مقدار میں پایا جاتا ہے جو انسانی جسم میں نقصان دہ اجسام کو ختم کرتا ہے۔ بھنڈی میں وٹامن 'کے' (K) بھی کافی مقدار میں موجود ہوتا ہے جو خون کو جمنے میں مدد دیتا ہے ہڈیوں کی مضبوطی کے لیے بھی ضروری ہے۔

○ شوگر کے مریضوں کے لیے بھنڈی کے فائدے

شوگر کے مریض بھنڈی کا استعمال اس طرح کریں۔ بھنڈی لے کر اس کی دُم اور سر کاٹ کر بھنڈی کو درمیان سے چیرا لگا لیں پھر اس کو گلاس میں پانی ڈال کر شام کے وقت کمرے کے درجہ حرات میں ڈھانپ کر رکھ دیں صبح ناشتہ سے پہلے اس کا پانی استعمال کریں۔ دو ہفتہ استعمال کرنے کے بعد انشا اللہ فائدہ محسوس ہو گا۔

○ مکئی کے فائدے

مکئی کے بہت فائدے ہیں زرد دانے والی مکئی کھایئے یہ بہت مفید غذا ہے اس میں معدنیات اور حیاتیں کثیر تعداد میں ہوتی ہیں اس میں وٹامن میگنیشیم فارسفورس، زنک، تانبا اور فولاد نمایاں ہیں۔

○ مونگ پھلی کے فائدے

پھلیوں اور دالوں کے بعد مغزیات زیادہ پروٹین رکھتے ہیں اِن میں پہلا نمبر مونگ پھلی کا ہے اگر آپ دو چمچہ مونگ پھلی کا کھائیں تو آپ کو ۸ گرام پروٹین حاصل ہو گی لہٰذا سردیوں میں ایک پیالی مونگ پھلی کھایئے اور اتنی پروٹین حاصل کیجئے جتنی مچھلی میں ہوتی ہے۔

○ سویابین کے فائدے

سویابین پھلی میں سب سے زیادہ پروٹین پائی جاتی ہے ایک پیلی پکی ہوئی سویابین پھلی کھانے سے ہمیں ۲۸ گرام پروٹین ملتی ہے اتنی ہی پروٹین ہمیں ڈیڑھ چھٹانک گوشت سے ملتی ہے

○ آنکھوں کے لیے مفید غذائیں

آپ نے سنا ہو گا کہ گاجر اور نارنجی رنگ کے پھل اور پتے والی سبزیاں بینائی کے لیے بہت

مفید ہیں یہ بات سچ ہے کہ گاجر وٹامن اے (A) کی ایک قسم بٹیا کروٹین سے مالا مال ہے یہ حیاتین آنکھ کے پردے (Retina) کے لیے بہت مفید ہے۔

O انڈے کے فائدے

انڈا بھی بصارت کے لیے بہت مفید ہے۔ مچھلی بھی بینائی کو تقویت دینے والے مادّے رکھتی ہے۔

O ذیابیطس کے لئے

کیونکہ ذیابیطس ایک عام مرض ہے اس کے لیے ایک چھوٹا سا ٹوٹکہ لکھ رہی ہوں شفا اللہ کے ہاتھ ہے آپ چھوٹی دارچینی کا ٹکڑا ایک کپ پانی میں ڈال کر ہلکی آنچ پر جوش دے لیں جب آدھا کپ رہ جائے تو چولہا بند کر دیں اور اِسے چھان لیں اور اس میں ذائقہ کے لیے نمک اور پسی ہوئی کالی مرچ شامل کر لیں انشااللہ فائدہ ہوگا۔

O چوٹ کے لیے

اگر کسی فرد کو چوٹ لگ جائے اور درد ہو رہا ہو تو آپ ایک عدد گول بینگن لیں اور اس کو بیچ دو حصہ کر لیں پھر اسے توے پر سینک کر تھوڑا بھورا کر لیں اور اس پر گھر کی پسی ہوئی ہلدی دونوں ٹکڑوں پر اچھی طرح چھڑک لیں اور گرم چوٹ پر باندھ دیں چوٹ لگنے سے بعض اوقات خون جم جاتا ہے اور درد برداشت نہیں ہوتا۔

O موچ کے لیے بینگن کا فائدہ

اگر موچ آجائے تو اس کے لیے بینگن کا بھرتہ سا بنا کر اس میں نمک ڈال کر متاثرہ جگہ پر باندھ لیں انشااللہ موچ ٹھیک ہو جائے گی۔